دہشت گرد
اقبال کاظمی

دیباچہ

اگست 1968ء میں کراچی میں ساون ایسا برسا کہ پورا کراچی پانی میں ڈوب گیا .... چند سال پہلے کراچی ایک بار پھر ڈوب گیا مگر پانی میں نہیں' اب کراچی خون میں ڈوبا تھا۔

یہ خون کس کا تھا؟

پاکستانیوں کا!

کون بہا رہا تھا یہ خون؟

پاکستانی!

کیوں؟ یوں تو اس کیوں کا جواب بہت طویل ہے لیکن مختصراً اس کا ایک ہی جواب ہے۔ "اقتدار کی ہوس۔"

گزشتہ چند برسوں میں عروس البلاد' روشنیوں کے شہر کراچی پر دہشت گردوں نے اپنے پنجے گاڑ کر آگ و خون کی جو ہولی کھیلی' اسے دیکھ کر ہر درد مند پاکستانی خون کے آنسو رویا۔ روشنیوں کے شہر کو وحشت کے بھیانک اندھیرے نگل رہے تھے' کراچی کے باسی سہمے ہوئے تھے۔ محبت اور بھائی چارے کی جگہ نفرت اور تعصب کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بارود کے دھوئیں نے فضا کو زہر آلود کر دیا تھا۔ لوگوں کے دم گھٹنے لگے تھے۔ ہر گھر سے جنازے اُٹھ رہے تھے۔ کراچی جل رہا تھا۔ ماؤں کے جگر کے ٹکڑے خون میں نہا رہے تھے۔ سہاگنوں کی مانگ اُجڑ رہی تھی' بہنوں کے آنچل نوچ کر تار تار کئے جا رہے تھے۔ جنازے اٹھا اٹھا کر لوگوں کے بازو شل ہو گئے تھے۔

محترم اقبال کاظمی کا نام ڈائجسٹوں اور رسائل کی دنیا میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے قلمکار ہونے کے ساتھ ساتھ سچے اور محب وطن پاکستانی بھی ہیں۔ وطن سے محبت کا اظہار ان کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے۔

ایسے میں اقبال کاظمی جیسے حساس قلمکار کا دل تڑپ اٹھا۔ انہوں نے اپنے اندر کے

پکتے ہوئے لاوے کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ ایک قلمکار کی نظریں وہاں تک پہنچتی ہیں جہاں تک عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔

دہشت گرد کون ہیں؟ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ ان کی سرپرستی کون کرتا ہے؟ طالب علموں کے ہاتھ سے کتابیں چھین کر کلاشنکوف پکڑانے والے مفاد پرست کون ہیں؟ ٹارچر سیلوں میں کیا ہوتا ہے؟

"دہشت گرد" کی خوبصورت کہانی میں ان سب سوالوں کا جواب موجود ہے۔ اس میں آتش و آہن کی بارش میں محبت کی نرم و نازک کونپل پھوٹتی بھی نظر آئے گی اور ناکام اور تشنہ آرزوئیں بھی مچلتی نظر آئیں گی۔

پولیس کا کردار عوام کی نظر میں ہمیشہ متنازعہ رہا ہے اور لوگ پولیس پر اعتماد نہیں کرتے اور ان کا خیال ہے پولیس دہشت گردوں سے ملی ہوئی ہے۔

"دہشت گرد" کی اصل کہانی پولیس اور دہشت گردوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا بنیادی کردار ایک ایسا پولیس انسپکٹر ہے جو اصولوں پر سودے بازی کرنا نہیں جانتا اور اس کا نام مجرموں میں ایک دہشت کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔

"دہشت گرد" کی کہانی انتہائی سنسنی خیز اور تیز رفتار ہے اور شروع سے آخر تک پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑے رکھے گی۔ یہی ایک کامیاب قلمکار کی خوبی ہے۔

عبدالغفار

اس کے چاروں طرف سناٹا تھا۔ تاحدِ نگاہ ایک نہ ختم ہونے والا ویرانہ' جہاں کسی قسم کی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ ان ویران پہاڑیوں میں کھڑا متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا ایک لمحہ کے لئے تو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ وہ غلطی سے کسی ویران سیارے پر تو نہیں پہنچ گیا لیکن پھر اس نے فوراً ہی یہ احمقانہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اسی کرۂ ارض پر تھا اور ساحلی پہاڑیاں اپنی تمامتر ویرانیوں کے ساتھ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ گرم ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے' اڑتی ہوئی ریت خاموشی سے سرخ چٹانوں سے ٹکرا کر اس کے قدموں میں بکھر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ لدا ہوا ہو۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا آسمان آگ برسا رہا تھا کہیں بھی بادل کا کوئی ٹکڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظریں آسمان پر کسی متحرک چیز پر مرکوز ہو گئیں وہ اس ویرانے میں اکیلا نہیں تھا ایک گدھ بھی اس خاموش اور تپتی ہوئی فضا میں ایک محدود دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں ایک اور گدھ کا اضافہ ہو گیا یہ دوسرا گدھ کس طرف سے آیا تھا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا وہ نظریں جھکا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اس کی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا جس کے شیشے انگاروں کی طرح تپ رہے تھے اور اس سے آنکھوں میں بھی تپش اور جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا اب آسمان پر گدھوں کی تعداد تین ہو گئی تھی۔

گردن سے بہنے والے پسینے کی دھاریں کینچوؤں کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی تک رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس کی شرٹ پسینے میں شرابور تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن چاروں طرف پھیلی ہوئی فطرت کی اس وحشت کے سامنے اسے اپنا یہ ریوالور بچوں کا کھلونا لگ رہا تھا اگر یہ ویرانہ اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تو یہ

ریوالور اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

شجاعت یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس ویرانے میں کھو گیا ہو لیکن وہ کھویا نہیں تھا وہ اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

تپتی ہوئی چٹانوں میں سڑک نام کا وہ پتھریلا راستہ چٹانوں میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلا گیا تھا اس راستے کے قریب ہی وہ سرخ چٹانیں تھیں جہاں ایک چھوٹے ٹیلے کی آڑ میں اس نے اپنی ٹویوٹا کروزر کھڑی کی تھی۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لینڈ کروزر وہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔

کراچی سے حب کی طرف جانے والی جس سڑک پر وہ سفر کر کے آیا تھا' وہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا چند میل اس سڑک پر سفر کرنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی کا رخ چٹانوں میں اس پتھریلے راستے پر موڑ دیا تھا اور بالآخر اس مقام پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی تھی اور اب بہت دیر سے اس خاموش ویرانے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

کبھی کبھی وہ ٹیلیفون کے تار کے اس کھمبے کی طرف دیکھنے لگتا جو وہاں سے بہت دور سڑک کے کنارا ایک پتھریلے ٹیلے پر لگا ہوا تھا اس کے بائیں طرف کچھ فاصلے پر ان چٹانوں کے پیچھے بحیرۂ عرب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جس کی لہریں پُرشور آواز سے ان چٹانوں سے ٹکرا تو رہی تھیں لیکن ان لہروں کے شور کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

دفعتاً وہ چونک گیا بہت دور سے کچھ عجیب سی آوازیں آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے لوہے کے پہیئے والی کسی بہت بھاری چیز کو کھینچا جا رہا ہو۔ وہ آواز کی سمت دیکھنے لگا لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا یہ آواز قدرے شمال کی طرف سے بہت دور چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کراچی کی شہری حدود سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک حب کی طرف جانے والی اس سڑک پر سفر کرتا رہا تھا اس دوران اس نے مخالف سمت سے صرف تین چار مال بردار ٹرک دیکھے تھے جو ڈیزل کا دھواں اڑاتے ہوئے بڑی تیزی سے اس کے قریب سے گزر گئے تھے وہ ابھی تک ڈیزل کی بو محسوس کر رہا تھا۔

وہ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے ان چٹانوں کا فاصلہ چند سو گز سے زیادہ نہیں تھا جس کے دوسری طرف بحیرۂ عرب کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ

سے چند قدم آگے بڑھ کر ایک بار پھر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا دفعتاً ایک عجیب سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی یہ بو شناخت کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی مچھلیوں کی یہ بو ہوا کے دوش پر ساحلی علاقے کی طرف سے آ رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کاش حامد حسن نے اس ویرانے کا انتخاب نہ کیا ہوتا لیکن اس کے خیال میں معاملہ بہت اہم تھا اور وہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہ تھا مجبوراً شجاعت علی کو اس کی بات ماننا پڑی تھی۔

"بینگ .... دھب .... کریک..........." وہ آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔

شجاعت علی نے مڑ کر اپنی ٹویوٹا کی طرف دیکھا اور بالآخر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا اس راستے پر بجری کی طرح لاتعداد چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے پڑے ہوئے تھے جو تیز دھوپ میں شیشے کے ٹکڑوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پگڈنڈی نما راستہ تقریباً دو سو گز تک نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔ شجاعت علی کے نتھنوں سے ایک بار پھر مچھلی کی بو ٹکرائی اسے اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکلوں پر کلفٹن یا ہاکس بے جایا کرتا تھا ہاکس بے کا راستہ تو بہت ہی خراب تھا جگہ جگہ سمندری کھاڑیاں تھیں مچھیروں کی بستیاں تھیں اور ان کھاڑیوں کے سامنے اور بستیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں سکھانے کے لئے زمین پر بچھی رہتی تھیں۔ اس راستے سے گزرتے ہوئے مچھلیوں کی ایسی بو آیا کرتی تھی لیکن اس بات کو عرصہ گزر گیا تھا وہ برسوں سے ہاکس بے کی طرف نہیں گیا تھا بچپن اور لڑکپن بیت چکا تھا وقت بدل گیا تھا وقت کے ساتھ بچپن کے کھیل بھی بدل گئے تھے۔

اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا۔ حامد حسن سے ملاقات کے لئے جو وقت طے ہوا تھا اس میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا لیکن کراچی سے نکل کر حب روڈ پر آتے ہی پہلے سے آنے والا ایک تیز رفتار آئل ٹینکر اس سے آگے نکل گیا تھا آئل ٹینکر کے ڈرائیور کو شاید اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ہائی وے پر چلنے والی بسوں' مال بردار ٹرکوں اور آئل ٹینکروں کے ڈرائیوروں کو ہمیشہ کہیں پہنچنے کی جلدی رہتی تھی لیکن اس آئل ٹینکر کا ڈرائیور کچھ زیادہ

ہی جلدی میں تھا۔ وہ آئل ٹینکر پہاڑیوں میں تقریباً نصف میل آگے گیا ہو گا کہ فضا ایک زوردار دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔

وہ تیز رفتار آئل ٹینکر سامنے سے آنے والے ایک تیز رفتار مال بردار ٹرک سے ٹکرا گیا تھا اس وقت دونوں اطراف سے آنے والی اکا دکا گاڑیاں وہاں رک گئی تھیں۔ آئل ٹینکر کو آگ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا تھا اس حادثے میں آئل ٹینکر کا ڈرائیور ہلاک ہو گیا تھا جبکہ مال بردار ٹرک کا کلینر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور ڈرائیور شدید زخمی ہوا تھا۔ وہاں رکنے والے لوگ دوڑ دوڑ کر زخمیوں کی مدد کرنے لگے ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے شجاعت علی کو بھی وہاں رکنا چاہئے تھا لیکن وہ جس کام سے نکلا تھا وہ کہیں زیادہ اہم تھا۔

اس حادثے کی وجہ سے اسے کچھ دیر ہو گئی تھی اور اب وہ پریشان ہونے لگا تھا۔ کوئی منصوبہ کتنی ہی ذہانت سے تیار کیا جائے ایک ایک لمحے کا خیال رکھا جائے اور اس کی کامیابی کا بھی سو فیصد یقین ہو تو اس قسم کا کوئی اتفاقی حادثہ سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "بینگ .... دھب" کی آواز ایک بار پھر سنائی دی تھی۔

وہ ایک موڑ گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف نکلا کھجور کے سوکھے ہوئے درختوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر رک گیا۔ درختوں کے ساتھ ہی اسے جھونپڑا نما وہ کچے مکان بھی نظر آ گئے جو ایک چھوٹے سے میدان کے گرد دائرے کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ میدان کے وسط میں ایک خشک کنواں نظر آ رہا تھا۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی زمانے میں ماہی گیروں کا کوئی قبیلہ یہاں آباد رہا ہو گا لیکن کنویں کا پانی خشک ہو جانے پر وہ کہیں اور چلے گئے تھے۔

"حامد........." اس نے ہولے سے پکارا۔

کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا لگتا تھا جیسے یہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو لیکن نہیں .... آسمان پر منڈلاتے ہوئے وہ گدھ موجود تھے جن کی تعداد اب چار ہو چکی تھی۔ شجاعت اپنی جگہ پر خاموش کھڑا کھنڈر نما کچے مکانوں کے سائے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں بھی کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس

کے اندازے کے مطابق دو گھنٹے بعد سورج غروب ہونے والا تھا اور ابھی اسے واپس بھی جانا تھا۔

کھجور کے سوکھے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں بھی ایک مکان نظر آ رہا تھا۔ یہ مکان دوسرے مکانوں سے نسبتاً بڑا تھا اس کی چھت گری ہوئی تھی اور شمالی دیوار بھی ڈھے گئی تھی مٹی کی کچی اینٹیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ مکان کے آس پاس کچھ لکڑیاں وغیرہ بھی بکھری ہوئی تھیں۔

شجاعت علی آگے بڑھنے میں کچھ جھجک سی محسوس کر رہا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جسے وہ بوقتِ ضرورت استعمال کر سکتا تھا لیکن دکھتا ہوا یہ ریوالور بھی اس وقت اسے ناگوار سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

شجاعت علی قدرے لمبے قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ بال سیاہ تھے لیکن کنپٹیوں پر بہت ہلکی سی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں لمبی اور مخروطی تھیں۔ ایسی انگلیاں عام طور پر آرٹسٹوں کی ہوتی ہیں لیکن وہ آرٹسٹ نہیں تھا۔ اس کی انگلیوں نے برش کی بجائے پستول چلانا سیکھا تھا۔ وہ زندگی کے اس خطرناک شعبے سے وابستہ تھا۔ جہاں انسانی زندگی چوبیس گھنٹے داؤ پر لگی رہتی ہے۔ خطروں کی اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں لیکن جب غصے میں ہوتا تو آنکھوں میں ایک دم سرخی پھیل جاتی۔ کسی زمانے میں اس نے بھاری مونچھیں بھی رکھی تھیں لیکن یہ مونچھیں اس کی شناخت بن گئی تھیں' اس لئے بہت عرصہ پہلے اس نے مونچھیں صاف کرا دی تھیں۔

"حامد........." اس نے ایک بار پھر پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔

شجاعت علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حامد نے اسے یہاں کیوں بلایا تھا۔ ٹیلیفون پر اس نے بہت مختصر سی بات کی تھی۔ جیسے بہت عجلت میں ہو۔ حامد کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا لیکن سارہ سے شادی کے بعد اس کا باپ اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ سارہ ایک عیسائی لڑکی تھی۔ بے حد حسین اور تعلیم یافتہ' شجاعت کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کی ملاقات کیسے ہوئی تھی لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ حامد پہلی ہی ملاقات میں اس کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔ سارہ کے ماں باپ کو بھی اس کا حامد سے ملنا پسند نہیں تھا لیکن ان دونوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا تھا۔ سارہ نے حامد کی خاطر اپنا

مذہب چھوڑ دیا۔ اپنے ماں باپ چھوڑ دیئے اور حامد حسن سے شادی کر لی۔ سارہ سے شادی کی وجہ سے حامد حسن کو بھی اپنے ماں باپ اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا تھا وہ دونوں کچھ عرصہ شجاعت علی کے مکان پر رہے تھے۔ پھر اس نے الگ مکان لے لیا تھا۔ حامد حسن تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے فارن سروس کا امتحان پاس کیا تھا لیکن افسر بننے کے بجائے اس نے اے ایس آئی بننا پسند کیا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ایئر کنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھنے کی بجائے وہ پولیس کے ایک معمولی اے ایس آئی کی حیثیت سے ملک کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتا تھا۔ شجاعت کو حامد کے اس فیصلے پر خوشی ہوئی تھی۔ ملک ان دنوں جن حالات سے دوچار تھا اس کے پیشِ نظر ایسے ہی باہمت اور مخلص نوجوانوں کی ضرورت تھی جو میدانِ عمل میں آ کر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ملک کو اس بحران سے نکال سکیں۔

ایک کروڑ سے زیادہ آبادی والے شہر کراچی کے حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے تھے۔ ڈکیتی، قتل اور رہزنی کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن چکی تھیں۔ عام شہریوں کی زندگیاں محفوظ نہیں رہی تھیں۔ ہر شخص عدم تحفظ کا شکار تھا۔ اسلحہ کی ریل پیل تھی۔ نویں اور دسویں کلاس کے طالبعلم بھی اپنے لباس میں ٹی ٹی پستول چھپائے پھرتے تھے۔ اسلحہ کے علاوہ منشیات کا ایک سیلاب تھا جس نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نوجوان نسل اس زہر کا شکار ہو رہی تھی۔ اسکولوں کے معصوم طالبعلم بھی اس لعنت سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ اسلحہ اور منشیات کے اسمگلر ان معصوم زندگیوں سے کھیل رہے تھے۔ ان کی نظروں میں صرف اپنا مفاد تھا۔ دولت ہی ان کا دین دھرم تھا اور دولت کے یہ پجاری اسلحہ اور منشیات پھیلا کر معصوم شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔

پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دیگر ایجنسیاں ان جرائم کو روکنے کی ذمے دار تھیں لیکن یہ ایجنسیاں بھی کرپشن کا شکار ہو چکی تھیں۔ ان ایجنسیوں کے بیشتر اہلکار دولت کی چمک سے مرعوب ہو چکے تھے۔ وہ جرائم پیشہ افراد کا قلع قمع کرنے کی بجائے ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ شہر کے بیشتر علاقوں میں اسلحہ اور منشیات فروشی کے ایسے اڈے موجود تھے جہاں سرعام یہ گھناؤنا کاروبار ہوتا تھا مگر پولیس اُن کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے ان کی پشت پناہی کر رہی تھی کیونکہ اس طرح پولیس والوں

کے اپنے گھر بھر رہے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ چند ٹکوں کے لالچ سے کتنے گھر اجڑ رہے تھے۔

شجاعت علی جب پولیس میں آیا تھا تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے طور پر موت کے ان سوداگروں کے خلاف جنگ لڑتا رہے گا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے حامد حسن جیسے چند مخلص کارکن مل گئے تھے جو اپنی زندگیوں کی پروا کئے بغیر اس کے ساتھ مل کر یہ جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔

شجاعت علی نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا کھنڈر نما مکان کے قریب پہنچ گیا۔ بجری نما چھوٹے چھوٹے پتھر اس کے پیروں کے نیچے چرچرا رہے تھے۔ ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔ اب سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکوں میں کسی قدر فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ مکانوں کے درمیان واقع کنوئیں کے قریب ایک چھوٹا سا بگولا نمودار ہوا اور ریت کو اپنے ساتھ اڑاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ شجاعت علی کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ پہلا جھونپڑا نما مکان خالی تھا۔ دوسرے جھونپڑے کے سامنے ایک کتے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا ملا تھا۔ جس پر گھاس پھونس اور مکڑی کے جالے لپٹے ہوئے تھے۔

جھونپڑے کے سامنے کھلی جگہ پر کچھ ایسی ٹوٹی ہوئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں جو ان جیسے گھروں میں استعمال ہو سکتی ہیں۔ یہاں اسے کار کے پہیوں کے نشان بھی نظر آ گئے جو درختوں کے جھنڈ میں واقع نسبتاً بڑے مکان کی عقبی سمت رہنمائی کر رہے تھے۔

شجاعت علی رک گیا۔ دھوپ اسے اپنی گردن پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پسینے کی وجہ سے اس کے چشمے کے شیشے بھی دھندلا گئے تھے وہ ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت ہوا ساکت ہو گئی تھی۔

وہ بہت محتاط انداز میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کی یہ احتیاط پسندی ہی اسے اب تک زندہ رکھے ہوئے تھی۔ زندگی کے جس خطرناک شعبے سے وہ وابستہ تھا اس میں ذرا سی لاپروائی یا غفلت موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ مکان کی دیوار کے ساتھ دوسری طرف گھومتے ہی اسے حامد حسن نظر آ گیا۔

دبلا پتلا اور دراز قامت حامد حسن ریت پر چت پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر اونٹ کے بالوں سے بٹی ہوئی رسیوں سے کھجور کے گرے ہوئے خشک تنوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک چیتھڑا تک نہیں تھا۔ شجاعت نے فوری طور پر اس کے

قریب پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں کھڑا گہری نظروں سے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ حامد کی لاش کے آس پاس ریت پر چاروں طرف قدموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ شجاعت کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ممکن ہے حامد کی لاش کی آڑ میں اس کے لئے بھی کوئی جال بچھایا گیا ہو۔ کسی جگہ کوئی ایسی چیز چھپی ہوئی ہو جہاں قدم رکھتے ہی خوفناک دھماکہ ہو اور اس کے پرخچے اڑ جائیں۔

اس نے حامد حسن کی کار کی طرف دیکھا۔ یہ اگرچہ پرانی سی مزدا تھی لیکن حامد نے اس کا انجن بہترین حالت میں رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کار کے انجن کی دیکھ بھال پر اکثر تھوڑی بہت رقم خرچ کرتا رہتا تھا۔

شجاعت علی نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا حامد کی کار کے قریب پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سائیڈ کا شیشہ گرا ہوا تھا۔ اس نے جیسے ہی کھڑکی پر ہاتھ رکھا اسے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا لیا۔ کھڑکی کا فریم انگارے کی طرح تپ رہا تھا اس کی ہتھیلی جل گئی تھی۔ حامد کی چمڑے کی جیکٹ ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی تھی لیکن شجاعت نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر ریت پر پڑی ہوئی حامد کی لاش کی طرف دیکھا۔ دفعتاً وہ چونک گیا۔ حامد کے سینے میں بہت معمولی سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے اس نے سانس لیا ہو۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا حامد حسن کے قریب پہنچ گیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ حامد مرا نہیں تھا۔ اس میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ اسے یقین تھا کہ حامد کو گھیرنے والے ایک سے زیادہ تھے' ان لوگوں نے حامد کے ساتھ بڑی بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔

حامد حسن کے پیٹ پر ایک بہت بڑا زخم تھا۔ جہاں جمے ہوئے خون پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں وہ لوگ واقعی انسان نہیں درندے تھے۔ حامد کی آنکھوں کے پپوٹے کاٹ دیئے گئے تھے۔ اس کے دیدے ساکت تھے جیسے وہ آسمان کو گھور رہا ہو۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے دو دانتوں میں سونے کی فلنگ بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ "حامد!" شجاعت علی نے گھٹنوں کے بل جھک کر ہولے سے اسے پکارا۔

حامد حسن کے سینے میں بہت غیر محسوس سی حرکت ہو رہی تھی۔ شجاعت علی اس پر جھک گیا حامد کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

"حامد!" اس نے ایک بار پھر پکارا۔

حامد حسن کے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹوں سے بہت مدھم سی آواز نکلی۔ "ہا............ں............" شجاعت کو یہ آواز کسی کنویں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"حامد............ یہ میں ہوں............ شجاعت علی۔"

"تم بہت دیر سے آئے ہو۔"

"مجبوری تھی حامد .... راستے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔" شجاعت علی نے کہا۔

"م............ مجھے............ قتل .... کر دو .... شجاعت............"

"حوصلہ رکھو حامد۔" شجاعت علی اسے تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حامد کی آواز بہت مدھم تھی۔ شجاعت اس پر کچھ اور جھک گیا۔ وہ حامد کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ماحول سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ ریت پر سرسراتی ہوئی ہوا اور آسمان پر منڈلاتے ہوئے گدھ ماحول میں عجیب سی سنسنی پیدا کر رہے تھے۔

"تم کل رات سے یہاں ہو حامد۔" وہ مزید آگے جھکتے ہوئے بولا۔ "میں تو صرف آدھا گھنٹہ لیٹ ہوا ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"م............ میں .... رات کو نہیں .... صبح سویرے یہاں آیا تھا............" حامد نے جواب دیا۔ "سارا دن اس ویرانے میں بیٹھا رہا۔"

"تمہارے ساتھ بربریت کا یہ مظاہرہ کس نے کیا؟"

"ہم............"

شجاعت علی دوڑ کر حامد کی کار میں سے پانی کی بوتل اٹھا لایا۔ اس نے بوتل کھول کر پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے۔ حامد حسن کے رخسار نچے ہوئے تھے اور اس کے پیٹ اور پہلوؤں سے کھال غائب تھی۔ جیسے بڑی احتیاط سے کھال کے مطلوبہ سائز کے ٹکڑے کاٹے گئے ہوں۔ اس کے پیروں کے دونوں انگوٹھے اور چند انگلیاں بھی جڑوں سے کاٹ دی گئی تھیں۔ حامد کی پشت کے نیچے بھی ریت پر خون جما ہوا تھا۔ یقیناً پشت پر کوئی بہت بڑا زخم تھا اور جمے ہوئے خون کے ساتھ حامد کا جسم زمین

سے چپکا ہوا تھا۔

”یہ جو کچھ ہوا اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔“ شجاعت علی نے کہا..........

”تم تو یہاں صرف اس لئے آئے تھے کہ اسلحہ کے اسمگلروں کی نگرانی کر کے تم ان کے سرغنہ نوری خالد کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ سکو لیکن .... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا..........؟“

”میں نے .... انہیں دیکھ لیا تھا۔“ حامد حسن نے جواب دیا۔ ”وہ ٹرک اسلحہ سے بھرا ہوا تھا .... لیکن میں بھی .... ان کی نظروں میں آ گیا.......... ٹرک تو چلا گیا لیکن اس سے اترنے والے دو تین آدمی میرے تعاقب میں یہاں آ گئے۔ مم .... میں دھوکے سے ان کے ہاتھ آ گیا .... وہ مجھ سے .... میرے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے .... ان کا خیال تھا کہ ہم نے ان راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ مم .... میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا لیکن یہ ضرور کہا کہ جب شجاعت علی کو پتہ چلے گا تو وہ قیامت تک .... تم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

”اوہ!“ شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تم پر یہ تشدد کب کیا گیا تھا؟“

”صبح..........“ حامد حسن نے جواب دیا۔

”اوہ..........“ شجاعت علی پھر چونک گیا۔ ”مجھے فون پر پیغام کیسے دیا تھا؟“

”مم .... میں نے .... کوئی پیغام نہیں دیا تھا۔“ حامد حسن نے کہا۔

شجاعت علی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ اسے حامد کا پیغام دوپہر سے ذرا پہلے ملا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ پیغام دینے والا کوئی اور تھا اور اس نے حامد کے لہجے کی بڑی عمدہ نقل کی تھی۔ اسے دھوکے سے یہاں بلایا گیا تھا وہ نوری خالد یا اس کا کوئی ساتھی ہی ہو سکتا تھا۔

”وہ ٹرک کس طرف گیا تھا؟“ شجاعت علی نے پوچھا۔

”وہ ٹرک ان پہاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں .... میں اس کا پیچھا ضرور کرتا لیکن..........“

”تمہارا موبائل فون کہاں ہے؟“ شجاعت نے پوچھا۔

”کک .... کار میں۔“ حامد حسن نے جواب دیا۔ ”مم .... مجھے بہت

تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھے قتل کر دو پلیز! اس اذیت سے مجھے نجات دلا دو۔“ حامد حسن کی آواز اب بہت کمزور ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ تم بہت جلد..........“

”نہیں پلیز نہیں۔“ حامد حسن کراہا۔ ”مجھے مت ہلانا۔“

شجاعت علی ایک دم سیدھا ہو گیا۔ سڑک کی طرف سے کسی ٹرک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”تم کراچی واپس چلے جاؤ۔“ حامد حسن کے ہونٹوں سے سرسراہٹ سی نکلی۔ ”نوری خالد پر نگاہ رکھو۔“

”میرا تو خیال تھا کہ ....“ شجاعت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ”بہرحال، نوری خالد مجھ سے بچ نہیں سکے گا لیکن مجھے حیرت ہے کہ حب چوکی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اسلحہ سے لدا ہوا ٹرک وہاں سے کیسے نکل آیا؟“

”کک .... کالی بھیڑیں۔“ حامد حسن کے منہ سے بہت ہلکی سی آواز نکلی۔

”میں تمہیں اس طرح نہیں مرنے دوں گا حامد!“ شجاعت بولا۔

”پلیز شجاعت۔“ حامد حسن کی آواز کچھ اور کمزور پڑ گئی۔ ”مجھے مت ہلانا۔ مجھے یہیں رہنے دو .... میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں .... سارہ کو میرا سلام کہنا لیکن اسے .... یہ مت بتانا کہ میرے ساتھ .... کیا ہوا تھا۔“

یکایک حامد حسن کی آواز بند ہو گئی۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

شجاعت علی کو حامد حسن کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔ حامد اور اس کا ساتھ صرف دو سال کا تھا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے .... ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ وہ دونوں پورے شہر میں خطرناک پولیس افسران کی جوڑی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اس مختصر سے عرصے میں انہوں نے شہر کے چند بدنام اور نامی گرامی مجرموں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر دوسرے پولیس آفیسر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ بڑے بڑے بااثر لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی لیکن شجاعت علی اور حامد

حسن نے یہ طے کر رکھا تھا کہ جس حد تک بھی ممکن ہو سکا وہ معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کر دیں گے جنہوں نے پُرامن' معصوم اور بے گناہ شہریوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ بااثر لوگوں کی دھونس دھمکیوں کے باوجود وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ بعض پولیس افسروں کی طرف سے ان پر دباؤ بھی تھا کہ وہ اپنی حد سے بڑھنے کی کوشش نہ کریں بعض دیانت دار اعلیٰ پولیس افسران ایسے بھی تھے جو ان کی کارکردگی سے خوش تھے۔ وہ ایسے ہی دیانت دار افسروں کی آشیرباد پر جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کا قلع قمع کرنے میں مصروف تھے۔

شجاعت علی ایک اے ایس آئی کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ وہ یہ عزم لے کر اس محکمے میں آیا تھا کہ سب سے پہلے موت کے ان سوداگروں کا خاتمہ کرے گا جو نوجوان نسل کے خون میں منشیات کا زہر پھیلا رہے تھے۔ اس محکمے مین آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا اپنا ایک دوست ہیروئن کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا' اس کا ایک دوست ہی کیا اس ملک کے سینکڑوں معصوم نوجوان موت کے ان سوداگروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ کتنے گھر اجاڑے تھے ان موت کے سوداگروں نے لیکن پولیس میں آنے کے بعد شجاعت علی کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اسے قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پولیس میں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو موت کے ان سوداگروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اسے بہت جلد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ منشیات کے ان سوداگروں کو صرف پولیس ہی کے بعض بددیانت اہلکاروں کی سرپرستی حاصل نہیں تھی بلکہ بعض بااثر لوگ بھی ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ موت کے ان سوداگروں کی رسائی اسمبلیوں تک تھی ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

لیکن .... یہ اے ایس آئی شجاعت علی کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے بعض ذمے دار اور دیانت دار پولیس افسروں کی حمایت حاصل ہو گئی تھی جو صدق دل سے ان گھناؤنے جرائم کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے اور معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔

پولیس میں آنے کے چند ماہ بعد اسے حامد حسن جیسا دوست مل گیا اور اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ حامد حسن اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس نے فارن سروس کا امتحان

بھی پاس کیا تھا۔ اسے فارن سروس میں افسری پیش کی گئی تھی لیکن اس نے پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہونے کو ترجیح دی تھی اور شجاعت علی کے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ حامد حسن بھی اس کی طرح جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف جنگ کا عزم لے کر اس محکمے میں آیا تھا۔

شجاعت علی نے کئی منشیات فروشوں' اسلحہ کے چھوٹے موٹے سوداگروں' کار چوروں اور دیگر جرائم پیشہ افراد کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا تھا اور اسے اکثر برے نتائج کی دھمکیاں بھی ملتی رہتی تھیں۔

پھر نوری خالد اس کی نظروں میں آ گیا۔ وہ اسلحہ اور منشیات کا بہت بڑا سوداگر تھا۔ وہ نہ صرف پورے شہر کو ہیروئن اور اسلحہ سپلائی کرتا تھا بلکہ ہیروئن کی ایک بڑی مقدار دوسرے ملکوں کو بھی اسمگل کرتا تھا۔

شجاعت علی اور حامد حسن اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ خفیہ طور پر اس کے بارے میں تحقیق شروع کر دی۔ اس تحقیق سے بعض بڑی دلچسپ باتیں سامنے آئی تھیں۔ نوری خالد گلشن اقبال کے ایک عالی شان بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ اسے شہر میں ایک معزز شہری کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے ہاں اکثر دعوتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں شہر کے معززین کے علاوہ اعلیٰ پولیس افسران بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ وہ پولیس افسران تھے جو اس غیر قانونی دھندے میں اسے تحفظ فراہم کرتے تھے۔ بڑے پیمانے پر ہونے والی بعض سرکاری دعوتوں میں بھی نوری خالد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس سے شجاعت علی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نوری خالد کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور اس پر ہاتھ ڈالنا کچھ آسان نہیں ہو گا لیکن شجاعت علی اور حامد حسن نے تہیہ کر لیا کہ وہ اسے چھوڑیں گے نہیں اور پھر شجاعت علی کو جلد ہی نوری خالد پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ اس رات ڈیڑھ بجے اسے اطلاع ملی کہ ایک مشکوک کار نوری خالد کے بنگلے سے نکلی ہے جس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔

حامد حسن اس وقت تھانے کے ایس ایچ او کے ساتھ علاقے کے ایک بنگلے میں پڑنے والے ڈاکے کی تفتیش کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ شجاعت علی نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چند کانسٹیبلوں کو لے کر گاڑی پر روانہ ہو گیا۔

شجاعت علی نے موتی محل کے پل پر نوری خالد کے بنگلے سے نکلنے والی کار کو جا لیا۔

کار کو رکنے کا اشارہ کیا تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے خودکار رائفل سے پولیس وین پر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک کانسٹیبل زخمی ہو گیا۔ کار کی رفتار تیز ہو گئی تھی لیکن پولیس وین کے ڈرائیور نے عقلمندی کا مظاہرہ کر کے بڑی پھرتی سے وین کو آگے لا کر کار کا راستہ روک لیا۔ کار پل کے جنگلے سے ٹکرا کر رک گئی۔ کار کے ڈرائیور نے کار سے نکل کر پل کے جنگلے سے تیس پینتیس فٹ نیچے گندے نالے میں چھلانگ لگا دی مگر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے مقابلہ جاری رکھا لیکن پولیس کی جوابی فائرنگ سے نہ صرف اس کی رائفل خاموش ہو گئی بلکہ وہ بھی زخمی ہو کر سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

کار کی تلاشی لینے پر سیٹوں کے نیچے سے پانچ کلاشن کوف رائفلیں، کئی میگزین اور بیس کلو ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ زخمی ملزم کو حراست میں لے لیا گیا۔ شجاعت کے اس کارنامے پر اسے فوری طور پر سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ٹیلی فون پر برے نتائج کی دھمکیاں بھی ملنے لگی تھیں۔

نوری خالد اپنے تعلقات کی بناء پر اس کیس سے صاف بچ نکلا تھا مگر شجاعت علی نے طے کر لیا تھا کہ اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر ہی دم لے گا۔ اس نے نوری خالد کی نگرانی جاری رکھی اور پھر دو دن پہلے اسے اطلاع ملی کہ اسلحہ سے بھرا ہوا ایک ٹرک کراچی کی طرف آ رہا ہے اور اسلحہ کا یہ ٹرک نوری خالد کی ملکیت ہے۔ یہ خفیہ اطلاع ملتے ہی سب انسپکٹر شجاعت علی اور حامد حسن نے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اس ٹرک کی نگرانی کر کے نوری خالد کے اس خفیہ ٹھکانے کا پتہ چلایا جائے جہاں یہ اسلحہ چھپایا جاتا ہے اور بعد میں اس خفیہ اڈے پر باقاعدہ ریڈ کیا جائے۔ ٹرک کی نگرانی کی ذمے داری حامد حسن نے اپنے ذمے لی تھی اور اس طرح اس کا جو انجام ہوا تھا اسے دیکھ کر شجاعت علی کانپ اٹھا تھا۔

اس نے حامد حسن کی کار میں سے اس کی جیکٹ، اس کے نیچے رکھا ہوا موبائل فون اور گاڑی کے کاغذات وغیرہ اٹھائے اور اپنی کار کی طرف جانے کے لئے بلندی کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگا۔

سورج اگرچہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا مگر دھوپ میں ابھی تک پہلے جیسی حدت تھی۔ چٹانیں تپ رہی تھیں۔ ہوا بند ہو چکی تھی جس سے گھٹن کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ شجاعت نے مڑ کر حامد حسن کی لاش کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ

تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ گرمی اور چڑھائی کے باعث اس کا سانس پھول گیا تھا۔ گردن سے بہنے والی پسینے کی دھاریں اس کے پورے جسم پر رینگ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا اور وہ دو قدم مزید آگے بڑھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اسے اپنی ٹویوٹا کار کی چھت نظر آ رہی تھی لیکن اس کے چونکنے کی وجہ وہ گاڑی تھی جو اس کی ٹویوٹا کے پیچھے کھڑی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ جب وہ نشیب میں تھا تو اس نے کسی گاڑی کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت اور خاموش کھڑا کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ پھر دوسری مردانہ آواز اور اس کے فوراً ہی بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس نہیں ہوا ممکن ہے یہ لوگ اس کی ٹویوٹا کو دیکھ کر اس طرف آ گئے ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو گا شاید ٹویوٹا والے کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں ایک لمبی سی چٹانی کارنس سی بنی ہوئی تھی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے وہ ان دونوں گاڑیوں کے پیچھے پہنچ گیا۔

دوسری گاڑی واکس ویگن تھی۔ اس گاڑی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ لوگ اسے کسی کباڑخانے سے اٹھا کر لائے ہوں۔ رنگ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور ریت کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ نمبر پلیٹ کراچی ہی کی تھی لیکن لگتا تھا جیسے یہ گاڑی طویل فاصلہ طے کر کے آئی ہو۔

وہ ایک جوان لڑکی اور دو آدمی تھے۔ ان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور بظاہر وہ بے ضرر لگتے تھے۔ وہ تینوں باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے بڑی گرم جوشی سے اس کی ٹویوٹا کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان تینوں میں سے کسی نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے پیٹرول کا فاضل جیری کین، پانی کی بوتل اور دیگر سامان ٹویوٹا سے نکال کر اپنی وین میں منتقل کر لیا تھا۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے ان میں سے ایک آدمی سگریٹ بھی پی رہا تھا لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سگریٹ کی بو اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ان میں سے بھاری بھرکم آدمی ٹویوٹا کے ڈیش بورڈ والے خانے سے اس کا

موبائل ٹیلی فون نکال کر جیسے ہی مڑا اس نے شجاعت علی کو دیکھ لیا اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"اے .... وہ دیکھو کون ہے؟" اس نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔

وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رنگے ہاتھوں چوری پکڑے جانے پر ان کے چہروں پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ انہیں شاید اس بات کا افسوس بھی تھا کہ لوٹ کا مال ان سے واپس لے لیا جائے گا۔

لمبے قد والا' جو چہرے سے زیادہ خطرناک لگتا تھا' دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے پتلون کی بیلٹ میں پھنسائے کھڑا تھا۔ وہ سب ننگے پیر تھے۔ گرد میں اٹے اور بکھرے ہوئے بال' میلے کپڑے' لگتا تھا جیسے بہت عرصے سے نہ تو وہ خود پانی کے قریب گئے ہیں اور نہ ہی کبھی کپڑے دھونے کی زحمت کی ہے۔ وہ لڑکی دبلی پتلی اور لمبے قد کی مالک تھی۔ سیاہ لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کسی حد تک بہتر نظر آ رہی تھی وہ شجاعت علی کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ موٹے آدمی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ کار سے نکالا ہوا موبائل ٹیلیفون ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ لمبے قد والا بھی پتلون کی بیلٹ میں ہاتھوں کے انگوٹھے پھنسائے خاموش کھڑا تھا۔ شجاعت علی کی رینگتی ہوئی نظریں اس کے پیروں پر پہنچ گئیں۔ اس کے پیر بے حد گندے تھے اور وہ انگوٹھوں سے ریت کرید رہا تھا۔

"لو .... اس کار کا مالک بھی پہنچ گیا۔" لڑکی نے لب کشائی کی۔ "اب یہ کھیل ختم ہی سمجھو۔ وہ بے حد غصے میں نظر آ رہا ہے۔ "اے مسٹر!" وہ شجاعت علی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تمہاری کار یہاں لاوارث کھڑی تھی۔ ہم یہ سمجھے کہ کار میں کسی خرابی کی وجہ سے تم اسے یہاں چھوڑ کر کسی ٹرک وغیرہ پر کہیں چلے گئے ہو۔"

"میں ذرا نشیب میں گیا تھا۔" شجاعت علی نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور تم لوگوں نے مال غنیمت سمجھ کر کار کو لوٹنا شروع کر دیا۔"

"ہمیں افسوس ہے۔" لڑکی کے لہجے میں ندامت تھی۔

شجاعت علی لمبے قد والے آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں برہمی کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ اسے لڑکی کا اظہار ندامت پسند نہیں آیا تھا۔

"بکواس بند کرو شبینہ!" اس نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔ پھر شجاعت علی کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا۔ "تم کون ہو مسٹر!"

"میں..........." شجاعت نے ایک لمحہ رک کر جواب دیا۔ "میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔" اس نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ ایک پولیس آفیسر ہے۔

"ہم سمجھے تھے کہ اس ویرانے میں کار کا کوئی وارث موجود نہیں ہے۔" لمبے قد والا بولا۔

"وارث اب پہنچ گیا ہے۔ اس لئے یہ تمام چیزیں دوبارہ کار میں رکھ دو۔" شجاعت علی نے کہا۔ اس کے لہجے میں کسی قدر سختی تھی۔

"بالکل۔ ہم یہ ساری چیزیں ابھی کار میں رکھ دیتے ہیں۔"

"عامر! یہ تو بہت سخت گیر قسم کا آدمی لگتا ہے۔" لڑکی نے کہا جس کا نام شبینہ تھا۔

عامر اس لمبے قد والے کا نام تھا جو چہرے سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔ موٹے آدمی نے پانی کی بوتل اور پیٹرول کا جیری کین پچھلی سیٹ پر اس طرح پھینک دیا جیسے وہ کوئی معمولی سا کھلونا ہو۔ لڑکی نے بھی کندھے اچکا دیئے اور اپنی گاڑی سے شجاعت علی کی چیزیں اٹھا اٹھا کر اس کی کار میں پھینکنے لگی جبکہ عامر نام کا دراز قامت آدمی ریت میں پیروں کے انگوٹھے گاڑے اپنی جگہ پر خاموش کھڑا شجاعت علی کو گھورتا رہا۔

"وہاں نیچے کیا ہے؟" بالآخر اس نے نشیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نشیب میں صدیوں پرانی کسی چھوٹی سی بستی کے کھنڈرات ہیں۔ کیا عامر تمہارا پورا نام ہے؟" شجاعت علی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شہباز عامر!" اس شخص نے مختصر سا جواب دیا۔

"کچھ کرنا چاہتے ہو؟ میرا مطلب ہے کوئی ہنگامہ؟" شجاعت علی کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس شخص نے شجاعت علی کے بیلٹ میں اڑسے ہوئے ریوالور کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" عامر نے جواب دیا۔

"گڈ۔" شجاعت علی مسکرا دیا۔ وہ گہری نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان تینوں کے بارے میں شجاعت علی کا خیال تھا کہ ان کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں بھی حاصل کی ہوں لیکن بڑے

گھرانوں میں عام طور پر اولاد کو مادر پدر آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ کسی قسم کے نشے کے بھی عادی ہوں اور نشے کی تلاش میں کہیں جا رہے ہوں۔ وہ لڑکی بھی چہرے سے اتنی معصوم نہیں لگتی تھی۔

شجاعت علی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ شہباز عامر ہی ان کا لیڈر تھا۔ اس کے بھاری بھرکم ساتھی نے سگریٹ نیچے پھینک کر اسے پیر سے مسل دیا اور ناک کھجانے لگا۔ شبینہ بھی اب مسکراتی ہوئی عامر کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے نیلی جینز اور ڈھیلی ڈھالی سی چمکدار شرٹ پہن رکھی تھی۔

”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟“ شجاعت علی نے پوچھا۔

”کراچی کے رہنے والے ہیں۔ گڈانی گئے تھے پکنک منانے کے لئے۔ ہمارا پروگرام تو وہاں رات گزارنے کا تھا مگر یہ شبینہ گھبرا گئی اور ہمیں واپس آنا پڑا دراصل یہ شبینہ عامر کی اس دھمکی سے ڈر گئی کہ وہ اسے مچھیروں کے حوالے کر دے گا۔“

”تم کون ہو؟“ شجاعت علی نے پوچھا۔

”میرا نام گل فراز ہے۔“ موٹے نے جواب دیا۔

”اور تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا اجنبی؟“ شبینہ نے شجاعت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں.........“ شجاعت علی مسکرایا۔ ”میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔“

جیسے ہی شجاعت علی کا جملہ مکمل ہوا شہباز عامر نے اچانک ہی اس کے منہ پر زوردار گھونسہ مارا اور فوراً ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور کھینچ لیا۔ شجاعت علی پشت کے بل زمین پر پڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سب انسپکٹر شجاعت علی۔“ شہباز عامر اس پر ریوالور تانتے ہوئے غرایا۔ ”اٹھ کر خاموشی سے نشیب میں ان کھنڈرات میں چلو جہاں تمہارے ساتھی کی لاش پڑی ہے۔ اٹھو!“ اس نے آگے بڑھ کر شجاعت علی کو ایک زوردار ٹھوکر ماری۔

شجاعت علی خونخوار نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا مگر اس کے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی خاموشی سے ان کے آگے آگے چل پڑا۔ اس کے پیچھے شہباز عامر تھا جس نے اسے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا۔ اس کے پیچھے شبینہ اور سب

سے آخر میں گل فراز تھا۔ وہ تنگ سی پگڈنڈی پر نشیب میں اترنے لگے۔

وہ کھنڈرات تقریباً سو فٹ نیچے نشیب میں تھے اور وہاں تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ تھا جس پر وہ چل رہے تھے۔ اس پگڈنڈی کے دائیں طرف عمودی ڈھلان تھی اور بائیں طرف چٹان سی اٹھی ہوئی تھی۔ نشیب میں اترنے کے لئے ایک اور کشادہ راستہ بھی تھا لیکن وہ تقریباً ایک فرلانگ دائیں طرف تھا۔ شجاعت علی کو یقین تھا کہ حامد اس راستے سے اپنی کار لے کر کھنڈروں تک پہنچا ہو گا۔ وہ بلوچستان سے آنے والے اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرک کا سراغ لگانے کے لئے اس طرف آیا تھا لیکن نوری خالد کے آدمیوں کی نظروں میں آ گیا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حامد حسن نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ وہ دو تین آدمی تھے۔ اس نے کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے لڑکی اس کے سامنے نہ آئی ہو۔ اگر یہ لوگ وہ نہیں تھے جنہوں نے حامد حسن کو قتل کیا تھا تو پھر یہ کون تھے؟ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ پکنک سے واپس آ رہے ہیں اور اس کی کار دیکھ کر رک گئے تھے لیکن انہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ کھنڈرات میں کوئی لاش پڑی ہے اور یہ کہ وہ لاش اس کے ساتھی کی ہے۔

وہ لوگ گھاٹی سے اتر کر کھنڈرات میں پہنچ گئے۔ شجاعت علی ایک جگہ رک گیا۔

”آگے چلو .... جہاں تمہارے ساتھی کی لاش پڑی ہے۔“ شہباز عامر نے اسے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

شجاعت علی پھر آگے چلنے لگا۔ وہ کھنڈر نما مکانوں کے اوپر سے گھومتا ہوا اسی جگہ پہنچ گیا جہاں حامد حسن کی لاش پڑی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ ختم ہو گئی تھی اور شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔

”اپنے ساتھی کا انجام دیکھ لیا تم نے۔“ شہباز عامر نے کہا........... ”تم بھی بہت جلد اس کے پاس پہنچنے والے ہو اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ پولیس کے دو فرض شناس آفیسر کہاں غائب ہو گئے۔“

”اسے تم نے قتل کیا ہے؟“ شجاعت علی نے پوچھا۔

”اور کون ہو سکتا ہے؟“ عامر نے کندھے اچکائے۔

”تو تم لوگ نوری خالد کے آدمی ہو۔“ شجاعت علی نے اسے گھورا۔

”بہت جلد سمجھ گئے۔“ شہباز عامر کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”تم

لوگ نوری خالد کے خفیہ اڈے کا پتہ چلانا چاہتے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یہ اطلاع کیسے ملی تھی کہ نوری خالد کا ٹرک مال لے کر آ رہا ہے۔ تمہارا یہ ساتھی اس ٹرک کا تعاقب کر کے خفیہ اڈے کا پتہ لگانا چاہتا تھا لیکن بیچارہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ نوری کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اس کے دو سب سے بڑے دشمن اس کے راستے سے ہٹ گئے ہیں تو اسے بڑی خوشی ہو گی۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" شجاعت علی نے پرسکون لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ذرہ بھر تاثر نہیں تھا۔ "ذرا اوپر دیکھو۔ تم لوگ پولیس کے گھیرے میں ہو۔"

ان تینوں نے بیک وقت مڑ کر گھاٹی کی طرف دیکھا تھا۔ یہ شجاعت علی نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شہباز عامر پر جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور اس کے قبضہ میں آ چکا تھا۔

ایک لمحہ کو تو وہ تینوں کچھ سمجھ نہیں سکے لیکن پھر گل فراز نے سب سے پہلے حرکت کی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ گولی شجاعت علی کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ شجاعت علی نے بھی گولی چلا دی اور کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک مکان کے سامنے ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔

وہ تینوں بھی ایک کھنڈر کی دیوار کے پیچھے چھلانگ لگا چکے تھے۔ شہباز عامر نے شجاعت علی کا ریوالور چھینا تھا جو اب دوبارہ شجاعت علی کے قبضے میں جا چکا تھا۔ عامر نے پتلون کی جیب سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

ویرانہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ شہباز عامر اور گل فراز اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے جبکہ شجاعت علی سنبھل کر احتیاط سے فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنے ریوالور کی گولیاں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شبینہ کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ وہ کھنڈروں کی آڑ لیتی ہوئی اپنے ساتھیوں سے دور ہٹ رہی تھی تاکہ فائرنگ کی زد میں نہ آ جائے۔ دوسری طرف شجاعت علی بھی کھنڈروں کی آڑ لیتا ہوا گھاٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ شجاعت علی ایک دیوار کی آڑ میں سینے کے بل رینگ رہا تھا۔ دیوار کے اختتام پر وہ رک گیا۔ اگلا کھنڈر تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔

شجاعت علی نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا دیئے۔ اس نے اس طرح پوزیشن لی تھی جیسے کوئی کھلاڑی دوڑنے کے لئے تیار ہو اور پھر وہ اٹھ کر بڑی تیزی سے دوسرے کھنڈر کی طرف دوڑا۔ ابھی وہ راستے کے وسط میں تھا کہ گل فراز کی چلائی ہوئی گولی زناٹے کی آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس نے زوردار زقند بھری۔ ایک اور فائر ہوا لیکن شجاعت علی اس گولی سے بھی محفوظ رہا۔ وہ دیوار کے پیچھے ریت پر گرا اور سنبھل کر دیوار کی آڑ لے کر گولی چلا دی۔ اس کے فوراً ہی بعد مخالف سمت سے آنے والی گولی دیوار کے کونے پر لگی۔ شجاعت علی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ وہ جس راستے سے گھاٹی سے اترے تھے وہ ان کھنڈرات سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں دو تین چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ قریب ترین ٹیلہ بھی تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھا اور شجاعت علی سوچ رہا تھا کہ اگر ان سے پہلے گھاٹی تک پہنچ جائے تو بچ سکتا تھا۔

گل فراز اور شہباز عامر بھی شاید اس کی نیت بھانپ گئے تھے اور وہ اس کا راستہ بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت اچانک ہی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ شجاعت علی کو یقین تھا کہ وہ دونوں گھات لگائے بیٹھے ہیں اور موقع ملتے ہی اس پر فائرنگ شروع کر دیں گے۔ اس نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور پھر اچانک ہی دیوار کی آڑ سے نکل کر ٹیلے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ گولیاں اس کے آس پاس گھوم رہی تھیں وہ دوڑتا رہا اور پھر ٹیلے کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

ٹیلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اگر وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا تو ٹیلے کے اوپر سے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس لئے اٹھ کر کھڑا ہونے کے بجائے وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل آگے بڑھتا رہا۔ دوسری طرف سے فائرنگ ایک بار پھر بند ہو چکی تھی۔ شجاعت علی دوڑتا ہوا دوسرے ٹیلے کی آڑ میں پہنچ گیا اس پر اس مرتبہ بھی گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن تاریکی اور شجاعت کی پھرتی اور برق رفتاری کے باعث کوئی گولی نشانے پر نہیں بیٹھی تھی۔

دوسرا ٹیلہ نسبتاً اونچا تھا اور گھاٹی پر جانے والا راستہ یہاں سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ درمیان میں صرف ایک ٹیلہ حائل تھا۔ دفعتاً دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر شجاعت علی نے اچک کر دیکھا۔ عامر یا گل فراز دوڑتا ہوا گھاٹی والے راستے

کی طرف جا رہا تھا۔ شجاعت علی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ سٹک کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ ریوالور خالی ہو چکا تھا۔

شجاعت علی کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے خالی ریوالور بیلٹ میں اڑس لیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دوڑنے والے شخص کے قد اور تیز رفتاری سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شہباز عامر تھا۔ گل فراز قد میں نسبتاً چھوٹا اور خاصا بھاری بھرکم تھا۔ وہ اتنی تیزی سے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ عامر نے آگے نکل کر اس طرح پوزیشن لے لی تھی کہ شجاعت علی اس کی نظروں میں آئے بغیر گھاٹی والے راستے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے چند فٹ دور ایک کھڈ سا تھا جو زمین میں گہری دراڑ کی طرح بائیں طرف دور تک چلا گیا تھا۔ شجاعت سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس دراڑ میں پہنچ جائے تو ان کی نظروں میں آئے بغیر اس کھڈ کے اندر ہی اندر چلتا ہوا بائیں طرف کسی اور راستے سے اس نشیب سے نکل کر سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔

وہ ابھی فرار کے امکانات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ٹیلے پر سرسراہٹ کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کے پس منظر کی مدھم سی روشنی میں گل فراز ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی صاف نظر آ رہا تھا جس کا رخ شجاعت کی طرف تھا۔

"تمہارا ڈرامہ اب ختم ہو چکا۔ شرافت سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔" گل فراز کے حلق سے بھیڑیئے کی سی غراہٹ نکلی۔

شجاعت کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے گل فراز کے کہنے پر عمل کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ حامد حسن کا انجام دیکھ چکا تھا اور ویسے بھی اب وہ مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کا ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گردن گھما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شہباز عامر بھی اب اسی طرف آ رہا تھا۔

"تم لوگ قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکو گے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "اگر تم لوگ مجھے بھی مار ڈالو گے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ تم لوگوں نے قانون کا گلا

گھونٹ دیا ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جب پولیس کسی کے پیچھے پڑ جاتی ہے تو اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ کوئی جرم بھی چھپ نہیں سکتا۔"

"ہمیں قانون کا سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو ٹلے۔" شہباز عامر نے غراتے ہوئے کہا اور پستول والے ہاتھ سے اس پر حملہ کر دیا۔

پستول کی نال شجاعت کی کنپٹی پر لگی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل ریت پر گر گیا۔ گل فراز اور شہباز نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی وہ دونوں بڑی بے رحمی سے اسے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ اگر وہ بے رحم نہ ہوتے تو حامد حسن کو اس طرح اذیتیں دے کر ہلاک نہ کرتے اور شاید وہ لوگ اس کا بھی وہی حشر کرنے والے تھے۔ وہ ان کی ٹھوکروں سے بچنے کے لئے ریت پر لوٹتا رہا لیکن ان کی ہر ٹھوکر اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے پر پڑ رہی تھی۔

"اٹھو!" گل فراز نے اسے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "پولیس کی وردی پہن کر تو تم فرعون بن جاتے ہو۔ تمہارا واسطہ آج تک صرف ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو معمولی چور اچکے تھے۔ آج ہم تمہیں بتائیں گے تشدد کیا ہوتا ہے۔"

"تم لوگ مجھے قتل کرنے کے بعد بھی نہیں بچ سکو گے۔" شجاعت نے ہونٹوں سے بہنے والا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔" گل فراز نے کہا۔ "ہم نے تمہیں قتل کرنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔ ہم تو تمہیں نوری خالد کے سامنے پیش کریں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ تم نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہے وہ تم سے اپنا نقصان تو پورا نہیں کر سکے گا مگر آئندہ کے لئے اس کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ چلو' آگے لگو۔"

"شبینہ کہاں گئی؟" شہباز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ حرافہ کہیں چھپ گئی ہو گی۔" گل فراز نے کہا۔

"شبینہ .... شبینہ کہاں ہو تم؟" شہباز اسے پکارنے لگا۔

"میں یہاں ہوں۔" کھنڈروں کی طرف سے شبینہ کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ کھنڈروں سے نکل کر ان کے قریب آ گئی۔

"چلو مسٹر قانون .... آگے بڑھو۔" گل فراز نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

شجاعت علی گھاٹی والے راستے کی طرف چلنے لگا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا

تھا اور چلتے ہوئے بھی وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا وہ ان کے آگے چلتا رہا۔ بلندی کی طرف جانے والے راستے پر وہ اور بھی لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے پیچھے گل فراز تھا پھر شبینہ اور آخر میں شہباز عامر' وہ گھاٹی پر تقریباً ساٹھ فٹ اوپر آ چکے تھے۔

"ٹھہرو۔ مجھے آگے جانے دو۔" شبینہ کہتی ہوئی اچانک ہی گل فراز کے پہلو سے نکل کر آگے چلی گئی اور پھر شجاعت کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ لڑکھڑا کر اس سے ٹکرا گئی۔ شجاعت گرتے گرتے بچا تھا لیکن شبینہ نے ٹکرانے کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھما دی تھی۔

شجاعت کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ شبینہ نے اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا ایک چاقو تھمایا تھا۔ اس پر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ عامر اور گل فراز کی ساتھی تھی اور یقیناً حامد حسن کے قتل میں بھی شریک تھی لیکن اس کا یہ اقدام شجاعت کے لئے شدید حیرت کا باعث بنا تھا۔ کیا وہ اپنے ساتھیوں سے بغاوت کر رہی ہے؟ ہاتھ میں چاقو تھمانے کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے خلاف اس کی مدد کر رہی ہے لیکن کیوں؟ کیا وہ سمجھتی ہے کہ شجاعت بچ جائے گا اور ان دونوں کو قانون کی گرفت میں لے لیا جائے گا؟ وہ شجاعت کی مدد کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ ان کے جرم میں شریک نہیں ہے۔ اس طرح وہ اپنے بچاؤ کے لئے پیش بندی کرنا چاہتی ہے؟ کئی سوالات شجاعت کے ذہن میں گونج رہے تھے اور فی الحال ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا لیکن اس کے پاس ایک ہتھیار آ گیا تھا اور شبینہ اس سے چند قدم آگے نکل چکی تھی۔

شجاعت اس تنگ سے راستے پر اوپر چڑھتا رہا اور پھر دفعتاً وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے گرتے ہی بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر اپنے پیچھے آنے والے گل فراز کو پیر سے زوردار ٹھوکر مار دی تھی۔ گل فراز کے لئے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ شجاعت علی کی ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا تھا اور وہ خود الٹے قدموں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے آنے والے شہباز عامر سے ٹکرایا تھا۔ شہباز بھی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ گل فراز کے ساتھ ہی وہ بھی گرا اور وہ دونوں ڈھلوان راستے پر لڑھکنے لگے۔

شجاعت علی بھی اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکا تھا۔ ان کے پیچھے ہی وہ بھی ڈھلان

پر لڑھکنے لگا۔ دفعتاً ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی فضا ایک بھیانک چیخ کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ گل فراز کی چیخ تھی۔ لڑھکتے ہوئے شہباز کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا ٹرائیگر دب گیا تھا اور گولی نے گل فراز کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

شجاعت لڑھکتے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرا کر رک گیا۔ اس نے اٹھنے کے لئے زمین پر ہاتھ ٹکائے تھے کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ وہ پتھر نہیں تھا۔ گل فراز کا پستول تھا۔ اس نے پستول اٹھا لیا اور نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ شہباز بھی گھاٹی کے ڈھلوان راستے کے ایک موڑ پر رک گیا تھا۔ شجاعت پستول سنبھالے نیچے کی طرف پھسلنے لگا۔ ابھی وہ چند گز نیچے اترا ہو گا کہ ٹک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ پستول کا ٹرائیگر دبانے کی آواز تھی۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شہباز نے اس پر فائر کرنا چاہا تھا مگر اس کا پستول خالی ہو چکا تھا۔

شہباز پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی۔ گل فراز خود اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور اس کا اپنا پستول خالی ہو چکا تھا۔ اس نے خالی پستول شجاعت پر کھینچ مارا۔ شجاعت تاریکی میں اپنی طرف پھینکے گئے پستول کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اس کے دائیں کندھے پر لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی اور گل فراز والا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا چاقو تو اس نے اس وقت پھینک دیا تھا جب گل فراز کا پستول اسے مل گیا تھا مگر اب پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

شہباز نے ایک لمحہ کو اوپر دیکھا پھر مڑ کر ڈھلان پر نیچے کی طرف دوڑ لگا دی۔

شجاعت بھی اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ عمودی ڈھلان پر دوڑنا خاصا خطرناک تھا لیکن وہ شہباز کو فرار کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے ڈھلان پر دوڑ رہا تھا ایک دو مرتبہ وہ گرتے گرتے بچا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی تھی۔ اس کا شمار ایسے فرض شناس پولیس آفیسروں میں کیا جا سکتا تھا جو قانون کی بالادستی کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کا ساتھی حامد حسن اپنے فرض پر قربان ہو چکا تھا اور وہ خود موت کے دہانے سے لوٹ کر آیا تھا۔ اب اسے موقع مل رہا تھا اور وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سنبھل کر نیچے کی طرف دوڑتا رہا۔

شہباز اس سے پانچ چھ گز آگے تھا۔ دفعتاً شہباز کا پیر رپٹ گیا۔ اس نے اپنا توازن

برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور پشت کے بل گرا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اوپر سے شجاعت نے چھلانگ لگا دی۔ شجاعت ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر آ کر گرا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر ڈھلان پر لڑھکنے لگے۔

ڈھلان کے اختتام پر شجاعت نیچے تھا اور شہباز اوپر اس نے ایک ہاتھ شجاعت علی کے گلے پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر گھونسے برسانے لگا۔ شجاعت نے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جو اس کے گلے پر تھا۔ وہ کلائی کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر پوری قوت سے مروڑنے لگا۔ شہباز کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کلائی کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ شجاعت نے اسے زوردار جھٹکا دیا۔ وہ کراہتا ہوا ایک طرف لڑھک گیا۔ شجاعت فوراً ہی اٹھ گیا اور شہباز عامر کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ وہ ہر ٹھوکر پر بلبلا رہا تھا۔

"بہت دلیر ہو تم تو۔" شجاعت اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔ "تم تو مجھے پلیٹ میں سجا کر نوری خالد کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اب میں تمہیں پلیٹ میں سجا کر اس خبیث کے سامنے پیش کروں گا۔"

شہباز بری طرح بلبلا رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے شجاعت علی کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ شجاعت پشت کے بل گرا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی شہباز عامر اٹھ کر ایک طرف دوڑنے لگا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر شجاعت پھرتی سے اٹھا اور شہباز عامر پر چھلانگ لگا دی۔ شہباز ایک بار پھر اس کے شکنجے میں آ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ ان دونوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شبینہ موقع پا کر فرار ہو رہی تھی۔ شہباز عامر نے اٹھنے کی کوشش کی مگر شجاعت نے اسے ٹخنوں کے قریب سے پکڑ کر گھسیٹ لیا وہ پشت کے بل گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ شجاعت نے اٹھ کر ایک بار پھر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ شہباز کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اب اس میں مزاحمت کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ شجاعت بھی ہانپ رہا تھا۔ اس نے اس کو آخری ٹھوکر ماری اور اسے قمیض کے کالر سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ اس کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ گھاٹی کے قریب پہنچ کر اس

نے شہباز کا کالر چھوڑ دیا۔

"اٹھو!" شجاعت غرایا۔ "شرافت سے اوپر چلو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

شہباز لڑکھڑاتا ہوا گھاٹی پر چڑھنے لگا۔ پیچھے سے شجاعت اسے دھکے دے رہا تھا۔ بالآخر وہ اوپر پہنچ گئے اور جب وہ اس چھوٹی چٹان کے اوپر سے گھوم کر سامنے آئے تو وہاں صرف شجاعت کی کار کھڑی تھی۔ شہباز لوگوں کی وین غائب تھی شجاعت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شبینہ وہ وین لے کر فرار ہو گئی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر شجاعت نے شہباز کی پنڈلی پر زوردار ٹھوکر ماری۔ شہباز بری طرح چیخا اور ایک ٹانگ پر ناچنے لگا اس نے دونوں ہاتھوں سے مضروب پنڈلی تھام رکھی تھی۔ شجاعت نے اس کے جبڑے پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

"مجھے تم جیسے لوگوں پر بالکل رحم نہیں آتا جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔" شجاعت نے غراتے ہوئے ایک اور ٹھوکر رسید کر دی۔

"تم............ تم............" شہباز ہکلایا۔ "تم نوری خالد کے انتقام سے بچ نہیں سکو گے۔ وہ تم سے ایک ایک بات کا حساب لے گا۔"

"پہلے تو میں تمہارا حساب لوں گا۔" شجاعت علی غرایا۔ اس نے کار کی ڈکی سے رسی نکالی اور شہباز کے ہاتھ پشت پر باندھنے کے بعد اسی رسی سے اس کے پیر بھی باندھ دیئے اور کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اس کے ہونٹوں سے بہنے والا خون ٹھوڑی کو تر کرتا ہوا گلے تک پہنچ گیا تھا۔ اپنے اکھڑے ہوئے سانس پر قابو پانے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور ڈیش بورڈ کے خانے سے فلالین کا ڈسٹر نکال کر ہونٹوں' ٹھوڑی اور گلے سے خون صاف کرنے لگا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے کار میں سے موبائل فون اٹھا لیا اور پولیس کا ایمرجنسی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"پولیس ایمرجنسی سینٹر۔" دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

"میں سب انسپکٹر شجاعت علی بول رہا ہوں۔" شجاعت نے کہا۔ "ایک خطرناک مجرم میری تحویل میں ہے۔ میں بھی زخمی ہوں مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ یہاں دو لاشیں بھی ہیں۔ قریب ترین تھانے کو اطلاع کر دی جائے۔" شجاعت ایک لمحے کو خاموش ہوا

پھر اپنی لوکیشن بتانے لگا۔

"سب انسپکٹر شجاعت علی۔" دوسری طرف سے بولنے والے کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اپنا فون نمبر بتایئے۔"

شجاعت نے اپنا موبائل فون نمبر بتا دیا۔

"آپ فون بند کر دیں۔ میں ابھی آپ کو رِنگ کرتا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

سب انسپکٹر شجاعت نے فون بند کر دیا۔ یہ ضابطے کی کارروائی تھی۔ ایمرجنسی سینٹر پر کوئی اطلاع دینے والے کا فون نمبر لے لیا جاتا تھا اور پھر اس نمبر پر رِنگ کر کے اس امر کی تصدیق کی جاتی تھی کہ واقعی اطلاع درست ہے یا کسی نے مذاق کیا تھا۔ تصدیق کے بعد ہی کوئی کارروائی کی جاتی تھی۔ تقریباً تین منٹ بعد شجاعت کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"ابھی آپ نے پولیس ایمرجنسی سینٹر کو فون کیا تھا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ہاں۔ میں سب انسپکٹر شجاعت علی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے فوری مدد درکار ہے۔ اے ایس آئی حامد حسن کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہاں ایک اور شخص کی لاش بھی پڑی ہے اور ایک مجرم میری تحویل میں ہے۔"

"میں انسپکٹر شیر علی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم وہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ مجرموں کی ایک ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ اپنے اور ساتھیوں کو لے کر نہ پہنچ جائے۔"

"پریشان مت ہو۔ اپنا خیال رکھو .... میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن منقطع ہو گئی۔

شجاعت نے اپنا فون بھی آف کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ دروازہ پوری طرح کھلا چھوڑ دیا تھا اور پیر باہر کی طرف لٹکا لئے۔

"تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔" شہباز نے کہا۔ وہ کار سے تقریباً پانچ فٹ دور زمین پر پڑا تھا۔ "شبینہ نوری خالد کے پاس پہنچ چکی ہو گی اور نوری کے آدمی پولیس سے پہلے ہی یہاں پہنچ جائیں گے اور پھر تمہارا جو حشر ہو گا اس کا تصور

بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں تمہارے ساتھی سے بھی زیادہ خوفناک طریقے سے ماریں گے۔"

"میرا نام شجاعت علی ہے۔" شجاعت نے کہا۔ "اگر میں بزدل ہوتا تو پولیس فورسز میں کبھی نہ آتا۔ میں تم جیسے لوگوں سے نمٹنے کے لئے ہی پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ نوری کو تم کیا سمجھتے ہو؟ وہ خدا تو نہیں؟ تم اس بات کا یقین کر لو کہ ایک دن وہ بھی تمہاری طرح میرے قدموں میں پڑا رحم کی بھیک مانگ رہا ہو گا۔"

"نوری خدا تو نہیں لیکن تم اس کی طاقت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تم جیسے پولیس آفیسر تو اس کے پیروں کے تلوے چاٹتے ہیں۔" شہباز نے کہا۔

"میں ذرا مختلف قسم کا پولیس آفیسر ہوں۔" شجاعت بولا۔ "مجھے نہ تو نوری خالد کی پرواہ ہے اور نہ ان لوگوں کی جو اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔"

"سنو۔" شہباز نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو نوری خالد اس واقعے کو بھول بھی سکتا ہے وہ نہ صرف تمہارا یہ جرم معاف کر دے گا بلکہ تمہیں اتنی دولت بھی دے گا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی دشمنی مول لینے کی بجائے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔"

"نوری خالد جیسے آدمیوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانا میری سب سے بڑی خواہش ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میں اس جیسے لوگوں کے بخیے تو ادھیڑ سکتا ہوں لیکن ان کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔"

"سوچ لو..........." شہباز نے کہا۔ "میں نے تمہیں ایک تجویز دے دی ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اب تمہارا کام ہے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" شجاعت نے کہا۔ "اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ تمہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے بعد میں دنیا کا ہر کام چھوڑ کر سب سے پہلے نوری خالد کا بندوبست کروں گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ موت کا وہ سوداگر اب زیادہ عرصے آزاد نہیں رہ سکے گا۔ وہ انسان نہیں شیطان ہے اور شیطان کو کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" شہباز نے کہا۔ "نوری ایک بہت بڑی طاقت کا نام ہے۔ تم دو چار اچکوں کو گرفتار کر کے یہ سمجھ رہے ہو کہ بہت بہادر اور فرض شناس

پولیس آفیسر ہو۔ تم نوری کو نہیں جانتے۔ وہ تمہارے حکمرانوں کو بھی اپنے قدموں پر جھکانے کی طاقت رکھتا ہے۔ نوری پر ہاتھ ڈال کر دیکھو۔ حکومت کے ایوانوں میں ایسا بھونچال آ جائے گا کہ کچھ بھی نہیں بچے گا۔"

"جب بھونچال آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" شجاعت نے کہا۔ "میری طرف سے بھی تمہارے لئے ایک پیشکش ہے۔ اگر تم نوری کے خفیہ ٹھکانے کا پتہ بتا دو جہاں ہیروئن اور اسلحہ اسٹور کیا جاتا ہے تو میں اس کیس میں تمہیں سلطانی گواہ بنا کر تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں۔ میں تمہاری یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔" شہباز نے کہا۔ "نوری اپنے آدمیوں کی ہر غلطی معاف کر سکتا ہے لیکن غداروں کو وہ معاف نہیں کرتا۔"

"میں تمہیں تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں۔ وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔" شجاعت نے کہا۔

"نہیں۔" شہباز نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی لالچ کوئی ترغیب مجھے اس کے خلاف زبان کھولنے پر نہیں اکسا سکتی۔"

"پہلے تو میں پیار و محبت سے کام نکالنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر اس طرح کام نہ بنے تو مجھے کچھ اور طریقے بھی آتے ہیں۔ ایسے طریقے کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"تھرڈ ڈگری۔" شہباز بولا۔ "تمہاری تھرڈ ڈگری بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو دو تھپڑ کھا کر فر فر بولنے لگتے ہیں۔"

"تھرڈ ڈگری کا تو محض نام بدنام ہے۔" شجاعت مسکرایا۔ "میں تم پر جو طریقے استعمال کروں گا ان کی ڈگری کا اندازہ تم نہیں لگا سکو گے۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" شہباز نے کہا۔

"اچھا۔ اب بکواس بند کرو۔" شجاعت نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر سڑک کی طرف آ گیا۔

☆======☆======☆

ایمرجنسی کو فون کرنے کے تقریباً چالیس منٹ بعد ایک پولیس وین وہاں پہنچ گئی۔ ان کے ساتھ ایمبولینس بھی تھی۔ دونوں گاڑیاں شجاعت علی کی کار کے قریب کھڑی ہو

گئیں۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج بھی ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس گاڑی کا تعلق اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن سے تھا اور ایمرجنسی سینٹر سے اطلاع ملنے پر وہ لوگ اس طرف آئے تھے۔

ایک مسلح کانسٹیبل کو گاڑیوں اور بندھے ہوئے شہباز کے پاس چھوڑ دیا گیا اور پولیس پارٹی کے باقی آدمی شجاعت کی رہنمائی میں اس تنگ سے راستے پر نشیب میں اترنے لگے۔ ان کے پاس ٹارچیں بھی تھیں۔ ٹارچوں کی روشنی میں شجاعت کا ریوالور، دونوں پستول اور وہ چاقو بھی مل گیا جو شبینہ نے شجاعت کو دیا تھا۔

گل فراز کے سر پر گولی لگی تھی۔ دو کانسٹیبل اس کی لاش اٹھا کر اوپر لے گئے۔ شجاعت پارٹی کے انچارج سب انسپکٹر اور دوسرے کانسٹیبلوں کو لے کر اے ایس آئی حامد حسن کی لاش کے قریب پہنچ گیا۔ ٹارچوں کی روشنی میں حامد حسن کی لاش دیکھ کر پولیس والے بھی کانپ اٹھے۔ اس لاش کو بڑی مشکل سے اٹھا کر اوپر پہنچایا گیا تھا۔

دونوں لاشیں ایمبولینس میں ڈال دی گئیں اور جب بندھے ہوئے شہباز کو اٹھا کر وین میں ڈالا جانے لگا تو شجاعت نے انہیں روک دیا۔

"اسے میری گاڑی میں ڈال دو۔ پچھلی سیٹ پر۔" اس نے کہا۔

"کیوں.........؟" پولیس پارٹی کے انچارج سب انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"یہ میرا مجرم ہے۔ اسے میں لے کر جاؤں گا۔" شجاعت علی نے کہا۔ "اے ایس آئی حامد حسن اور اپنے ساتھی کو بھی اس نے قتل کیا ہے۔ اسے میں اپنی تحویل میں رکھوں گا۔"

"لیکن یہ کیس میرے تھانے کی حدود میں ہوا ہے۔ گرفتار ہونے والا ملزم بھی ہماری تحویل میں رہے گا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"یہ میرا کیس ہے اور ملزم میری تحویل میں رہے گا۔" شجاعت نے کہا۔

ان دونوں میں دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر طے پایا کہ اس واقعے کی رپورٹ مقامی تھانے میں درج کی جائے گی۔ ملزم کی گرفتاری بھی مقامی تھانے کے ذریعے ہی لکھی جائے گی اور بعد میں ملزم کو عدالت کے ذریعے گلشن تھانہ کی تحویل میں دے دیا جائے گا تاکہ سب انسپکٹر شجاعت اپنے کیس کے سلسلے میں اس سے تفتیش کر سکے۔

شجاعت نے بادل نخواستہ یہ تجویز مان لی تھی کیونکہ یہاں اس کی اپنی پوزیشن بھی

کچھ کمزور ہو رہی تھی۔ یہ اس کے تھانے کی حدود نہیں تھی۔ کسی دوسرے تھانے کی حدود میں جا کر کوئی کارروائی کرنا خلاف ضابطہ تھا۔ اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے وہ اس تھانے کو اطلاع دیتا اور اس تھانے کے آدمی بھی کارروائی میں اس کے ساتھ ہوتے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی کارروائی کے ارادے سے آیا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اے ایس آئی حامد حسن کی اطلاع پر دوڑا آیا تھا اور حامد حسن نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ اس نے اسے فون نہیں کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے جال میں پھانسنے کے لئے حامد کے نام سے جھوٹی اطلاع دی گئی تھی۔

تھانے میں ایف آئی آر کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد شجاعت جب تھانے سے نکلا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ سیدھا اپنے گھر آیا تھا۔ باتھ روم کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ پھولی ہوئی پکوڑے جیسی ناک' کٹا ہوا ہونٹ' دائیں رخسار پر سیاہ دھبہ اور بائیں آنکھ قدرے سوجی ہوئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کا چہرہ ہے لیکن بہرحال' اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ یہ بگڑا ہوا چہرہ اسی کا ہے۔ ان کم بختوں نے ٹھیک ٹھاک مار لگائی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں میں بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

شجاعت علی نے گرم پانی والا نل کھول لیا اور تولیہ بھگو کر ناک' ہونٹ اور گردن پر جما ہوا خون صاف کرنے لگا۔ سر کے بالوں پر نظر پڑی تو اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ بالوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ اینٹی سیپٹک لوشن کی بوتل کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اس نے کپڑے اتار دیئے اور گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ گرم پانی کی سینکائی سے اسے بڑا سکون ملا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک شاور کے نیچے کھڑا رہا پھر جسم پونچھ کر بگڑے ہوئے چہرے پر اینٹی سیپٹک لوشن لگایا اور لباس پہن کر باتھ روم سے باہر آ گیا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ایس ایچ او تھانے میں موجود نہیں تھا لیکن تھانے میں خاصی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ اے ایس آئی شاہد نے اپنی پارٹی کے ساتھ گشت کے دوران دو نوجوانوں کو کار چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران انہوں نے کار چوری کی کچھ اور وارداتوں کا بھی

اعتراف کیا تھا۔ وہ دونوں کالج کے اسٹوڈنٹ تھے اور بڑے گھرانوں کے لڑکے تھے۔ مادر پدر آزادی نے انہیں جرائم کی طرف دھکیل دیا تھا۔ انہوں نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ وہ کاریں چوری کرنے کے بعد شیر شاہ کے علاقے میں گاڑیوں کے پرانے پرزے فروخت کرنے والے ایک دکاندار کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر دیتے تھے۔ دکان کے پیچھے ایک وسیع گیراج تھا جہاں چند منٹ کے اندر اندر اچھی بھلی کار کو پرزوں میں تبدیل کر دیا جاتا اور دکاندار یہ پرزے اسپیئر پارٹس کی مارکیٹ میں فروخت کر دیتا۔ آج وہ دونوں لڑکے اے ایس آئی شاہد کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ان دونوں کے گھروں میں بھی ان کے پکڑے جانے کی اطلاع ہو گئی تھی اور دونوں کے باپ بھی اس وقت تھانے میں موجود تھے۔ وہ اپنے بیٹوں کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اے ایس آئی کو برے نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے کہ شجاعت علی پہنچ گیا۔

"کیا معاملہ ہے شاہد! یہ کون لوگ ہیں؟" اس نے اے ایس آئی شاہد سے پوچھا۔

"ان دونوں لڑکوں کو ایک کار چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ یہ ان دونوں لڑکوں کے والد ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے ذاتی دشمنی کی بناء پر ان لڑکوں کو پکڑا ہے۔ اب یہ لوگ اوپر تک اپنی پہنچ کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔" شاہد نے بتایا۔

"ان لڑکوں سے کچھ اور برآمد ہوا؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"یس سر! ایک کی جیب سے ڈھائی ہزار روپے اور دوسرے کی جیب سے پونے دو ہزار روپے اور ایک ٹی ٹی پستول برآمد ہوا ہے۔" اے ایس آئی شاہد نے بتایا۔

"کیوں صاحب!" شجاعت نے ایک لڑکے کے باپ کو گھورا۔ "کیا آپ اتنے بڑے رئیس ہیں کہ بیٹے کو جیب خرچ کے طور پر اتنی رقمیں دیتے ہیں اور یہ پستول کیا کھلونا سمجھ کر دیا تھا؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ شخص بولا۔ "میرے بیٹے سے پستول برآمد نہیں ہوا۔ اسے جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں ایس پی سے بات کروں گا۔ ان سے میرے ذاتی مراسم ہیں۔ میں دیکھتا ہوں میرے بیٹے کو کس طرح بند کیا جاتا ہے۔"

شجاعت چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ ایس پی کے گھر کا نمبر تھا۔ شجاعت کو یقین تھا کہ صاحب اس وقت گھر پر ہوں گے اور

شاید سو چکے ہوں۔ ایک منٹ بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ کال خود ایس پی صاحب نے ریسیو کی تھی۔

"سب انسپکٹر شجاعت بول رہا ہوں۔" شجاعت علی نے آواز سن کر کہا۔ "اس وقت زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں سر! لیکن ایک صاحب آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ ایک سیکنڈ ہولڈ کیجئے سر!" اس نے ریسیور اس شخص کی طرف بڑھا دیا جس نے ایس پی کے نام کی دھمکی دی تھی............ "لو.......... بات کرو۔ ایس پی صاحب لائن پر ہیں۔"

اس شخص نے جلدی سے ریسیور لے لیا۔ کچھ دیر تک مختلف بڑے ناموں کے حوالے دے کر اپنا تعارف کرانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس کے چہرے پر زردی سی پھیلتی چلی گئی۔ اس نے ریسیور شجاعت کی طرف بڑھا دیا۔ شجاعت کچھ دیر تک دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر تھینک یو سر کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"شاہد!" اس نے اے ایس آئی شاہد کی طرف دیکھا۔

"یس سر!" شاہد فوراً ہی مستعد ہو گیا۔

"ان کی ایف آئی آر کاٹو اور دونوں کو حوالات میں بند کر دو اور ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ جو بھی ان کی سفارش لے کر آئے اسے بھی بند کر دو۔"

"ٹھیک ہے سر!" اے ایس آئی شاہد نے جواب دیا۔

"اب آپ لوگ کسی ایسے شخص کو تلاش کریں جو عدالت سے ان کی ضمانت کروا سکتا ہو۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" شجاعت نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنے اثر و رسوخ کی دھمکیاں دے رہے تھے لیکن اب منت سماجت پر اتر آئے تھے۔

"جناب' یہ دونوں کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ اگر ایک مرتبہ جیل چلے گئے تو ان کی زندگی برباد ہو جائے گی۔" اس شخص نے کہا جس نے ایس پی کے نام کی دھمکی دی تھی۔

"ان کی بربادی کا آغاز تو اسی روز ہو گیا تھا جب آپ لوگوں نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔" شجاعت نے اسے گھورا۔ "کیا آپ نے کبھی یہ سوچنے کی

زحمت کی تھی کہ آپ کا بیٹا آدھی رات تک کہاں غائب رہتا ہے؟ کیا آپ نے بیٹے سے کبھی پوچھا کہ اس کی جیبوں میں بھرے ہوئے نوٹ کہاں سے آتے ہیں؟"

"معاف کر دیجئے جناب! بچے ہیں' بھول ہو گئی ان سے۔ آئندہ یہ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ جس طرح بھی ہو سکتا ہے یہ معاملہ یہیں ختم کر دیجئے۔ میں ہر طرح کا جرمانہ دینے کو تیار ہوں۔" اس شخص نے کہا۔

"بچے ہیں۔" شجاعت نے اسے گھورا۔ "جس نے کتابیں پھینک کر پستول ہاتھ میں پکڑ لیا ہو وہ ناسمجھ بچہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو ان سے یہ معلوم کرنا ہے کہ انہوں نے پستول کہاں سے لیا تھا اور کار چوری کے علاوہ اور کون کون سی وارداتیں کر چکے ہیں۔ آپ میرا وقت ضائع مت کیجئے اور تشریف لے جایئے۔"

وہ دونوں آدمی دیر تک منت سماجت کرتے رہے مگر شجاعت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ دونوں لڑکے مجرم تھے اور کسی مجرم کو وہ کسی طور بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی دوران ایس ایچ او بھی آ گیا۔ وہ دونوں آدمی اب ایس ایچ او کی منت سماجت کرنے لگے تھے۔ ایس ایچ او سے شجاعت کی ذرا لگتی تھی۔ وہ ان لڑکوں کا معاملہ "مک مکا" کرنے پر تیار نظر آ رہا تھا۔ اس نے شجاعت کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"کیا معاملہ ہے یار۔ ایک چھوٹی سی بات کو اتنا بڑا مسئلہ کیوں بنا رہے ہو۔ لعنت بھیجو ان پر۔ دو چار ہاتھ مار کر چھوڑ دو۔" ایس ایچ او نے کہا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ شجاعت اس کا ماتحت ہونے کے باوجود اس کی بات نہیں مانے گا۔

"آپ چھوٹی سی بات کہہ رہے ہیں سر!" شجاعت نے کہا۔ "یہ تو پکے وارداتیے ہیں کوئی اسٹوڈنٹ ایسی حرکتیں نہیں کرتا اور نہ ہی وہ جیب میں پستول لے کر گھومتا ہے۔ ایس پی صاحب کا آرڈر بھی یہی ہے کہ ان کے خلاف ایف آئی آر درج کر کے انہیں حوالات میں بند کر دیا جائے۔"

"تو بات ایس پی صاحب تک پہنچ چکی ہے۔" ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

"یس سر!" شجاعت نے کہا۔ "یہ صاحب ایس پی صاحب کے نام کی دھمکی دے رہے تھے۔ میں نے ایس پی صاحب سے ان کی بات کرا دی۔ ان کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔"

"ایس پی صاحب سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا انتظار کر لیا ہوتا۔"

ایس ایچ او نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایس پی صاحب شجاعت علی کی فیور میں تھے۔ اس کی معقول وجہ بھی موجود تھی وہ یہ کہ شجاعت بڑی دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"ان صاحب نے خود بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں نے بات کرا دی۔" شجاعت نے کہا۔

"آپ لوگ صبح آ جایئے۔" ایس ایچ او نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں صبح ڈی ایس پی صاحب سے بات کروں گا شاید کوئی راستہ نکل آئے۔"

وہ دونوں ایس ایچ او کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

"شجاعت علی!" ایس ایچ او نے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ تم آج کل کیا کرتے پھر رہے ہو۔ ایمرجنسی سینٹر سے اطلاع ملی تھی کہ تم اپنے علاقے سے باہر کسی قسم کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہو اور تم جانتے ہو کہ یہ سب کچھ خلاف ضابطہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں سر! لیکن معاملہ نوری خالد کا تھا۔ میرا اس کے خلاف کسی دوسرے علاقے میں کسی کارروائی کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ بلوچستان سے اسلحہ سے بھرا ہوا ایک ٹرک آ رہا ہے۔ اے ایس آئی حامد اس راستے کی نگرانی کر رہا تھا اور آپ کو شاید ابھی تک یہ اطلاع نہیں ملی کہ انہوں نے حامد حسن کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔"

"کیا.........؟" ایس ایچ او اچھل پڑا۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ واقعہ آج دن میں کسی وقت پیش آیا تھا۔" شجاعت نے کہا۔ "مجھے بھی دھوکے سے اس ویرانے میں بلا کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ میرا حلیہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا دوسرے کو میں نے گرفتار کر لیا۔ اس وقت وہ آدمی اس علاقے کے تھانے کی تحویل میں ہے اور میں ہر صورت میں ملزم کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں۔" شجاعت' شبینہ نامی اس لڑکی کا ذکر جان بوجھ کر گول کر گیا تھا۔

"حامد حسن کی لاش کہاں ہے؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"سول ہسپتال میں۔" شجاعت نے جواب دیا۔ "آپ بھی اس کی لاش دیکھیں گے تو کانپ اٹھیں گے۔ کسی انسان کے ساتھ ایسی درندگی کا مظاہرہ میں نے آج تک نہیں

دیکھا۔"

"اوہ!" ایس ایچ او کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"یہاں آ کر یہ فتنہ شروع ہو گیا تھا۔" شجاعت کا اشارہ ان کارچوروں کی طرف تھا۔ "دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو پہلے چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتے ہیں۔ ان کے حوصلے بڑھتے رہتے ہیں اور پھر یہ ایسے خطرناک مجرم بن جاتے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

ایس ایچ او چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ چند لمحے فون پر بات کرتا رہا پھر ریسیور شجاعت کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہاری کال ہے۔"

"یس سب انسپکٹر شجاعت علی۔" وہ ریسیور لے کر ماؤتھ پیس میں بولا۔

وہ دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر بے اختیار اس کے منہ سے "مائی گاڈ" نکلا اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا' کس کی کال تھی؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"میں نے جس ملزم کو اس تھانے کے حوالے کیا تھا۔ اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔" شجاعت علی نے بتایا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تھانے سے باہر جا رہا تھا۔

☆------☆------☆

سب انسپکٹر شجاعت علی ایک گھنٹے سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ تھانے کا گیٹ بند تھا اور اندر کی طرف سے دو آدمیوں کی باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شجاعت علی نے کار سے اتر کر آہنی گیٹ پر دستک دی۔ چھوٹا دروازہ کھل گیا وہ سنتری تھا جس نے لاٹھی کی طرح ایک ہاتھ میں رائفل اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

شجاعت علی جب اندر داخل ہوا تو سنتری نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تھا تو وہ سب انسپکٹر لیکن کراچی کے تمام تھانوں کا عملہ اسے پہچانتا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ ملزموں کے تعاقب میں ہر جگہ پہنچ جاتا تھا اس نے کبھی یہ پروا نہیں کی تھی کہ جس علاقے میں وہ کارروائی کر رہا ہے وہ علاقہ اس کے تھانے کی حدود میں ہے بھی یا

نہیں۔

"یہ کیا کر لیا سر جی!" سنتری نے اس کے بگڑے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کسی تگڑے آدمی سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔"

"ایسے ٹاکرے تو روز ہی ہوتے ہیں۔" شجاعت علی نے کہتے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف دیکھا جو ایک طرف کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا' وہ بھی کانسٹیبل ہی تھا اور سادہ لباس میں تھا۔ اس نے بھی اٹھ کر شجاعت علی کو سلام کیا۔

شجاعت علی سر ہلاتا ہوا چھوٹا سا صحن عبور کر کے عمارت میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ جس کے بائیں طرف ڈیوٹی روم تھا۔ راہداری کے بالکل سامنے محرر کا کمرہ تھا اور اس کے ساتھ بائیں طرف ایس ایچ او کا دفتر۔ اس تھانے کا انچارج وہی سب انسپکٹر تھا جس نے ملزم کو اپنی تحویل میں لیا تھا۔ محرر والے کمرے کے دائیں طرف بھی ایک مختصر سی راہداری تھی جس میں تین کمرے تھے۔ پہلا کمرہ اسلحہ خانہ تھا اور اس سے آگے والے دونوں کمرے حوالات کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

ڈیوٹی روم میں ایک اے ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہا تھا جبکہ نوجوان اے ایس آئی بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شجاعت علی ان کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ کر بائیں طرف کی راہداری میں مڑ گیا۔ ایس ایچ او کے کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شجاعت علی بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔

سامنے میز کے پیچھے کرسی پر تھانے کا انچارج سب انسپکٹر شیخ مراد بیٹھا ہوا تھا۔ میز کے سامنے والی کرسیوں پر ایک اے ایس آئی اور سادہ لباس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ مراد' شجاعت علی کو دیکھ کر اٹھ گیا۔

"آؤ یار! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" اس نے شجاعت علی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کیا معاملہ ہے۔ اس نے خودکشی کیسے کی؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" شیخ مراد نے کندھے اچکائے۔ "اسے حوالات میں بند کرنے کے بعد میں دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ دو تین ڈاکو کسی مکان میں گھس گئے ہیں۔ انہوں نے گھر والوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔ ان کی فائرنگ سے علاقے میں خوف

وہراس پھیل گیا ہے۔ محلے کے بعض لوگوں نے اپنے ذاتی اسلحے سے جوابی فائرنگ کی اور اس مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ فون کرنے والی کوئی عورت تھی۔ اس نے بتایا کہ اس مکان کے مکینوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ میں نفری لے کر فوراً ہی جائے واردات کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک دو لوگوں سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ اس علاقے میں کہیں بھی ڈاکہ نہیں پڑا۔ میں نفری لے کر تھانے واپس آ گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد قیدی نے پانی مانگا۔ ایک سنتری نے اسے پانی دیا۔ قیدی نے اس کے سامنے قمیض کی جیب سے ایک کیپسول نکال کر منہ میں ڈالا اور پانی سے نگل لیا۔ اس نے گلاس میں بچا ہوا باقی پانی سلاخوں والے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے سنتری پر پھینک دیا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ میں دفتر سے نکل کر حوالات کے سامنے پہنچا تو وہ فرش پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ فرش پر لوٹتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا رکھا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ مکر کر رہا ہے۔ حوالات میں آنے والے اکثر ملزم اس طرح کے ڈرامے کرتے ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے خون کی بہت بڑی قے کر دی تھی۔ وہ چیختے ہوئے بری طرح تڑپ رہا تھا اور منہ سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے حوالات کا دروازہ کھلوایا وہ مر رہا تھا۔ میں نے اسے موبائل پر ڈال کر ہسپتال بھجوا دیا۔ اے ایس آئی بشیر موبائل کے ساتھ گیا تھا۔" اس نے سامنے بیٹھے ہوئے اے ایس آئی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے واپس آ کر بتایا کہ ملزم نے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔ اس کی لاش ہسپتال میں ہے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی اس کی موت کی اصل وجہ معلوم ہو گی۔ ویسے میرے خیال میں اس نے خودکشی کی ہے۔ سنتری نے اسے جیب سے کیپسول نکال کر کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"حوالات میں بند کرنے سے پہلے اس کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی؟" شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"لی تھی۔" سب انسپکٹر مراد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کی جیبوں سے جو کچھ بھی برآمد ہوا تھا وہ اس پوٹلی میں ہے۔" اس نے میز پر ایک رومال کی طرف اشارہ کیا جو پوٹلی کی صورت میں بندھا ہوا تھا۔

"تو پھر اس کے پاس وہ کیپسول کہاں سے آ گیا؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔

"میرا خیال ہے اس لڑکی نے دیا ہو گا۔" شیخ مراد بولا۔

"لڑکی!" شجاعت علی اچھل پڑا۔ "کون لڑکی؟"

"جب میں ڈاکے کی اطلاع پا کر یہاں سے گیا تھا تو میرے بعد ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ اس نے محرر کو بتایا کہ اس کے بھائی کو کسی الزام میں پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے وہ اس سے ملنا چاہتی ہے تاکہ اس سے صورت حال معلوم کر کے اس کی نجات کا کوئی بندوبست کر سکے۔ محرر اس لڑکی کو حوالات کے دروازے پر لے گیا تھا۔ محرر بھی وہاں کھڑا رہا تھا پھر فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ لڑکی بھی آ گئی اور بھائی سے ملاقات کا موقع دینے کا شکریہ ادا کر کے واپس چلی گئی تھی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں بھی واپس آ گیا تھا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ ڈاکے کی جھوٹی اطلاع کیوں دی گئی تھی اور ٹیلیفون پر وہ اطلاع بھی یقیناً اس لڑکی نے دی ہو گی۔ ہمارے یہاں سے نکلنے کے بعد وہ موقع پا کر یہاں آ گئی اور قیدی کو زہریلا کیپسول دے کر واپس چلی گئی۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ کسی کو قیدی سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی؟" شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میری موجودگی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔" شیخ مراد نے جواب دیا۔ "محرر سے غلطی بہرحال ہوئی ہے۔"

"اور تمہیں اندازہ نہیں کہ اس غلطی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔" شجاعت علی نے کہا۔ "تم نہیں جانتے وہ نوری خالد کا آدمی تھا اور نوری پورے محکمے کو ہلا کر رکھ دے گا۔ وہ لڑکی کون تھی؟ محرر کو بلاؤ ذرا۔"

شیخ مراد کا اشارہ پا کر ایک سادہ لباس والا محرر کو بلانے چلا گیا کچھ دیر بعد محرر ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کے جسم پر ہیڈ کانسٹیبل کی وردی تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔

"وہ لڑکی کون تھی جس نے قیدی سے ملاقات کی تھی؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"کسی امیر گھر کی جوان اور خوبصورت لڑکی تھی جناب!" محرر نے جواب دیا۔

"اور تم اس کے حسن اور جوانی سے مرعوب ہو گئے تھے؟" شجاعت علی نے اسے

گھورا۔

"نہیں جناب!" محرر کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ "اس نے کہا تھا کہ اس کا بھائی دو دن سے لاپتہ ہے اور اب اسے اطلاع ملی ہے کہ اسے کسی جرم میں پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے تاکہ صورت حال معلوم کر کے اس کی نجات کا بندوبست کر سکے۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آ گیا اور میں نے اس کی ملاقات کروا دی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ............"

"وہ اسے زندگی سے نجات دلا دے گی۔" شجاعت علی نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ بات جب پریس تک پہنچے گی تو کیا طوفان اٹھے گا۔ اخبار والوں نے پہلے ہی پولیس کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔"

"لیکن سر جی!" محرر نے کہا۔ "اس کی موت میں تو ہمارا ہاتھ نہیں ہے۔ ہم نے تو اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ اس سے تو ابھی پوچھ گچھ بھی نہیں کی گئی تھی۔"

"کون تسلیم کرے گا اس بات کو؟" شجاعت علی بولا۔ "وہ پولیس کی تحویل میں مرا ہے۔ اس کی موت کی ذمہ داری بھی پولیس پر ڈالی جائے گی اور پھر اس کی موت سے ہمیں جو نقصان ہوا ہے اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ وہ نوری کا آدمی تھا۔ ہم بہت دنوں سے اس کے خفیہ ٹھکانوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے اس کے لئے اے ایس آئی حامد حسن بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کس بے دردی سے قتل کیا گیا ہے اسے۔ لاش دیکھی تھی تم نے اس کی؟ لیکن کسی کو پولیس کے اے ایس آئی کے قتل کا افسوس نہیں ہو گا۔ سب لوگوں کو اس دہشت گرد اور قاتل سے ہمدردی ہو گی جو پولیس کی تحویل میں مرا ہے۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔"

"لیکن سر جی! وہ لڑکی..........."

"وہ خوبصورت اور جوان لڑکی!" شجاعت علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ لڑکی آ کر بیان دے گی کہ اس نے قیدی کو خودکشی کے لئے زہریلا کیپسول دیا تھا۔ تمہاری پوری زندگی پولیس کی ملازمت میں گزر گئی لیکن.........." وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر محرر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس لڑکی کا حلیہ تو بتاؤ۔"

محرر چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس لڑکی کا حلیہ بتانے لگا۔ شجاعت علی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہی لڑکی تھی جو کھنڈروں میں شجاعت کو ملی اور شہباز عامر

کی لڑائی کے دوران بھاگ گئی تھی۔ اس وقت وہ جینز اور شرٹ پہنے ہوئے تھی اور محرر کے بیان کے مطابق وہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ سر پر دوپٹہ بھی تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ بڑے اطمینان سے تیاری کر کے یہاں آئی تھی۔

شجاعت علی نے وہ پوٹلی کھول لی جس میں شہباز عامر سے برآمد ہونے والی چیزیں تھیں۔ ان چیزوں میں گولڈ لیف کا ایک پیکٹ' جس میں چند سگریٹ تھے' ایک قیمتی لائٹر' بارہ سو ستر روپے کے کرنسی نوٹ' چابیوں کا ایک گچھا اور ایک ٹیلی کارڈ تھا۔ ان میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی اور یہ پتہ چل سکتا کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا تھا۔ اس کے ساتھی گل فراز کے لباس سے بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ دونوں نوری کے آدمی تھے لیکن ان دونوں کی موت کے بعد یہ ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ دونوں اسلحہ اور منشیات کے سب سے بڑے بیوپاری نوری کے ایجنٹ تھے لیکن ظاہر ہے نوری خالد پر براہ راست ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اب وہ لڑکی ہی ایک ایسا ذریعہ تھی جس کے ذریعے کچھ ثبوت حاصل کیا جا سکتا تھا۔ گل فراز اور شہباز عامر اسے شبینہ کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ نام بھی کچھ عجیب سا تھا۔

محرر کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی کسی کار پر آئی تھی اس نے تھانے کے باہر کار کے رکنے اور لڑکی کی روانگی کے بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ البتہ گیٹ پر موجود سنتری نے اس کار کو دیکھا تھا اور جب سنتری کو بلایا گیا تو اس نے کار کا نمبر بتا دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہی نمبر تھا؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"بالکل یقین ہے سر جی!" سنتری نے جواب دیا۔ "بالکل سمپل سا نمبر تھا جو آسانی سے یاد رہ گیا۔ وہ سرخ رنگ کی شیراڈ کار تھی۔ اس کے ڈرائیونگ سائیڈ والے دروازے پر بڑا سا ڈینٹ بھی پڑا ہوا تھا جیسے کسی گاڑی نے ٹکر ماری ہو۔"

شجاعت علی نے نمبر نوٹ کر لیا لیکن اسے یقین تھا کہ اس گاڑی کا بھی اب کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مجرم بہت چالاک تھے اور بڑے منظم طریقے سے باقاعدہ پلاننگ کے تحت کام کر رہے تھے۔

شجاعت علی جب تھانے سے نکلا تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ پہلے اس نے سوچا کہ

سول ہسپتال جا کر لاشوں کے بارے میں کچھ معلوم کرے' لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اس وقت ہسپتال میں کسی ذمہ دار شخص سے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ سیدھا اپنے تھانے آ گیا۔ ایس ایچ او اس وقت بھی تھانے میں موجود تھا۔

"ہاں کیا معاملہ تھا؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"ملزم نے حوالات میں کوئی زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کی ہے اور یہ کیپسول اسے ایک لڑکی دے کر گئی تھی۔" شجاعت علی نے کہا اور پھر اسے پوری تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ ہسپتال گئے تھے۔ حامد حسن کی لاش دیکھی آپ نے؟"

"ہاں اور میرا مشورہ ہے کہ تم اس معاملے سے دستبردار ہو جاؤ۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"حامد حسن کی لاش دیکھنے کے بعد بھی آپ مجھے اس کیس سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔" شجاعت علی نے کہا۔

"اس لئے کہ یہ تمہارا کیس نہیں ہے۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "جو کچھ بھی ہوا ہے وہ شیخ مراد کے علاقے میں ہوا ہے۔ وہ خود ہی نمٹتا رہے گا۔ تم نے غلطی یہ کی کہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے تھانے کی حدود سے باہر چلے گئے۔"

"یہ لوگ بے گناہ اور معصوم شہریوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ میں موت کے ان سوداگروں کے تعاقب میں دنیا کے آخری سرے تک جا سکتا ہوں۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ جوش و جذبے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ اس تھانے کا انچارج میں ہوں۔ میں اپنے کسی ماتحت کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے شہر میں غنڈہ گردی کرتا پھرے۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"غنڈہ گردی!" شجاعت علی نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ اسے غنڈہ گردی کہہ رہے ہیں؟ آپ ایک ذمے دار آفیسر اور میرے سپیریئر ہیں۔ آپ کے منہ سے یہ بات کچھ عجیب سی لگ رہی ہے مجھے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ موت کے ان فرشتوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور ہم اپنے جسموں پر یہ وردیاں سجائے آرام سے تھانوں کے اندر بیٹھے رہیں۔"

"شجاعت علی!" انسپکٹر نے اسے گھورا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ایک پُرجوش اور ولولہ خیز آدمی ہو لیکن زندگی کے اس شعبے میں جوش کے ساتھ ہوش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تم آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ جان بوجھ کر خطرات میں کودنا بہادری نہیں حماقت ہے۔ میری اجازت کے بغیر آئندہ تم کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جو محکمے کی بدنامی کا باعث بنے۔"

"محکمے کی بدنامی کا باعث میں نہیں وہ آفیسر بنے ہوئے ہیں جو جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں بک چکے ہیں۔ جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔" شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ کل شام سے اب تک رونما ہونے والے واقعات نے تمہارے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اس وقت گھر جا کر آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔"

سب انسپکٹر شجاعت علی چند لمحے انسپکٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مزید کچھ کہے بغیر اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ ان واقعات نے واقعی اس کے ذہن کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے ایس آئی حامد حسن اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی بھیانک موت نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا قاتل گرفت میں آیا بھی تو اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شہباز عامر کے ہاتھ آ جانے سے شجاعت علی کو یہ امید ہو گئی تھی کہ وہ اس کے ذریعے نوری کے ان خفیہ ٹھکانوں کا پتہ چلائے گا جہاں ناجائز اسلحہ کے انبار جمع تھے۔ اس طرح اسے نوری پر بھی ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا لیکن سب کچھ گڑبڑ ہو گیا تھا۔

اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ مشرقی افق پر بہت ہلکی سی سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ وہ بہت ہلکی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ میں اسے احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ناک اور رخساروں پر لگی ہوئی چوٹوں میں تکلیف ہونے لگی تھی۔

وہ حامد حسن کی بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے شوہر کی موت کی اطلاع کیسے دے۔ وہ اپنے آپ میں اتنا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ پھر یکایک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ صبح ہونے پر وہ اپنی بہن اور والدہ کو اس کے گھر بھیج

دے گا۔

سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ شجاعت علی نے سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھا۔ عقب سے سفید رنگ کی ایک کار بڑی تیز رفتاری سے بڑھی چلی آ رہی تھی۔ شجاعت علی کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ وہ سفید کار سر پر پہنچ چکی تھی۔ شجاعت علی نے گردن گھما کر دیکھا۔ کار کی پچھلی کھڑکی میں ایک رائفل کی نال دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ تیز رفتار کار بالکل سر پر پہنچ گئی تھی۔ شجاعت علی بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسٹیئرنگ بائیں طرف گھما دیا تھا۔ اس لمحے صبح کی پُرسکون فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ تیز رفتار کار سے کسی آٹومیٹک رائفل سے چلائی جانے والی گولیوں سے شجاعت علی کی کار کی کھڑکیوں کے شیشے اور ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی تھی۔ شیشے کی کرچیاں شجاعت علی پر گریں۔

وہ سفید کار گولیوں کی بارش کرتی ہوئی طوفانی رفتار سے آگے نکل کر موڑ پر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ شجاعت علی کی کار بے قابو ہو کر پہلے فٹ پاتھ پر چڑھی پھر دوسری طرف اٹھ کر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ شجاعت علی کچھ دیر تک اوندھا پڑا رہا پھر سیدھا ہو گیا۔

سڑک پر سے گزرنے والی دو کاریں اور ایک ٹرک رک گیا تھا۔ تین چار آدمی کاروں اور ٹرک سے اتر کر شجاعت علی کی کار کی طرف دوڑے۔ دو آدمیوں نے پہلے کار میں جھانک کر دیکھا۔ پھر دروازہ کھول کر شجاعت علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتار لیا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی شجاعت علی کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا؟" شجاعت علی نے کہا۔ "البتہ کار کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔"

"اجی لعنت بھیجئے کار پر۔" وہ آدمی بولا۔ "شکر کرو تمہاری جان بچ گئی۔ کوئی نیکی کام آ گئی۔ میرے پاس موبائل ٹیلیفون ہے۔ میں ون فائیو کو اطلاع دیتا ہوں۔"

"فائدہ کیا ہو گا پولیس کو فون کرنے سے فائرنگ کرنے والے دہشت گرد تو اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ میاں تم کرتے کیا ہو۔ تمہارا چہرہ تو پہلے ہی بگڑا ہوا ہے۔ کسی سے لڑائی ہوئی تھی کیا؟" ایک دوسرے آدمی نے کہا۔ وہ بھی ادھیڑ عمر ہی تھا۔

چھوٹی گول داڑھی اور سر پر کپڑے کی سفید ٹوپی۔

"میں پولیس آفیسر ہوں قبلہ۔" شجاعت علی نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ابھی اپنے ہی تھانے کی حدود میں تھا۔ "اور میرے چہرے کے بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ رات کو کچھ ایسے ہی لوگوں سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ بڑے صاحب!" وہ پہلے آدمی کی طرف مڑ گیا۔ "آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنا موبائل ٹیلیفون دیں گے۔"

"کیوں نہیں جناب!" اس شخص نے اپنی کار میں رکھا ہوا موبائل ٹیلیفون نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

شجاعت علی نے اپنے تھانے کا نمبر ملایا اور صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فون واپس کر دیا۔ اس دوران ایک دو اور گاڑیاں وہاں رک گئی تھیں اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا؟

شجاعت علی اس قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گیا تھا۔ اس شخص نے واقعی ٹھیک کہا تھا کہ اس کی کوئی نیکی کام آ گئی تھی ورنہ جس طرح گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی تھی اس کا بچ جانا ایک معجزہ ہی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پولیس موبائل پہنچ گئی۔ انسپکٹر بھی ساتھ تھا۔ پولیس کے مسلح کانسٹیبل موبائل سے اترتے ہی اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انسپکٹر دوڑ کر شجاعت علی کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا ہوا؟ کون تھے وہ لوگ۔" اس نے پوچھا۔

"نامعلوم!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "فائرنگ سفید رنگ کی ایک کار سے کی گئی تھی جو پیچھے سے آئی تھی اس کار کی غیر معمولی تیز رفتاری نے مجھے چونکا دیا تھا اور پھر مجھے اس کی کھڑکی میں رائفل کی نال بھی نظر آ گئی تھی۔ اگر میں نیچے نہ جھک جاتا تو اس وقت میرا کام بھی تمام ہو چکا ہوتا۔"

انسپکٹر آگے بڑھ کر اس کی کار کا معائنہ کرنے لگا۔ دونوں ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ کار کی باڈی پر کوئی گولی نہیں لگی تھی جس کا مطلب تھا کہ فائرنگ کرنے والے نے رائفل کی نال کو کھڑکی کے لیول پر ہی رکھا تھا۔ شجاعت علی کے کندھے اور سر گولیوں کی زد میں آ سکتا تھا لیکن وہ بروقت خطرے سے آگاہ ہو کر نیچے جھک گیا تھا۔ اس طرح وہ بچ گیا ورنہ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے۔

ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے لئے شجاعت علی کو ایک بار پھر تھانے واپس جانا پڑا۔ جب وہ دوبارہ تھانے سے نکلا تو صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ اس نے اپنی کار تھانے کے سامنے ہی چھوڑ دی تھی۔ تھانے کی گلی والے موڑ پر رک کر وہ ٹیکسی کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس موڑ پر ایک اخبار والا بھی بیٹھتا تھا۔ شجاعت علی نے تختے پر پڑے ہوئے اخباروں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑا۔ اس کے سامنے جو اخبار پڑا تھا اس کی تین کالمی ایک سرخی نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔

"پولیس آفیسر کا بہیمانہ قتل۔ ایک قاتل گرفتار دوسرا ہلاک۔"

شجاعت علی نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہاکر کی طرف بڑھا دیا اور جھک کر اخبار اٹھا لیا۔ اس خبر کے ساتھ اے ایس آئی حامد حسن کی مسخ شدہ لاش کی تصویر بھی تھی۔ خبر کا متن پڑھ کر شجاعت علی کا دماغ گھوم گیا۔ یہ خبر سب انسپکٹر شیخ مراد کے بیان کے حوالے سے تھی جس نے اخبار کے اسٹاف رپورٹر کو بتایا تھا کہ دو آدمی اے ایس آئی حامد حسن کو اسلحہ کے زور پر اغوا کر کے ویرانے میں لے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے حامد حسن کو اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔ اسٹاف رپورٹر کے مطابق سب انسپکٹر شیخ مراد پولیس پارٹی کے ہمراہ گشت پر تھا کہ دو آدمیوں کو مشکوک انداز میں دیکھ کر انہیں للکارا۔ مگر وہ دونوں فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کرنے لگے تو جواب میں پولیس نے بھی فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں ایک ملزم ہلاک ہو گیا جبکہ دوسرے کو گرفتار کر لیا گیا۔ ملزم سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

شجاعت علی کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اسے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا سب انسپکٹر شیخ مراد نے۔ اس نے محض اپنے نمبر بڑھانے کے لئے اخباری رپورٹروں کو ایک من گھڑت کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ شجاعت ایمرجنسی سینٹر پر اطلاع دے چکا تھا اور شیخ مراد کے تھانے کو کنٹرول روم سے جائے واردات پر پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس نے اخباری نمائندوں کے سامنے اپنی کارکردگی تو بڑھا چڑھا کر پیش کر دی تھی لیکن حوالات میں زیر حراست ملزم کی خودکشی کے بعد اسے جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا اس سے شیخ صاحب کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ شجاعت علی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ آگے پیچھے دو خالی ٹیکسیاں وہاں آ کر رکیں وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

شجاعت علی اب ان حملہ آوروں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہوں نے فائرنگ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ حملہ آور کوئی بھی ہو سکتے تھے۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف محاذ کھولے ہوئے تھا۔ رشوت یا کسی قسم کا دباؤ اس کے عزائم کو نہیں بدل سکا تھا۔ اسے فون پر اکثر دھمکیاں بھی ملتی رہتی تھیں مگر وہ دھمکیوں سے بھی مرعوب ہونے والا نہیں تھا۔ اس شہر میں اس کے بیسیوں دشمن تھے جو اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ اے ایس آئی حامد حسن اس کا دست راست تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح نڈر اور دلیر تھا۔ بے خوف آتش نمرود میں کود جانے والا۔ وہ بھی بہت بلند ارادے لے کر پولیس میں آیا تھا اور بالآخر فرض کی پکار اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔

شجاعت علی جب گھر پہنچا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کی چھوٹی بہن سلطانہ یونیورسٹی جانے کے لئے گھر سے نکل رہی تھی۔ سلطانہ اس سے تقریباً چار سال چھوٹی تھی۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ بھائی کی طرح سلطانہ کے دل میں بھی وطن کی خدمت کا جذبہ تھا لیکن اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ ایم اے کر چکی تھی اور اب یونیورسٹی میں گونگے' بہرے اور ذہنی معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کا کورس کر رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ کورس مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے خرچ پر ایسا ادارہ کھولے گی جہاں گونگے بہرے اور ذہنی طور پر معذور بچوں کو تعلیم و تربیت دی جائے گی تاکہ یہ لوگ بھی معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر سکیں اور کسی قسم کے احساس محرومی کا شکار نہ ہوں۔

شجاعت علی کو اپنی گاڑی کی بجائے ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر سلطانہ چونک گئی تھی اور جب اس نے شجاعت علی کے چہرے کو دیکھا تو یکدم پریشان ہو گئی۔ شجاعت علی رات کو جب گھر آیا تھا تو سلطانہ اور اس کی والدہ سو رہی تھیں۔ والد بھی اپنے کمرے میں تھے۔ شجاعت علی نے کسی کا سامنا نہیں کیا تھا۔ ملازم نے دروازہ کھولا تھا اور اس کے واپس جانے کے بعد ملازم ہی نے دروازہ بند بھی کیا تھا۔

"یہ .... یہ کیا ہوا آپ کو بھائی جان؟ اور آپ کی گاڑی کہاں ہے؟" سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پولیس میں رہ کر تو یہی کچھ ہو گا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" شجاعت علی

نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور رہی گاڑی والی بات تو وہ خراب ہو گئی تھی میں پولیس اسٹیشن پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

"آپ رات کو گھر بھی نہیں آئے تھے۔" سلطانہ نے کہا۔

"تھوڑی دیر کے لئے آیا تھا مگر تم سو رہی تھیں۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ سلطانہ کی باتوں سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے آج کا اخبار نہیں دیکھا تھا۔ "کیا آج تم چھٹی نہیں کر سکتیں؟"

"کوئی خاص بات؟" سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "تم نے اخبار نہیں دیکھا کیا؟"

"ہاکر آج اخبار ڈال کر ہی نہیں گیا۔" سلطانہ نے کہا۔ "وہ مہینے میں تین چار مرتبہ ناغہ ضرور کرتا ہے اور پہلی تاریخ کو بل پورا وصول کرتا ہے۔ مگر بات کیا ہے؟"

"اندر آؤ............" شجاعت علی دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہ دونوں ابھی تک باہر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

راہداری میں داخل ہوتے ہی ماں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ بھی شجاعت کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"کچھ نہیں ہوا ماں جی۔ معمولی سی چوٹیں ہیں۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔ میرے لئے چائے بھجوا دیجئے۔" شجاعت کہتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"ناشتہ نہیں کرو گے؟" ماں نے پوچھا۔

"ناشتہ تھوڑی دیر بعد کروں گا۔ آپ صرف چائے بھجوا دیں۔" شجاعت نے کہا۔

وہ دونوں بہن بھائی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی جان!" سلطانہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم ماں جی کو لے کر حامد حسن کے گھر چلی جاؤ۔" شجاعت علی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خیریت؟" سلطانہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے۔

"کل شام حامد حسن کو قتل کر دیا گیا ہے۔ آج اخباروں میں بھی خبر چھپ چکی ہے۔"

"یہ .... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" سلطانہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"یہ درست ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "ہم دونوں ایک اہم کیس پر کام کر رہے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ اسلحہ سے بھرا ہوا ایک ٹرک بلوچستان سے آ رہا ہے۔ حامد حسن راستے کی نگرانی کے لئے حب چوکی کی طرف گیا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر پوری کہانی سنانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

"میں صبح ساڑھے پانچ بجے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں مجھ پر بھی فائرنگ کی گئی جس کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی۔ سائرہ کو اب تک حامد کے قتل کی خبر ہو چکی ہو گی۔ نہ جانے اس بیچاری کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ تم ماں جی کو لے کر فوراً وہاں چلی جاؤ۔ میں بھی تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔"

ٹھیک اس لمحے ماں جی چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔ وہ کپ شجاعت علی کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

"وقت پر کچھ کھا پی لیا کرو۔ دن رات چائے پی پی کر کلیجہ جلاتے رہتے ہو۔ ارے؟ اسے کیا ہوا ہے؟ کچھ کہا ہے تم نے؟ رو کیوں رہی ہے یہ؟" وہ سلطانہ کی طرف دیکھنے لگی جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"حامد حسن کا انتقال ہو گیا ہے ماں جی۔" شجاعت علی نے کہا۔ "آپ سلطانہ کے ساتھ سائرہ کے پاس چلی جایئے۔ میں بھی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔"

حامد حسن کے انتقال کا سن کر اس کی ماں سناٹے میں آ گئی۔ حامد کو بھی وہ بیٹے ہی کی طرح سمجھتی تھی جب اس نے سائرہ سے شادی کی تھی تو دونوں کے والدین ناراض ہو گئے تھے اور وہ دونوں کئی مہینوں تک ان کے ہاں رہے تھے۔ الگ مکان لینے کے بعد بھی وہ دونوں اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔ کل شام ہی کو تو سائرہ ان کے ہاں آئی تھی اور رات کا کھانا کھا کر گئی تھی۔

"کیا ہوا اسے؟ وہ تو ٹھیک ٹھاک تھا۔" ماں جی نے کہا۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی تھی۔

"اسے قتل کیا گیا ہے۔" شجاعت علی نے کہا اور اسے ایک بار پھر تفصیل دہرانی پڑی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ اور ماں جی حامد حسن کے گھر روانہ ہو گئیں۔ شجاعت علی ڈرائنگ روم میں بیٹھا صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا پھر وہ بھی کپڑے بدل کر حامد

کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پولیس کے بہت سے اعلیٰ افسران بھی پہنچ چکے تھے۔ تھانے کے عملے کے دو تین آدمی حامد حسن کی نعش ہسپتال سے لے آئے تھے۔ عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ اس علاقے کے سینکڑوں لوگ وہاں جمع تھے۔ حامد حسن کو اگرچہ اس مکان میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن سب ہی سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد جنازہ اٹھا تو کہرام سا مچ گیا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ پہلی بار کسی پولیس والے کے لئے سینکڑوں لوگوں کو آنسو بہاتے دیکھا گیا تھا۔ اس کی وجہ حامد حسن کا وہ کردار اور حسن سلوک تھا جس نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

تدفین کے بعد واپسی پر چار بج گئے۔ شجاعت علی افسردہ سا دری پر بیٹھا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کچھ لوگ بیٹھے حامد حسن ہی کی باتیں کر رہے تھے اور کچھ شہر کی موجودہ صورت حال پر تبصرے کر رہے تھے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں شام کو شائع ہونے والا ایک اخبار تھا۔ شجاعت علی نے اس سے اخبار لے لیا۔ یہ اخبارات سنسنی خیز سرخیاں لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن آج کے صفحہ اول کی سرخیاں واقعی سنسنی خیز تھیں۔

شجاعت علی کو ان خبروں کا متن پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اسی کے ساتھ تو پیش آیا تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ نہیں ہوا تھا وہ اس کی تفصیل سے بھی واقف تھا۔ اخبار نے یقیناً مرچ مسالہ لگا کر ہی خبریں شائع کی ہوں گی۔ شجاعت علی نے اخبار اس شخص کو واپس کر دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر حامد حسن کے والد کے پاس جا بیٹھا جو جوان بیٹے کی موت کے صدمے سے نڈھال ہو رہا تھا وہ اس سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے تھانے کا کانسٹیبل تھا۔

"کیا بات ہے رحیم؟" شجاعت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایس پی صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" کانسٹیبل رحیم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔" شجاعت نے کہا۔

کانسٹیبل کے جانے کے بعد شجاعت کچھ دیر مزید وہاں بیٹھا رہا پھر حامد حسن کے والد

سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل چلتا ہوا سات منٹ میں گھر پہنچ گیا اور اپنے کمرے میں آ کر یونیفارم پہننے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ گھر سے نکلا۔ سڑک پر آتے ہی اسے ٹیکسی مل گئی۔

جب وہ ایس پی کے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں ڈی ایس پی اور اپنے تھانے کے ایس ایچ او' انسپکٹر ظہور کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شجاعت نے دفتر میں داخل ہوتے ہی سلیوٹ کیا اور وہیں رک کر باری باری ان تینوں افسروں کی طرف دیکھنے لگا۔ شجاعت کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ضرور کوئی اہم معاملہ ہے۔ اگر کوئی اور بات ہوتی تو یہ دونوں افسران یہاں موجود نہ ہوتے۔

”بیٹھو شجاعت علی..........“ ایس پی صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”یس سر تھینک یو سر!“ شجاعت کہتے ہوئے آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کل اور آج صبح جو کچھ بھی ہوا وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“ ایس پی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک پولیس آفیسر کے قتل اور دوسرے پر قاتلانہ حملے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈی آئی جی صاحب نے ان واقعات کا بڑی سختی سے نوٹس لیا ہے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم اور اے ایس آئی حامد حسن وہاں کیسے گئے تھے۔ کیا یہ سب کچھ خلاف ضابطہ نہیں تھا؟“

”میں سمجھتا ہوں سر!“ شجاعت نے جواب دیا۔ ”آپ کے علم میں ہے کہ میں اسلحہ اور منشیات کے اسمگلر نوری خالد کے کیس پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ اسلحہ سے بھرا ہوا ایک ٹرک بلوچستان سے حب کے راستے کراچی پہنچنے والا ہے۔ میں نے اے ایس آئی حامد حسن کو راستے کی نگرانی کے لئے حب چوکی کی طرف بھیج دیا تھا تاکہ اس ٹرک کا پیچھا کر کے اس خفیہ ٹھکانے کا پتہ چلایا جا سکے جہاں غیر قانونی طور پر اسلحہ ذخیرہ کیا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شہر میں غیر قانونی اسلحہ کی کس قدر بھرمار ہو چکی ہے۔ جن نوجوانوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہونی چاہئیں تھیں وہ خطرناک آتشیں اسلحہ سے کھیل رہے ہیں۔ ان کی انگلیاں قلم چلانے کی بجائے پستولوں اور رائفلوں کے ٹرائیگر دبانا سیکھ رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے ایک طرف معصوم نوجوانوں کے ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ تھما دیا گیا ہے تو دوسری طرف ان کی رگوں میں منشیات کا زہر ملا کر انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج

کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذمے دار نوری جیسے لوگ ہیں جو دولت کی ہوس میں ہماری نوجوان نسل کو موت کے دہانے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ چند روز پہلے میں نے نوری خالد کے بنگلے سے نکلنے والی ایک کار پر چھاپہ مار کر پانچ کلاشن کوف رائفلیں اور بیس کلو ہیروئن برآمد کی تھی۔ میری اس کارکردگی پر مجھے ترقی دے کر سب انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس کیس میں جس شخص کو گرفتار کیا گیا تھا وہ تیسرے ہی روز محض دس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا ہو گیا تھا اور اس کی ضمانت دینے والا نوری خالد تھا۔“ شجاعت علی چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ اس نے باری باری تینوں افسروں کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اسلحہ کے ٹرک کے بارے میں اطلاع ملتے ہی میں نے اے ایس آئی حامد کو راستے کی نگرانی کے لئے بھیج دیا تھا۔ سہ پہر کے قریب مجھے ایک فون کال ملی۔ حامد حسن نے فوری طور پر مجھے مقررہ جگہ پر پہنچنے کے لئے کہا تھا اور جب میں وہاں پہنچا تو حامد حسن زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس پر بربریت کی انتہا کر دی گئی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ مجھے اس نے فون نہیں کیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حامد حسن کو اذیت کا نشانہ بنانے کے بعد مجھے بھی دھوکے سے یہاں بلایا گیا ہے۔ میرا یہ خیال درست نکلا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک لڑکی اور دو نوجوانوں نے گھیر لیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ نوری خالد کے آدمی ہیں۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتے تھے لیکن مقابلے کے دوران ان میں سے ایک اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی۔ شہباز عامر نامی نوجوان کو میں نے گرفت میں لے لیا جسے بعد میں متعلقہ تھانے کے حوالے کر دیا لیکن تھانے کا عملہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ شبینہ نامی وہی لڑکی بھیس بدل کر تھانے پہنچ گئی۔ اس نے حوالات میں بند ملزم سے ملاقات کی اور اسے ایک زہریلا کیپسول دے کر غائب ہو گئی جسے کھا کر ملزم نے خودکشی کر لی۔“

”لیکن..........“ ایس پی صاحب نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”اس تھانے کے ایس ایچ او شیخ مراد نے ڈی آئی جی صاحب کو ملزم کی ہلاکت کے سلسلے میں جواب طلبی پر جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ تم نے ملزم شہباز عامر کو جب اس کے حوالے کیا تو وہ ادھ موا ہو رہا تھا۔ تم نے اس کی پٹائی کی تھی اور وہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے ختم ہو گیا۔“

”جی!“ شجاعت علی اچھل پڑا۔ ”آپ میرا چہرہ دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے انگلی سے

اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ چہرہ دو آدمیوں کی پٹائی سے بگڑا ہے۔ مجھے کچھ اندرونی چوٹیں بھی لگی ہیں جن کی تکلیف محسوس کر رہا ہوں لیکن میں ابھی تک زندہ ہوں۔ میں نے ملزم شہباز کی پٹائی ضرور کی تھی لیکن وہ میری لگائی ہوئی کسی چوٹ سے نہیں مرا اس کی موت زہریلے کیپسول سے واقع ہوئی ہے۔ تھانے میں اس لڑکی کی آمد اور اس زہریلے کیپسول کے بارے میں مجھے خود شیخ مراد نے بتایا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس کی موت کا الزام میرے سر کیوں تھوپ رہا ہے۔ بہرحال' میرا خیال ہے کہ ہمیں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا چاہئے۔ اس سے ملزم کی موت کی وجہ کا پتہ چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایس پی صاحب نے کہا۔ "انسپکٹر ظہور اور ڈی ایس پی صاحب کو شکایت ہے کہ تم اکثر و بیشتر اپنے اختیارات سے تجاوز کر جاتے ہو۔ کل تم نے روزنامچے میں اپنی روانگی بھی نہیں لکھی تھی۔"

"جب مجھے حامد حسن کے نام سے موبائل فون پر کال ملی تو میں تھانے سے بہت دور تھا۔ اس لئے روزنامچے پر روانگی درج نہیں کر سکا۔ پھر کال ملتے ہی حب چوکی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔" سب انسپکٹر شجاعت علی نے بتایا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ایک ذمے دار اور فرض شناس آفیسر ہو۔" ایس پی صاحب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اس لئے تمہاری بعض چھوٹی چھوٹی غلطیاں نظرانداز بھی کر دی جاتی ہیں لیکن یہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے اور ڈی آئی جی صاحب نے اس سلسلے میں جواب طلبی کی ہے۔ تقریباً دو گھنٹے پہلے فون پر ان سے میری بات ہوئی تھی .... یہ جو کچھ تم نے بتایا ہے کل دوپہر بارہ بجے سے پہلے تحریری رپورٹ کی صورت میں مجھے بھیج دو اور آئندہ ذرا احتیاط سے کام لینا۔ ایک حملہ ہو چکا ہے کوئی دوسری کوشش بھی ہو سکتی ہے۔"

"یس سر!" شجاعت علی نے کہا۔

"ٹھیک ہے .... اب تم جا سکتے ہو؟" ایس پی صاحب نے کہا۔

شجاعت علی نے کرسی سے اٹھ کر سلیوٹ کیا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

وہ دفتر کی عمارت کے مرکزی گیٹ سے جیسے ہی باہر نکلا اس کی نظریں موڑ پر کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اٹھ گئیں۔ اسٹیئرنگ کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی

تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی شجاعت اچھل پڑا۔

وہ شبینہ تھی۔

شبینہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور کار ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ شجاعت نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت وہاں نہ کوئی ٹیکسی تھی اور نہ ہی کوئی اور گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

☆======☆======☆

اس پر موت کا خوف طاری تھا اور وہ اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے جہنم کی بلائیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں' اس کے چاروں طرف ویرانہ اور تاریکی تھی اور یہ تاریکی ہی اسے اب تک بچائے ہوئے تھی۔ اگر فضا میں ہلکی سی روشنی بھی ہوتی تو اس کا جسم اب تک گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ وہ اس تاریکی اور ویرانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جان توڑ کر جھاڑیوں میں دوڑ رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھا تھا جس سے اس کے ہاتھوں اور چہرے پر خراشیں آ گئی تھیں۔ اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ منہ سے کف جاری تھا۔ پھیپھڑوں میں اب برداشت کی گنجائش نہیں رہی تھی لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رکنے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ وہ جو دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے وہ درندوں سے بھی زیادہ خونخوار تھے۔ وہ دیکھتے ہی اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیں گے اور اس ویرانے میں اس کی لاش پڑی سڑتی رہے گی۔

اس کے دائیں بائیں ویرانہ تھا۔ پیچھے موت کے فرشتے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ سامنے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ساحلی پشتے کے ساتھ بنے ہوئے روشن اپارٹمنٹس کی خوابیدہ سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اگر وہ کسی طرح اس رہائشی پراجیکٹ تک پہنچ جائے تو اس کی جان بچنے کی امید ہو سکتی تھی لیکن ایک میل کا یہ فاصلہ اس کے لئے ایک ہزار میل سے بھی زیادہ لگ رہا تھا اس کی ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔ اب تک تو وہ اپنی قوت ارادی کے سہارے دوڑتا آیا تھا لیکن اب قوت ارادی بھی جواب دے رہی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ چند گز سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکے گا۔

دفعتاً اس کا پیر جھاڑیوں میں الجھا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ ایک کھڈ کی

ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ بالآخر ایک قد آور جھاڑی میں الجھ کر رک گیا۔ پتھروں پر لڑھکنے سے اس کے جسم پر چوٹیں بھی آئی تھیں لیکن یہ معمولی سی تکلیف اذیت ناک موت کے مقابلے میں قابل برداشت تھی۔

اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کھڈ تقریباً بیس فٹ گہرا تھا۔ ایک طرف بارش کے پانی کی وجہ سے زمین میں کٹاؤ سا بن گیا تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اوپر آسمان پر بہت دور ستارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تحت الثریٰ میں پہنچ گیا ہو۔

دفعتاً ویرانے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر اسے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا وہ موت کے جن فرشتوں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس کے سر پر آن پہنچے تھے اس کے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس نے بے بسی سے اطراف میں دیکھا۔ اگر وہ اس کھڈ سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرے تو چند گز سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکے گا اور اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔ اس تاریک کھڈ میں اس کے لئے امید کی ہلکی سی کرن موجود تھی۔ وہ کانٹوں کی پروا کئے بغیر گھنی جھاڑیوں کے اندر گھس گیا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز رک گئی۔ اس نے جھاڑی کی شاخوں سے جھانک کر اوپر دیکھا۔ ستاروں کے پس منظر کی روشنی میں اسے کھڈ کے کنارے پر دو انسانی ہیولے نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف نظر آ رہی تھی دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی تھی لیکن وہ واضح طور پر ان کی آواز نہیں سن سکا تھا۔

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ویرانہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ ان میں سے ایک آدمی کلاشنکوف سے کھڈ کی جھاڑیوں میں اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ کئی گولیاں اس کے قریب بھربھری زمین میں دھنس گئیں۔ اُس کی روح تک لرز اٹھی۔ گولیاں اس کے چاروں طرف بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ایک گولی اس کے سر سے صرف دو انچ اوپر جھاڑی کی ایک شاخ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ وہ اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ پھر دفعتاً اسے یوں لگا جیسے دائیں پنڈلی میں انگارے بھر گئے ہوں۔ ایک گولی پنڈلی کے گوشت کو چیرتی ہوئی

نکل گئی تھی۔ اگر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو نہ دبا لیتا تو موت کے وہ فرشتے اس کی کمین گاہ سے آگاہ ہو کر اس کا پورا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔ چند سیکنڈ بعد فائرنگ بند ہو گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔

"میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ کہیں آگے نکل گیا ہو گا۔"

"میں نے اسے یہاں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔" دوسری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ممکن ہے وہ اس کھڈ کے اندر ہی اندر کسی اور طرف نکل گیا ہو یا وہ جھاڑیوں میں کہیں دبکا بیٹھا ہو گا۔ اب اسے تلاش کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس رہائشی پراجیکٹ کی طرف جانے کی کوشش کرے گا۔ چلو آگے چلتے ہیں۔" پہلی آواز نے کہا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

وہ اب بھی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اس کے ہلنے یا منہ سے نکلنے والی معمولی سی آواز انہیں دوبارہ اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ تکلیف بہرحال اذیت ناک موت کے مقابلے میں قابل برداشت تھی۔

فضا پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ نہایت آہستگی سے جھاڑیوں سے نکلا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا زمین کے اس ندی نما کٹاؤ میں چلنے لگا جو کافی دور تک چلا گیا تھا۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کھڈ سے باہر آ گیا۔ پنڈلی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا جس سے وہ اپنے آپ میں نقاہت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہاتھوں' چہرے اور جسم کے بعد دوسرے حصوں پر خراشوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ ستاروں کی مدھم سی روشنی اس کے لئے کافی تھی۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں کی باتوں سے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ روشن اپارٹمنٹس کی طرف گئے ہوں گے تاکہ اس کا راستہ بلاک کر سکیں۔

چند منٹ پہلے اس کا اپنا ارادہ بھی اس طرف جانے کا تھا لیکن اب وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ قدرے دائیں طرف ہٹ کر چلنے لگا۔ اس طرف تقریباً نصف میل آگے ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی اور اس کے ساتھ کلفٹن کے بنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا

لیکن وہ اس طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کا رخ ڈیفنس کے بنگلوں اور روشن اپارٹمنٹس کے درمیان کھلی جگہ پر واقع کاسینو کی ویران عمارت کی طرف تھا۔

اس کی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ پر بیٹھ گیا اور بے بسی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے کہیں سے مدد نہیں مل سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر خون نہ روکا گیا تو اس کے لئے خطرات بڑھ جائیں گے۔ اس نے اپنی قمیض اتار لی ایک آستین پھاڑ کر اسے کئی مرتبہ تہہ کیا اور گدی سی بنا کر زخم پر رکھ دی۔ دوسری آستین پھاڑ کر اسے پٹی کی طرح کس کر باندھ دیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کاسینو کی طرف چلنے لگا جو اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔

تاریک عمارت کا ہیولہ اب واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ وہ محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

یہ عمارت اگرچہ برسوں سے خالی پڑی تھی لیکن ظاہر ہے وہاں کوئی نہ کوئی چوکیدار تو موجود ہو گا اور پھر اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کا تعاقب کرنے والے ان دونوں آدمیوں کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ وہ کاسینو کی ویران عمارت میں پناہ لے سکتا ہے۔ اس کی تلاش میں ان لوگوں کے اس طرف آنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کاسینو کی عمارت کے قریب پہنچ کر وہ کچھ اور محتاط ہو گیا اس نے کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرانک واچ کا بٹن دبا کر دیکھا۔ ڈائل کے اندر روشن ہونے والے ننھے سے بلب کی روشنی میں گھڑی دو بج کر بیس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ گویا اسے موت کے ان دو فرشتوں سے جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک گھنٹہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔

کاسینو کی عمارت کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی پچھلی طرف ایک چھوٹا دروازہ دیکھ کر وہ اس طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھما دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اندر اس عمارت میں کیا ہو گا۔ تاریکی میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ایک جگہ سیڑھیاں محسوس کر کے وہ رک گیا۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر ریلنگ کے سہارے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ایک کشادہ راہداری تھی۔ وہ دیوار کے سہارے راہداری

میں چلتا رہا۔ اس کا ہاتھ ایک دروازے کو چھونے لگا۔ یہ دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس کی ایک محرابی کھڑکی کلفٹن کی ساحلی تفریح گاہ "فن لینڈ" کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی سے فن لینڈ کی خوابیدہ سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ رات بارہ بجے تک تو فن لینڈ اور اس سے متصل ساحلی پشتے پر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا لیکن اس وقت وہاں اُلو بول رہے تھے۔

وہ کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور کھسک کر پنڈلی ٹٹولنے لگا۔ زخم پر بندھی ہوئی پٹی ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پر چپچپاہٹ سی آ گئی۔ یہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔ سختی سے پٹی باندھنے کے باوجود خون رکا نہیں تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس کے بہاؤ میں کمی آ گئی تھی۔

دفعتاً قدموں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ یہ آواز عمارت کے نچلے حصے سے ابھری تھی۔ اس نے کان آواز پر لگا دیئے۔ وہ دو آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور آواز سن کر تھرا گیا۔

"وہ اسی عمارت میں کہیں موجود ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود اسے اسی دروازے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔"

وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ موت کے دونوں فرشتے اس کے تعاقب میں یہاں پہنچ گئے تھے۔

"تمہیں کہیں وہم تو نہیں ہوا؟" دوسری آواز سنائی دی۔ "ممکن ہے دروازہ چوکیدار نے کھولا ہو اور جسے تم نے دیکھا تھا وہ بھی چوکیدار ہی ہو؟"

"یہاں کا چوکیدار بڑا لاپروا آدمی ہے۔ اسے صرف اپنی تنخواہ سے غرض ہے۔ رات کو وہ کبھی یہاں نہیں ہوتا بلکہ فن لینڈ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جا کر سو جاتا ہے۔"

"ارے! یہ دیکھو۔ فرش پر جمی ہوئی گرد پر قدموں کے نشان اور خون کے دھبے!" دوسری آواز نے کہا۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ موت کے ان فرشتوں کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا۔

"قدموں کے نشان اور خون کے دھبے سیڑھیوں پر جا رہے ہیں تم یہیں رکو۔ میں

اوپر جا کر دیکھتا ہوں اور یہ ٹارچ بجھا دو۔ پولیس کی موبائل سڑک پر سے گزرتی رہتی ہے اگر کسی نے باہر سے روشنی دیکھی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

قدموں کی آواز اب زینے پر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک تار نکال لیا۔ یہ موٹر بائیک کا کلچ وائر تھا جس کی لمبائی تقریباً دو فٹ تھی۔ دونوں سروں پر گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں سرے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں پر لپیٹ لئے اور قدموں کی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قدموں کی آواز اب راہداری میں پہنچ گئی تھی اور پھر یہ آواز اسی کمرے کے سامنے رک گئی۔ جو کوئی بھی تھا اس نے فرش پر جمی ہوئی گرد پر قدموں کے نشانات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا شکار اسی کمرے میں ہے۔

اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے اور فرش کے درمیان خلا میں اسے بہت ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ شاید اس شخص کے پاس پنسل ٹارچ تھی لیکن پھر فوراً ہی روشنی غائب ہو گئی اور چند سیکنڈ بعد دروازہ آہستگی سے کھلا وہ ہوشیار ہو گیا دروازہ ایک ایک انچ کر کے کھلتا چلا گیا پھر پہلے کلاشنکوف کی نالی دکھائی دی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ایک آدمی کا سر اندر داخل ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ایک سیکنڈ بعد وہ کچھ اور آگے بڑھ آیا۔

دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے تار کے دونوں سروں پر گرفت مضبوط کی اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر اس نے آہنی تار کمرے میں داخل ہونے والے کی گردن پر لپیٹ دیا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ شکار کرنے آیا تھا لیکن خود شکار ہو گیا تھا۔

وہ تار کے دونوں سروں کو کھینچتا چلا گیا۔ اس کا دشمن بری طرح مچلا لیکن گردن میں تار کا حلقہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ زبان باہر نکل آئی لیکن زخمی آدمی نے گرفت اس وقت تک ڈھیلی نہیں چھوڑی جب تک وہ بے جان ہو کر اس کے قدموں میں ڈھیر نہیں ہو گیا۔

اس نے تار لپیٹ کر دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور فرش پر پڑی ہوئی کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا۔ اس مشقت سے اس کی پنڈلی سے ایک بار پھر خون رسنے لگا اور دونوں

ہاتھوں میں کلاشنکوف سنبھالے دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اپنے دشمن کی لاش اس نے گھسیٹ کر دروازے کے سامنے سے ہٹا دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی اوپر ضرور آئے گا۔

اس کا خیال درست نکلا۔ تقریباً دو منٹ بعد ہی راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ شخص بھی چند سیکنڈ دروازے کے سامنے رکا پھر اندر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے میں ٹارچ۔ اس نے ٹارچ جلا لی۔ روشنی جیسے ہی لاش پر پڑی وہ بری طرح اچھل پڑا لیکن دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے شخص نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ٹارچ والے شخص کو کلاشنکوف کی زد میں لے لیا۔

"پستول پھینک دو۔" اس کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔ "تم سمجھتے تھے کہ مجھے آسانی سے شکار کر لو گے لیکن جمشید پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔"

اس شخص نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پستول فرش پر پھینک دیا۔ زخمی جمشید نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھین لی اور اسے فرش پر اس طرح رکھ دیا کہ اس کی روشنی اس کے حریف پر پڑتی رہے۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اس شخص کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ جمشید چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی سے کلاشنکوف کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کا بٹ پوری قوت سے گھما کر اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ اس شخص کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور گرد آلود فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ رائفل کے بٹ کی ضرب اس قدر شدید تھی کہ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی۔ جمشید اس کی طرف دیکھتا رہا اس کے چہرے پر اب خوف کے بجائے سفاکی اور درندگی کے تاثرات تھے کچھ دیر تڑپنے کے بعد وہ شخص بے حس و حرکت ہو گیا۔ جمشید کو یقین تھا کہ اب وہ کبھی ہوش میں نہیں آ سکے گا۔ اس نے نفرت آمیز نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا پھر فرش پر پڑا ہوا پستول اٹھا کر پتلون کی جیب میں ڈالا اور کلاشنکوف سنبھالے کمرے سے باہر آ گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے ٹارچ بھی فرش سے اٹھا لی تھی۔

جمشید کمرے سے نکل کر زینے کی طرف بڑھنے کے بجائے راہداری میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ٹارچ جلا کر اس طرح فرش پر رکھ لی کہ اس کی روشنی اس کی ٹانگ پر پڑتی رہے۔ زخم پر بندھی ہوئی پٹی سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے پٹی کھول کر

اسے دوبارہ سختی سے باندھا اور ٹارچ بجھا کر وہیں چھوڑ دی اور کلاشنکوف اٹھا کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔

کاسینو کی عمارت سے نکل کر وہ لنگڑاتا ہوا ساحلی پشتے کی طرف چلنے لگا۔ ساحلی تفریح گاہ اس کے دائیں طرف تھی۔ چند ہی منٹ بعد وہ پشتے کی سڑک پر آ گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس طرف پولیس کی گاڑیاں چکر لگاتی رہتی ہیں لیکن اس وقت رات کے تین بج رہے تھے اور اسے یقین تھا کہ پولیس والے کہیں پڑے سو رہے ہوں گے۔

وہ ساحلی پشتے کی دیوار پر بیٹھ گیا جو سڑک سے تقریباً تین فٹ اونچی تھی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ چونک گیا۔ بائیں طرف کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی تھی وہ دیوار سے سمندر کی طرف اتر گیا اور گیلی ریت پر چلتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں اس نے کار دیکھی تھی۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے وہ دوبارہ پشتے پر آ گیا۔ دیوار پر چڑھنے سے پہلے اس نے اطمینان کر لیا تھا کہ کار میں کوئی نہیں تھا اس نے کار کے اسٹیئرنگ سائیڈ والے دروازے کا ہینڈل دبایا تو یہ جان کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی کہ دروازہ لاک نہیں تھا اور اگنیشن میں چابی بھی موجود تھی۔ اس نے ایک بار پھر اطراف میں دیکھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس کی نظر غیر ارادی طور پر پیچھے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر کوئی موجود تھا۔ اس نے رسک لیتے ہوئے کار کی چھت والی بتی جلا لی۔

وہ ایک لڑکی تھی جو پچھلی سیٹ پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی اور اس کا لباس سیٹ سے نیچے پڑا ہوا تھا۔ جمشید کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لڑکی کسی کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ سترہ اٹھارہ برس رہی ہو گی۔ وہ بلاشبہ حسین تھی۔ سیٹ سے نیچے فٹ میٹ پر پڑا ہوا اس کا لباس بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق کسی معزز اور فیشن ایبل گھرانے سے ہے۔

جمشید دانت کچکچا کر رہ گیا۔ اسے ان والدین پر تاؤ آنے لگا جو مغرب کی تہذیب اور فیشن پرستی کا شکار ہو کر جوان بیٹیوں کو بھی اس حد تک آزادی دے دیتے ہیں کہ وہ

رات گئے تک اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومتی رہیں۔ جمشید کو یقین تھا کہ یہ لڑکی بھی اپنے بوائے فرینڈز کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے بے ہوشی کی حالت میں ویرانے میں چھوڑ گئے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ کار بھی چوری کی ہو گی اور لڑکی کی آبرو ریزی کرنے والوں کا تعلق بھی معزز گھرانوں سے ہو گا۔

جمشید نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر لڑکی کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اسے ساحلی پشتے کی دیوار کے ساتھ لٹا کر اس کا لباس اس کے جسم پر ڈال دیا۔ وہ کار میں آ کر بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کلاشنکوف اس نے برابر والی سیٹ پر رکھ لی تھی۔ کار کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا اسے لڑکی کو اس طرح چھوڑ دینے کا افسوس بھی ہو رہا تھا لیکن ظاہر ہے وہ اسے ساتھ ساتھ لئے نہیں پھر سکتا تھا۔ وہ کار کو تیز رفتاری سے چلاتا ہوا ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی سڑک پر لے آیا اور پھر کار کو ایسی سڑکوں پر موڑتا رہا جہاں کہیں پولیس وین سے سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

گلشن اقبال میں کار اس نے عزیز بھٹی پارک کے سامنے چھوڑ دی اور پیدل چلتا ہوا پارک کے سامنے والے میدان میں آ گیا جہاں قد آدم کیکر کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اس میدان کے ساتھ ہی کالج کی عقبی باؤنڈری وال تھی۔ وہ کالج کی دیوار کے ساتھ جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ کالج کے سامنے والے رخ پر یونیورسٹی روڈ تھا اور بائیں طرف میدان سے آگے رہائشی مکانات تھے۔ تقریباً ہر مکان کے گیٹ یا برآمدے میں لائٹ جل رہی تھی کبھی کبھار چوکیدار کی سیٹی کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ وہ میدان کے کنارے ایک جھاڑی کی آڑ میں کھڑا رہا۔ سائیکل سوار چوکیدار سامنے والی گلی سے نکل کر سیٹی بجاتا ہوا جیسے ہی بھٹی پارک والے بلاک کی طرف مڑا وہ جھاڑیوں سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ اس کی ٹانگ میں اگرچہ تکلیف تھی لیکن وہ تیز سے تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گلیوں ہی گلیوں میں چلتا ہوا اس جگہ سے تقریباً دو فرلانگ دور پہنچ گیا جہاں اس نے کار چھوڑی تھی۔ کار سے اترتے ہوئے اس نے کلاشنکوف اٹھا لی تھی یہ اس کے لئے ایک کارآمد چیز تھی جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک بنگلے کے سامنے وہ رک گیا۔ بنگلے کا گیٹ بند تھا وہ دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔

کودتے ہوئے اس نے سارا بوجھ دوسری ٹانگ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن زخمی ٹانگ کو جھٹکا لگنے سے اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی تھی۔ وہ چند لمحے زخمی ٹانگ دبائے بیٹھا رہا پھر لنگڑاتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ اس نے پتلون کی واچ پاکٹ سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ ایک چابی منتخب کر کے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پھر ایک کمرے میں داخل ہو کر اس نے کلاشنکوف پلنگ پر پھینک دی اور کچن میں آ کر پانی گرم کرنے لگا۔ اس دوران وہ میڈیسن کیبنٹ سے فرسٹ ایڈ بکس لے آیا تھا۔

یہ جمشید کا اپنا بنگلہ تھا۔ اگرچہ وہ مستقل طور پر یہاں رہائش پذیر نہیں تھا لیکن حفاظت کے خیال سے ایک بوڑھا ملازم رکھا ہوا تھا۔ جو اس وقت یقیناً بنگلے کے پچھلی طرف سرونٹ کوارٹر میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہو گا۔ جمشید کبھی کبھار یہاں آیا کرتا تھا۔ اس وقت بیرونی گیٹ کھلوانے کے لئے اس نے بیل بجا کر بوڑھے کو جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لئے دیوار کود کر اندر آیا تھا۔

جمشید نے پہلے پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لیا۔ گولی پنڈلی کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کے بعد وہ اپنے آپ میں بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کہیں ڈھیر ہو چکا ہوتا لیکن وہ بے پناہ قوت ارادی کا مالک تھا اور اب تک اسی قوت ارادی کے سہارے ہی چل رہا تھا۔ اس نے گرم پانی سے زخم دھو کر اسے اسپرٹ سے صاف کیا۔ اسپرٹ لگنے سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے زخم میں مرچیں سی بھر گئی ہوں۔ اس نے بڑی سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔ جلن کا احساس قدرے کم ہوا تو دوا لگا کر پٹی باندھ لی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اتنے گہرے زخم کے لئے یہ علاج کافی نہیں تھا یہ تو محض فرسٹ ایڈ تھی۔ مناسب علاج کے لئے اسے یقیناً کسی ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

اس نے ساری چیزیں اسی طرح فرش پر چھوڑ دیں اور بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے لیکن کچھ دیر بعد تکلیف میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی بند ہوتی چلی گئیں۔ وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔

☆------☆------☆

سب انسپکٹر شجاعت علی بڑی حسرت سے شبینہ والی گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ اس وقت چوراہے پر کھڑا تھا جہاں ہر طرف سے بسوں، منی بسوں اور پرائیویٹ گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ کئی ٹیکسیاں بھی چوراہے سے گزر رہی تھیں مگر کوئی ٹیکسی خالی نہیں تھی۔ شبینہ والی کار اسٹیڈیم روڈ پر ہسپتال کی طرف کافی آگے نکل گئی تھی۔ شجاعت بدحواسی میں اس کا نمبر بھی نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ وہ سرخ رنگ کی شیراڈ کار تھی۔

اتفاق سے ایک پیلی ٹیکسی اس کے بالکل سامنے آ کر رکی۔ دو آدمی نیچے اترے وہ دونوں سادہ لباس میں پولیس والے ہی تھے۔ ان میں سے ایک اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا پچھلی سیٹ پر، وہ دونوں نیچے اترے ہی تھے کہ شجاعت لپک کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر سے اترنے والا آدمی دروازے کے ساتھ لگا کھڑا ڈرائیور کو پیسے دے رہا تھا۔ ٹیکسی کے میٹر پر اٹھارہ روپے پچاس پیسے بنے تھے اور اس شخص نے اسے دس کے دو نوٹ دیئے تھے اور ڈیڑھ روپے کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور ڈرائیور جیبیں ٹٹول رہا تھا۔

"ڈیڑھ روپیہ ٹپ سمجھ کر رکھ لو اور ذرا جلدی سے گاڑی آگے بڑھاؤ۔" شجاعت نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے باہر کھڑے ہوئے اس آدمی کی طرف دیکھا پھر سیدھا ہو کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور اگنیشن کی گھما کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"کہاں جانا ہے جناب۔" اس نے پوچھا۔

"فی الحال سیدھے چلو، سرخ رنگ کی ایک شیراڈ آگے گئی ہے جسے ایک عورت چلا رہی ہے۔ اس کا پیچھا کرنا ہے۔" شجاعت نے کہا۔

ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک باوردی پولیس آفیسر تھا۔ اس نے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور سیدھے ہو کر گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ شجاعت اگلی سیٹ کی پشت پر جھکا آگے دیکھ رہا تھا۔ آگے کئی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ ان میں سرخ شیراڈ بھی تھی۔

سرخ شیراڈ ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ والی روڈ پر مڑ گئی ٹیکسی جب اس موڑ پر پہنچی

تو سامنے سے آنے والی ایک بس راستے میں حائل ہو گئی اور جب راستہ صاف ہونے پر ٹیکسی ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ والی سڑک پر مڑی تو وہ سرخ شیراڈ بہت آگے نکل چکی تھی۔

"ٹیکسی تیز چلاؤ۔ وہ گاڑی کسی گلی میں نہ مڑ جائے۔" شجاعت نے کہا۔

"آپ مطمئن رہیے جناب میں اس گاڑی کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔" ڈرائیور نے کہتے ہوئے رفتار اور بڑھا دی۔

سرخ شیراڈ شرف آباد والے چوراہے سے عالمگیر روڈ پر' بہادر آباد چورنگی کی طرف گھوم چکی تھی۔ ٹیکسی تقریباً دو سو گز پیچھے تھی اور جب ٹیکسی شرف آباد والے چوراہے سے بہادر آباد کی طرف مڑی تو سرخ شیراڈ بہادر آباد چورنگی پر پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

سرخ شیراڈ وسیع و عریض راؤنڈ اباؤٹ گھوم کر شہید ملت روڈ والے چوراہے کی طرف گھوم گئی تھی اور جب ٹیکسی چوراہا گھوم رہی تھی تو موڑ پر دو تین منی بسیں اس طرح پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں کہ سڑک بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹیکسی سے آگے دو کاریں اور بھی تھیں جو ہارن پہ ہارن دے رہی تھیں مگر کسی منی بس کے ڈرائیور کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ بالآخر ایک ڈرائیور نے اپنی بس کو آگے بڑھاتے ہوئے سائیڈ پر لگا لیا اور جب راستہ صاف ہوا تو شجاعت علی نے اگلی سیٹ کی پشت پر جھکتے ہوئے سامنے دیکھا۔ سرخ شیراڈ شہید ملت روڈ والا چوراہا عبور کر کے طارق روڈ کی طرف جا رہی تھی۔

"تیز چلاؤ.......... وہ گاڑی بہت آگے نکل چکی ہے۔"

شجاعت علی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ سرخ شیراڈ طارق روڈ پر کافی آگے نکل چکی تھی۔ اس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی اور یہ محض اتفاق تھا کہ سرخ شیراڈ کو ہر چوراہے پر راستہ صاف مل رہا تھا جبکہ شجاعت کی ٹیکسی کا راستہ بار بار بلاک ہو رہا تھا جس سے درمیانی فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

سرخ شیراڈ سوسائٹی قبرستان والا چوراہا عبور کر کے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں داخل ہو گئی تھی۔ یہاں بھی ٹیکسی کو ٹریفک کی وجہ سے چوراہا پار کرنے میں کچھ

دشواری پیش آئی اور بالآخر جب سڑک کے دوسری طرف پہنچے تو شجاعت کچھ بے چین سا ہو گیا۔ آگے سرخ شیراڈ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کہاں گئی وہ گاڑی۔" شجاعت علی بڑبڑایا۔ "کم بخت کسی گلی میں نہ مڑ گئی ہو۔"

"فکر مت کریں جناب۔ میں اس گاڑی کو نہیں جانے دوں گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

اگلا چوراہا عبور کرنے کے بعد ڈرائیور کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔ آگے شاہراہ فیصل والا موڑ تھا اور اتفاق سے اس موڑ تک صرف دو تین کاریں ہی نظر آ رہی تھیں لیکن اس سرخ شیراڈ کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چوراہے کے بائیں طرف اسکول تھا۔ اسکول کی دیوار کے اختتام پر گلی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گلی کی طرف دیکھا۔ شجاعت بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہ رہی .... ٹیکسی کو اس طرف موڑ لو۔" شجاعت علی نے تیزی سے کہا۔

ٹیکسی اس دوران ذرا سی آگے نکل گئی تھی۔ ڈرائیور نے اسے روک کر ریورس گیئر میں پیچھے ہٹایا اور اس گلی میں موڑ دیا۔ اس گلی میں اسکول کا گیٹ تھا جس کے سامنے چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہ سرخ شیراڈ ان سے کافی آگے جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ ٹیکسی کی اگلی سیٹ کی پشت پر جھکے ہوئے شجاعت نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ شیراڈ کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت برش سے بال سنوار رہی تھی۔

"ٹیکسی آگے لے جاؤں یا روک لوں جناب؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"اس گاڑی کے ساتھ روک لو .... یہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اب میں اسے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔" شجاعت علی نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی شیراڈ کے ساتھ روک لی۔ یہ گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ٹیکسی رکتے ہی شجاعت پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ٹھیک اسی وقت وہ عورت بھی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

"اب تم بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو شبینہ۔" سب انسپکٹر شجاعت علی نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کا ایک ہاتھ ہولسٹر میں اڑسے ہوئے ریوالور پر تھا۔ اس نے ریوالور نکالا نہیں تھا لیکن ضرورت پڑنے پر ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر اسے ہولسٹر سے نکال سکتا تھا۔

"کیا بات ہے آفیسر؟" سرخ شیراڈ سے اترنے والی عورت نے پہلے اس کی طرف اور پھر پیلی ٹیکسی کی طرف دیکھا .... "پولیس والوں نے بھی غنڈہ گردی شروع کر دی۔ میں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی بلکہ اسٹیڈیم روڈ سے ٹی وی اسٹیشن والی سڑک پر مڑتے ہی میں نے اس پیلی ٹیکسی کو دیکھ لیا تھا۔ کیا چاہتے ہو تم۔ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

اس عورت کی شکل دیکھتے ہی سب انسپکٹر شجاعت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہی سرخ شیراڈ تھی۔ وہ پھر عورت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایس پی کے دفتر کے سامنے اس سرخ شیراڈ میں شبینہ ہی کو دیکھا تھا۔ شبینہ نے بھی اسے دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا لیکن یہ عورت شبینہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس نے چہرے پر میک اپ کی دبیز تہیں چڑھا رکھی تھیں۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہی ہو گی لیکن اس نے اپنے آپ کو جوان بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ شجاعت علی اس کی شکل دیکھ کر بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔

"معاف کیجئے خاتون!" وہ پہلے سرخ شیراڈ اور پھر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں دراصل ایسی عورت کی تلاش ہے جو سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب ہے۔ اسٹیڈیم روڈ پر میں نے خود اسے سرخ شیراڈ میں دیکھا تھا اور اس لئے گاڑی کا تعاقب بھی شروع کر دیا تھا۔"

"تو کیا میں تمہیں جرائم پیشہ عورت نظر آتی ہوں۔" وہ عورت چیخی۔ "تم لوگوں نے شریف شہریوں کو تنگ کرنے کے طریقے اپنا رکھے ہیں۔ اب خواتین بھی تم لوگوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رہیں۔ میں آئی جی سے تمہاری شکایت کروں گی۔ کیا میں تمہیں سنگین جرائم میں ملوث جرائم پیشہ عورت نظر آتی ہوں؟"

"نہیں۔" شجاعت علی اس عورت کے چیخنے سے بدحواس سا ہو گیا۔ "وہ تو جوان اور خوبصورت عورت تھی۔"

"تو کیا میں تمہیں بوڑھی اور بدصورت نظر آتی ہوں۔" عورت چیخی۔

"بالکل نہیں .... بالکل نہیں۔" شجاعت سرخ شیراڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ عورت کے چیخنے چلانے سے کچھ لوگ آس پاس جمع ہونے

شروع ہو گئے تھے۔ اگر شجاعت علی کے جسم پر پولیس کی وردی نہ ہوتی تو شاید لوگ اب تک اس کی پٹائی بھی کر چکے ہوتے۔

"چلو بھئی .... نکلو یہاں سے، ہری اپ۔" شجاعت نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ڈرائیو سے کہا .... وہ گھبرا رہا تھا کہ کہیں یہ عورت کوئی اور ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔ وہ سب انسپکٹر تھا۔ وردی پہنے ہوئے تھا۔ اسے کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اپنی کسی غلطی کو وہ غلط رنگ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اس عورت سے اپنی غلطی پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے پسپائی اختیار کر رہا تھا۔

ڈرائیور نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر کے ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اگلی گلی میں دائیں طرف مڑ کر وہ شاہراہ فیصل کے سامنے آ گیا۔

"اب کہاں چلوں جناب؟" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا۔

"گلشن اقبال۔" شجاعت نے جواب دیا اور گہرا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے شبینہ کو اس سرخ شیراڈ میں دیکھا تھا۔ اس نے اسے تاؤ دلانے کے لئے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر اشارہ بھی کیا تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے یہ ٹیکسی مل گئی تھی جس پر اس نے سرخ شیراڈ کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ سرخ شیراڈ راستے میں کہیں رکی بھی نہیں تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا کہ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت شبینہ راستے میں کہیں اتر گئی تھی اور اس کی جگہ یہ ادھیڑ عمر عورت بیٹھ گئی تھی .... اب صرف ایک ہی بات ذہن میں آ رہی تھی کہ اس نے غلط گاڑی کا پیچھا شروع کر دیا تھا۔ عین ممکن ہے شبینہ والی سرخ شیراڈ اسٹیڈیم روڈ پر بالکل سیدھی نکل گئی ہو اور اسی رنگ کی یہ کوئی دوسری شیراڈ ہو جسے ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ والی سڑک پر مڑتے دیکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد شجاعت علی تھانے پہنچ گیا۔ ایس ایچ او ابھی تک پولیس اسٹیشن واپس نہیں آیا تھا ممکن ہے وہ ابھی تک ایس پی کے دفتر میں بیٹھا ہو یا وہاں سے نکلنے کے بعد کسی اور طرف نکل گیا ہو۔

شجاعت علی اپنی کرسی پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب تک اس قسم کے معاملات میں اسے ایس پی کی حمایت حاصل رہی تھی۔ ایس پی بھی اس کی طرح

جوان اور بلند حوصلہ آفیسر تھا۔ وہ اس جیسے مخلص اور جرأت مند افسروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی کے لئے اگر کوئی چھوٹا پولیس آفیسر اپنے اختیارات سے تجاوز بھی کر جاتا تو اس کی غلطی کو نظرانداز کر دیا جاتا۔ تاہم دیگر معاملات اور ڈسپلن کی خلاف ورزی پر ان سے بڑی سختی سے بازپُرس کی جاتی۔ ابھی حال ہی میں اس کے تھانے کے ایک سب انسپکٹر کو احکامات کی خلاف ورزی پر ڈی گریڈ کر کے اے ایس آئی بنا دیا گیا تھا۔

ایس پی کے علاوہ شجاعت علی کو اوپر سے بھی کچھ حمایت حاصل تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ وہ فرض شناس تھا۔ مجرموں کی سرکوبی کے لئے اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ وہ نڈر اور بے خوف آدمی تھا۔ اس نے بعض ایسے کارنامے بھی انجام دیئے تھے جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ نوری خالد کے پیچھے لگ گیا تھا۔ ایس پی صاحب بھی جانتے تھے کہ نوری کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کی رسائی بہت اوپر تک ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان بات نہیں تھی اور شجاعت علی اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ اس وقت تک اس پر براہ راست ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا جب تک اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل جائے۔

اس کیس میں اب تک تین جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ گل فراز تو نشیبی علاقے میں اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اس کا ساتھی شہباز عامر پولیس کی حراست میں ہلاک ہوا تھا اس تھانے کے انچارج شیخ مراد کے کہنے کے مطابق ٹیلیفون پر ڈاکے کی جھوٹی اطلاع دے کر اسے تھانے سے ہٹایا گیا تھا اور پھر کسی جوان اور خوبصورت لڑکی نے تھانے میں آ کر حوالات میں بند شہباز عامر سے ملاقات کی تھی اور اسے زہریلا کیپسول دے کر چلی گئی تھی جسے کھا کر شہباز عامر ہلاک ہو گیا تھا۔

اس لڑکی کے بارے میں شجاعت علی کو یقین تھا کہ وہ شبینہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ شبینہ کی جرأت مندی اور دیدہ دلیری میں کوئی شبہ نہیں تھا جو پولیس کو دھوکا دے کر تھانے میں بند ایک قیدی کی موت کا سامان کر گئی تھی۔ اس کی دیدہ دلیری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ایس پی کے دفتر کے سامنے بھی موجود تھی اور شاید اسی کے انتظار میں وہاں گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر ہاتھ لہراتی

ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ جرأت مند ہونے کے ساتھ وہ چالاک اور ذہین بھی تھی۔ بڑی خوبصورتی سے اسے چکمہ دے گئی تھی اور وہ ایک بڑھیا کا تعاقب کرتا رہا تھا۔

لیکن .... شجاعت علی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ وہ جان بُوجھ کر اس کے سامنے کیوں آئی تھی؟ اگر کوئی شخص کسی معمولی سے جرم میں بھی ملوث تو پولیس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شبینہ عورت ہوتے ہوئے بھی بڑی جرأت مندی کا ثبوت دے رہی تھی۔ وہ جان بُوجھ کر اس کے سامنے آئی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی ہو گی کہ اگر پولیس کے ہاتھ آ گئی تو اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا اور اس پر شہباز عامر کے قتل کے علاوہ دیگر کئی چارجز بھی لگائے جا سکتے تھے لیکن شاید اسے ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ اسے پولیس کا خوف نہیں تھا یا اسے اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکتی۔

شجاعت علی کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ شبینہ، گل فراز اور شہباز عامر کی ساتھی تھی لیکن جب وہ لوگ شجاعت علی کو پستولوں کی زد میں نشیب سے اوپر لا رہے تھے تو شبینہ نے اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کے بجائے ان سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے شجاعت علی کے ہاتھ میں چاقو تھما دیا تھا۔ شجاعت علی اگرچہ اس چاقو کو استعمال نہیں کر سکا تھا لیکن شبینہ کی اس حرکت کی وجہ سے شجاعت کو ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

شجاعت یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اندر داخل ہو کر سیلوٹ کیا۔ شجاعت علی سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کے لئے فون ہے سر............ ایس ایچ او صاحب والے کمرے میں۔" کانسٹیبل نے کہا۔

شجاعت علی اٹھ کر ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فون کا ریسیور میز پر الگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ اس کے ہیلو کے جواب میں ریسیور پر جو نسوانی آواز سنائی دی وہ اس کے لئے اجنبی تھی لیکن جب اس نسوانی آواز نے اپنا تعارف کرایا تو شجاعت اچھل پڑا............ وہ شبینہ تھی۔

شبینہ کا نام سنتے ہی سب انسپکٹر شجاعت علی اچھل پڑا۔

"کیسی رہی یہ دوڑ؟" شبینہ کی کھنکتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

"ٹیکسی کا اچھا خاصا بل بن گیا ہو گا' مجھے افسوس ہے تمہیں یہ نقصان اٹھانا پڑا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اس بل کے لئے محکمے سے کلیم نہیں کرو گے۔"

"بل کی تو مجھے پروا نہیں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "لیکن اس بھاگ دوڑ کے رائیگاں جانے کا افسوس ہے' مگر میں مایوس نہیں ہوا میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تمہیں کہیں نہ کہیں تلاش کر ہی لوں گا۔"

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس کیس سے دستبردار ہو جاؤ۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "نوری خالد بہت بڑی طاقت ہے' وہ بے حد خطرناک انسان ہے' اپنے مخالفین کو کبھی معاف نہیں کرتا' تمہارا نام اس کے مخالفین کی فہرست میں سب سے اوپر ہے وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہے۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ آج صبح مجھ پر حملہ اسی نے کروایا تھا لیکن بچانے والے نے مجھے بچا لیا۔ گولیوں کی بارش میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔"

"اس خوش فہمی میں مت رہنا۔" شبینہ نے کہا۔ "وہ تمہارے لئے صرف ایک وارننگ تھی رائفل کا رخ ذرا سا نیچے کر دیا جاتا تو اس وقت تم بھی اپنے دوست حامد حسن کے ساتھ قبر میں لیٹے ہوتے۔"

"اوہ!" شجاعت چونک گیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم.........."

"ہاں' اس کار میں' میں بھی موجود تھی' جس سے تم پر فائرنگ کی گئی تھی۔" شبینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تم میری ہمت کی داد نہیں دو گے کہ کل رات میں سب انسپکٹر شیخ مراد کو کس طرح بے وقوف بنا کر تھانے میں داخل ہو گئی تھی اور میں نے حوالات میں بند شہباز عامر کو وہ کیپسول دے دیا تھا' جسے کھا کر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ تو کر لیا لیکن پولیس کو نوری خالد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو؟" شجاعت علی نے کہا۔ "اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملتی ہے اور وہ سزا بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ میں یہ عزم لے کر پولیس میں آیا تھا کہ نوری خالد جیسے جرائم پیشہ لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا' وہ اپنے انجام کو ضرور پہنچے گا اور تم جیسے لوگوں کو بھی کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کا ساتھ چھوڑ دو۔ میں تمہیں قانونی

تحفظ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو' نوری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"تم نوری تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "اس نے اپنے گرد اتنے مضبوط حصار قائم کر رکھے ہیں جنہیں پار کرنا تم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" شجاعت نے کہا۔ "لیکن تم نے فون کیوں کیا تھا؟"

"تمہیں خبردار کرنے کے لئے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "تمہارے لئے ایک تجویز ہے' اگر تم نوری خالد کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دو تو وہ سب کچھ بھول جائے گا اور تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تمہاری آنے والی سات پشتیں تک عیش کرتی رہیں گی۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں دولت کے لالچ میں آ کر موت کے اس سوداگر کو کھلی چھٹی دے دوں گا جو اب تک نہ جانے کتنے نوجوانوں کو ہیروئن کے زہر سے مفلوج کر چکا ہے اور کتنے گھروں کو اجاڑ چکا ہے۔ یہ موت کا فرشتہ دہشت گردی کے سہارے کب تک اپنے آپ کو بچائے رکھے گا' میں جب تک اسے قانون کے حوالے نہیں کر دوں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"تم بڑے ضدی ہو۔" شبینہ نے کہا۔ "اور تمہاری یہ ضدیں تمہیں لے ڈوبیں گی۔"

شجاعت نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور اپنے کمرے میں آ گیا' اس وقت اے ایس آئی شاہد بھی آ چکا تھا۔

"آج صبح انہیں عدالت میں پیش کیا تھا سر! تین دن کا ریمانڈ لے لیا ہے۔" اے ایس آئی شاہد نے بتایا۔ "ان کے گھر والوں نے ضمانت داخل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عدالت نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔"

"گڈ۔" شجاعت مسکرایا۔ "ان پر اپنا کام جاری رکھو' کسی کے دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں' مجھے امید ہے کہ یہ لڑکے کارچوروں کے کسی بڑے گروہ سے وابستہ ہیں' اس گروہ کا سراغ لگانے کی کوشش کرو' میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلاجھجک کہہ دینا۔"

"آپ جیسے مہربان افسروں کے تجربات سے ہی مجھے فائدہ اٹھانا ہے سر!" شاہد نے کہا۔

"گڈ!" شجاعت بولا۔ "میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" اس نے شاہد کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "تم پولیس میں کیا مقصد لے کر آئے تھے؟ مجھے اس کا علم نہیں، بعض لوگ صرف نوکری کرنے کے لئے آتے ہیں اور بعض لوگ کچھ کر دکھانے کا عزم لے کر .... یہاں دو راستے بہت واضح ہیں بڑے لوگوں کے سامنے جھک جائے اور جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کر کے اپنے گھر میں دولت کے انبار لگاتا رہے اور زندگی آرام سے گزار دے، لیکن ایسے پولیس افسروں کو لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ دنیا میں تو وہ دشنام اٹھاتے ہیں لیکن اپنی عاقبت بھی خراب کر لیتے ہیں، دوسرا راستہ کٹھن ہے اور دراصل وہی راستہ ایک ذمہ دار اور فرض شناس افسر کا راستہ ہے۔ جب کسی کو پولیس کی ملازمت کے لئے منتخب کر لیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص پر مکمل اعتماد کر لیا گیا ہے۔ وہ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں سکون کی نیند سو رہے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے محافظ جاگ رہے ہیں اور اگر یہ محافظ ہی لٹیرے بن جائیں تو عوام کا پرسان حال کون ہو گا؟ پولیس میں اچھے، برے، سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں لیکن عزت اور نیک نامی اسی میں ہے کہ اچھے کام کئے جائیں۔ جو کام ہمیں سونپا گیا ہے اسے ذمہ داری اور فرض شناسی سے انجام دیں، اس میں شبہ نہیں کہ دولت میں بڑی کشش ہے لیکن جو مزہ عزت سے حلال کی کمائی میں سوکھی روٹی میں ہے وہ حرام کی کمائی میں نہیں۔ اس کانسٹیبل کے بارے میں جانتے ہو نا جسے ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے کپڑے کے میلے سے تھیلے میں سترہ لاکھ روپے کی رقم ملی تھی، وہ کانسٹیبل اپنی پیاری بچی کو لے کر ہسپتال جا رہا تھا۔ اس کے ایک گردے میں تکلیف تھی اور چند روز پہلے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ وہ گردہ نکال دینا پڑے گا یا اس کی جگہ نیا گردہ لگانا پڑے گا۔ اس کانسٹیبل کی بیمار بچی کی زندگی بچانے کے لئے رقم کی بہت ضرورت تھی لیکن اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوا، اس نے وہ رقم ڈی آئی جی صاحب کے سامنے پیش کر دی .... اور پھر مالک کو تلاش کر کے وہ رقم اس کے حوالے کر دی۔ یہ اس کی نیکی اور دیانتداری کا صلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بچی کو شفا دی۔ جس ڈاکٹر نے اس کا گردہ نکال دینے کا مشورہ دیا، اسی نے بتایا کہ گردہ تو بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ سترہ لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے، اگر وہ لالچ میں آ کر اس رقم کو ہضم بھی کر لینا چاہتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا لیکن شاید قدرت اس پر مہربان نہ ہوتی۔"

شجاعت علی چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "دیانت اور فرض شناسی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ پولیس والے عوام کے محافظ ہیں، لٹیرے نہیں۔ اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ اے ایس آئی حامد حسن کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس نے فرض پر اپنی جان قربان کر دی، اسے ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کیا جائے گا۔"

"یس سر!" اے ایس آئی شاہد نے جواب دیا۔

"او کے ینگ مین۔" شجاعت کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "آٹھ بج رہے ہیں، مجھے اپنا یہ چوکھٹا دکھانے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اور اس کے بعد میں گھر چلا جاؤں گا۔ ایس ایچ او آئیں تو انہیں بتا دینا۔"

"یس سر!" اے ایس آئی شاہد نے جواب دیا۔

شجاعت نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ایس ایچ او انسپکٹر دلاور پہنچ گیا۔ وہ دونوں برآمدے میں رک کر باتیں کرنے لگے، اسی دوران ایک کانسٹیبل دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"سر!" وہ سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ "ایمرجنسی سینٹر سے وائرلیس پر ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بلاک ٹو میں نامعلوم دہشت گرد فائرنگ کر رہے ہیں۔"

"اوہ!" انسپکٹر دلاور اچھل پڑا۔ "شجاعت علی، شاہد، رمضان ہری اپ۔"

آناً فاناً میں سات کانسٹیبل اسلحہ اٹھا کر باہر دوڑے۔ تھانے کے گیٹ کے باہر ایک موبائل وین کھڑی تھی اے ایس آئی شاہد اور مسلح کانسٹیبل وین کے پچھلے حصے میں لد گئے، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور انسپکٹر دلاور اور شجاعت وین کے اگلے حصے کی طرف دوڑے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور وہ دونوں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وین ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

وین کا ریڈیو آن تھا۔ ایمرجنسی سینٹر سے بار بار پیغام نشر ہو رہا تھا کہ متعلقہ تھانے کا عملہ فوراً جائے واردات پر پہنچے۔ انسپکٹر دلاور نے مائیک اٹھا کر اپنی روانگی کی اطلاع دی اور مائیک رکھ دیا۔ وہ آکسفورڈ چورنگی پر پہنچے تو فائرنگ کی آواز سنائی دی، ڈرائیور نے وین کی رفتار تیز کر دی۔

فائرنگ کھیل کے ایک میدان میں ہو رہی تھی۔ کھیل کے میدان کے ساتھ ہی ایک دینی مدرسہ تھا' میدان میں فلڈ لائٹس لگی ہوئی تھیں اور محلے کے لڑکے اور مدرسے کے بہت سے طالب علم میدان میں فٹ بال کھیل رہے تھے کہ سرخ رنگ کی ایک کار مکانوں کی ایک تنگ سی گلی سے نکل کر وہاں آ گئی۔ اس کار میں پانچ دہشت گرد تھے جنہوں نے میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تھی۔ اس فائرنگ میں دو طالب علم جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے تھے' باقی چیختے ہوئے بدحواسی میں پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

موبائل میدان کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ پولیس کے جوانوں نے وین سے کود کر پوزیشن لے لی اور سرخ کار پر فائرنگ کھول دیا۔ دہشت گرد اب کار کی آڑ سے پولیس پر فائرنگ کرنے لگے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے گلی کے راستے فرار ہو رہے تھے۔

ایک دہشت گرد فرار ہوتے ہوئے ایک کانسٹیبل کی گولی کا نشانہ بن گیا' وہ چیخ کر گرا۔ شجاعت رائفل لے کر سرخ کار کی طرف دوڑا۔ گلی میں دوڑتے ہوئے دہشت گردوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ شجاعت نے کار کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ دہشت گرد اب بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ شجاعت نے بھی کار کے پیچھے سے فائر کھول دیا ایک دہشت گرد چیخ کر گرا' گولی اس کی ران میں لگی تھی۔ باقی تین دہشت گرد گلی کے دوسری طرف بھاگ نکلے۔ شجاعت کار کے پیچھے سے اٹھ کر دوڑتا ہوا زخمی دہشت گرد کے قریب پہنچ گیا' جو اپنی گری ہوئی رائفل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شجاعت نے اپنی رائفل کی نالی اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔

"اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا' کھوپڑی اڑا دوں گا۔" شجاعت غرایا۔ انسپکٹر دلاور اور دوسرے پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایک کانسٹیبل وہیں رک گیا اور باقی انسپکٹر دلاور کے ساتھ گلی میں دوڑتے چلے گئے۔

دیر تک گلیوں میں فائرنگ ہوتی رہی۔ وہ تینوں دہشت گرد تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گلیوں میں فرار ہو گئے تھے۔ پولیس والوں نے واپس آ کر میدان کے اردگرد پوزیشن سنبھال لی۔ موبائل پر کنٹرول روم سے وائرلیس پر رابطہ قائم کر کے ایمبولینس بھیجنے کے لئے کہا گیا۔ زخمی دہشت گرد کو باندھ کر موبائل میں ڈال دیا گیا اور انسپکٹر

دلاور اور شجاعت علی دہشت گردوں کے ہاتھوں جاں بحق اور زخمی ہونے والوں کا جائزہ لینے لگے۔

پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے دہشت گرد کے لباس کی تلاشی لے کر شجاعت نے ہر چیز اپنے قبضے میں لے لی اور موبائل میں گھس کر زخمی دہشت گرد کی تلاشی لینے لگا۔

ہلاک ہونے والے دہشت گرد کی عمر انیس بیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے جینز اور کالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گولی اس کے سر پر لگی تھی' جس سے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ زخمی ہونے والا دہشت گرد بھی تقریباً اسی عمر کا تھا' اس نے بھی جینز کی پتلون اور کالے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

آدھے گھنٹے میں دو ایمبولینس گاڑیاں اور پولیس کی دو اور موبائلز پہنچ گئیں۔ جاں بحق ہونے والوں اور زخمیوں کو ایمبولینس میں ڈال کر پولیس کی کڑی نگرانی میں ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اے ایس آئی شاہد اور شجاعت بھی ایمبولینس کے ساتھ جانے والی ایک موبائل میں بیٹھ گئے' جبکہ انسپکٹر دلاور دوسرے عملے کے ساتھ جائے واردات پر رک گیا تھا۔

زخمیوں میں سے دو کی حالت تشویشناک تھی' جنہیں ہسپتال میں داخل کر لیا گیا' جبکہ باقی زخمیوں کو مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا تھا۔ زخمی دہشت گرد کو ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اس کی ٹانگ سے آپریشن کے ذریعے گولی نکالی گئی تھی اور وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ کمرے کے سامنے دو مسلح پولیس والے موجود تھے جبکہ شجاعت' اے ایس آئی شاہد اور میڈیکولیگل آفیسر کمرے کے اندر بیٹھے دہشت گرد کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

دہشت گرد کو رات ساڑھے گیارہ بجے ہوش آ سکا تھا اور وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد بیان دینے کے قابل ہو سکا تھا۔ اس کا نام کاشف تھا اور وہ ایک مقامی کالج کا سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا' وہ کوئی بیان دینے کے بجائے پولیس کو برے نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا۔ اے ایس آئی شاہد نے اسے گرمجوشی دکھانے کی کوشش کی تو شجاعت نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں شاہد!" وہ بولا۔ "تم نے دیکھا تھا ان لوگوں نے کس سنگدلی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے معصوم اور بے گناہ لوگوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ خوشیوں میں کھیلتے ہوئے ان معصوم لڑکوں کو خاک و خون میں لٹا دیا تھا۔ اس کی اپنی عمر ابھی پڑھنے اور کھیلنے کودنے کی ہے لیکن یہ کس مہارت سے آٹومیٹک رائفل چلا رہا تھا' جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کو دہشت گردی کی مکمل تربیت دے کر میدان میں اتارا گیا تھا۔ یہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا' اس کی زبان کھلوانے کے لئے ہمیں بھی خاص طریقہ استعمال کرنا پڑے گا اور وہ طریقہ میں جانتا ہوں۔ اسے آج رات ہسپتال کے اس آرام دہ بستر پر آرام کرنے دو اس کی کہانی کل سنیں گے' اطمینان سے۔"

وہ تھانے واپس آ گئے۔ ہسپتال کے اس کمرے کے گرد سخت پہرہ لگا دیا تھا۔ دو مسلح کانسٹیبل کمرے کے اندر بھی تعینات کر دیئے گئے تھے اور انہیں سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی کو اس کمرے کی طرف آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

تھانے میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد شجاعت گھر پہنچا تو رات کا ایک بجنے والا تھا' اس نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کی بہن سلطانہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی' اس نے بتایا کہ والدہ سائرہ کے گھر رہ گئی ہیں۔

شجاعت علی نے لباس تبدیل کیا۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک سلطانہ سے باتیں کرتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آ کر دیر تک بیٹھا ان دہشت گردوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ نوعمر لڑکے تھے' کالج کے اسٹوڈنٹ تھے لیکن ان کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر رائفلیں تھما دی گئی تھیں اور وہ بڑی بے رحمی سے بے گناہ شہریوں کی زندگیوں سے کھیل رہے تھے' وہ غیر ملکی نہیں تھے' اسی ملک کے باشندے تھے' اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اسی زمین کی مٹی سے جنم لیا تھا اور وہ اس سرزمین کی حفاظت کرنے کے بجائے اس کے سینے پر اس کے فرزندوں کا لہو بہا رہے تھے۔

شجاعت اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب کچھ وہ اپنی مرضی سے نہیں کر رہے تھے' کوئی خفیہ طاقت تھی جو انہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے وہ چہرے بے نقاب کرنے تھے جو ان نوجوانوں کو آگ اور خون کا کھیل کھیلنے پر اکسا رہے تھے۔

وہ رات کو اگرچہ دیر سے سویا تھا لیکن حسب عادت اس کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی' سلطانہ اس سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ راہداری میں قدموں کی آواز سن کر شجاعت علی نے کہا کہ وہ ملازم ہو گا' اس نے ملازم کا نام لے کر آواز دی تو چند سیکنڈ

بعد ہی دروازہ کھل گیا اور سلطانہ اندر داخل ہوئی' اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"ارے بھائی جان!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "رات کو آپ دہشت گردوں کے بارے میں باتیں تو کرتے رہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ............"

"لاؤ اخبار مجھے دو اور تم میرے لئے چائے بنا کر لے آؤ۔" شجاعت علی نے کہتے ہوئے اخبار کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

سلطانہ اسے اخبار دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ شجاعت اخبار دیکھنے لگا پہلے ہی صفحے پر وہ خبر موجود تھی' وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔ انسپکٹر دلاور نے دہشت گردوں سے مقابلے اور ایک دہشت گرد کی گرفتاری کا سارا کریڈٹ اسی کو دیا تھا اور اس کی جرأت اور بہادری کی بے حد تعریف کی تھی۔ پولیس کے دیگر اعلیٰ افسران نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔ اس خبر کے ساتھ دہشت گردوں کے ہاتھوں جاں بحق اور زخمی ہونے والوں اور پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے دہشت گرد کی تصویریں تھیں۔ اس دہشت گرد کی تصویر نہیں تھی' جسے زخمی کر کے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی تصویر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شجاعت علی نے رات کسی اخبار نویس یا فوٹو گرافر کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد سلطانہ چائے کے دو کپ لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک کپ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور دوسرا خود لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اخبار کی اطلاع کے مطابق یہ دہشت گرد بالکل نوعمر لڑکے تھے' حیرت ہے اتنی کم عمر میں ان کے یہ کرتوت .... اب تک نہ جانے کتنے بے گناہوں کو موت کی نیند سلا چکے ہوں گے۔" سلطانہ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کم عمر ہونے کے باوجود یہ لوگ نہایت تربیت یافتہ تھے۔" شجاعت نے کہا۔ "اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پشت پر کوئی بڑی طاقت ہے۔ جس لڑکے کو گرفتار کیا گیا ہے اسے اپنے کئے پر کوئی ندامت یا شرمندگی نہیں' اس کے برعکس وہ پولیس کو برے نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"وہ کون ہے؟" سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دہشت گرد۔" شجاعت نے جواب دیا۔ "دہشت گردوں کا کوئی مذہب اور کوئی

قومیت نہیں ہوتی' وہ محض دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہنستے بستے گھروں کو اجاڑنا اور دہشت پھیلانا ہوتا ہے۔ کسی کی چیخ و پکار ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کسی کا بہتا ہوا خون ان کے دلوں کو متاثر نہیں کرتا۔ ان کا ضمیر مرچکا ہوتا ہے۔ یہ بے حس ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے' لیکن میری ایک بات اور بھی نوٹ کر لو.......... دیکھنا ان کے کتنے ہمدرد پیدا ہو جائیں گے' یہی دہشت گرد جن لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں وہی انہیں بے گناہ اور پولیس کو ظالم اور ان کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"یہی تو ہمارا معاشرتی المیہ ہے۔" سلطانہ نے کہا۔ "لوگ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ اس نوجوان دہشت گرد کے ماں باپ جب اس کی تصویر دیکھیں گے تو وہ کبھی بھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ ان کا بیٹا دہشت گرد تھا' وہ تو یہی کہیں گے کہ وہ کالج کا طالب علم تھا اور بے گناہ تھا۔ پولیس نے اسے جعلی مقابلے میں مار دیا۔ وہ لوگ یہ کبھی نہیں سوچیں گے کہ ان کا بیٹا تعلیم حاصل کرنے جاتا تھا یا دہشت گردی کی تربیت؟ آج کل ماں باپ نے جوان اولاد کو جس طرح آزادی دے رکھی ہے' یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔"

"آج تو تم میری زبان بول رہی ہو۔" شجاعت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے سو فیصد اتفاق ہے۔ آج کل اولاد ماں باپ کے کنٹرول میں نہیں' بلکہ ماں باپ اولاد کے کنٹرول میں ہیں۔"

"اللہ ہی رحم کرے ایسے ماں باپ پر۔" سلطانہ کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"میری بھی یہی دعا ہے۔" شجاعت نے کہا اور اخبار کی دوسری خبریں دیکھنے لگا۔

آٹھ بجے شجاعت تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ اپنی گاڑی اس نے کل ہی ورکشاپ بھجوا دی تھی۔ اس کی آگے پیچھے کی ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور اسے گاڑی جلدی واپس ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اس کی رہائش فیڈرل بی ایریا میں تھی۔ وہ گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا جہاں کچھ ہی دیر بعد اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور جب وہ تھانے پہنچا تو ٹھیک نو بج رہے تھے۔ انسپکٹر دلاور تھانے میں موجود تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی سر!" شجاعت نے انسپکٹر دلاور کا سامنا ہوتے ہی کہا۔ "یہ ساری محنت تو آپ کی تھی' ہم نے تو آپ کی رہنمائی میں' آپ کی

نگرانی میں کارروائی کی تھی اور آپ نے اس کا سارا کریڈٹ میرے کھاتے میں ڈال دیا' یہ تو زیادتی ہے نا سر!"

"میں نے پریس کو وہی بیان دیا ہے جو دینا چاہئے تھا۔" انسپکٹر دلاور نے کہا۔ "اگر تم جرأت نہ کرتے تو وہ دہشت گرد ہمارے ہاتھ نہ آتا۔ ہم تو بہت پیچھے رہ گئے تھے' یہ سو فیصد تمہارا کیس ہے۔"

"تھینک یو سر!" شجاعت نے کہا۔

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ دو آدمی تھانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے برآمدے میں کھڑے ہوئے سنتری سے کوئی بات کی اور پھر ایس ایچ او کے دفتر میں آ گئے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا نوجوان جس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ دونوں باپ بیٹا تھے اور ان کا لباس بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ ادھیڑ عمر آدمی کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا۔

"جی فرمایئے کیسے آنا ہوا؟" انسپکٹر دلاور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ خبر.......... اور یہ تصویر..........؟" ادھیڑ عمر آدمی نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہلاک شدہ دہشت گرد کی تصویر کے گرد سرخ بال پین سے دائرہ لگا ہوا تھا۔

"آپ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں' اس کے بارے میں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہ .... یہ میرا بیٹا ہے.........." اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ لوگوں نے کس جرم میں اسے گولی کا نشانہ بنا دیا' یہ کیسے کہہ دیا کہ وہ دہشت گرد تھا؟ وہ تو کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔"

"آپ نے اس کی لاش دیکھی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں' پہلے ہم ہسپتال گئے تھے۔ میڈیکولیگل آفیسر نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میں اپنی آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" اس مرتبہ شجاعت علی نے پوچھا۔

"میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ٹائپسٹ ہوں۔ میرا نام عبدالہادی ہے اور یہ میرا بڑا بیٹا عبدالرحمٰن ایک کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی میں کام کرتا ہے۔" اس شخص نے

بتایا۔

"آپ کے اس بیٹے کا نام کیا ہے؟" شجاعت نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"ریحان۔" عبدالہادی نے جواب دیا۔

"آپ کے کہنے کے مطابق کالج کا اسٹوڈنٹ تھا لیکن آپ نے کبھی اس کی سرگرمیوں کے بارے میں باز پرس کی تھی' کبھی اس سے یہ پوچھا تھا کہ اس کی جیبوں میں بھرے ہوئے ہزاروں روپے کے نوٹ کہاں سے آتے ہیں؟ یا پھر آپ اسے جیب خرچ کے لئے لمبی رقمیں دیا کرتے تھے۔" شجاعت نے کہا۔

"نہیں' میں نے اسے کبھی بڑی رقم نہیں دی۔ دس بیس روپے زیادہ سے زیادہ پچاس روپے۔ اس کے پاس اس سے زیادہ رقم نہیں ہو سکتی۔" عبدالہادی نے جواب دیا۔

"ایک منٹ۔" شجاعت کہتا ہوا ہیڈ محرر کے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک پوٹلی لئے ہوئے واپس آ گیا۔ اس نے پوٹلی میز پر رکھ کر کھول دی۔ "یہ چیزیں آپ کے بیٹے کی جیبوں سے برآمد ہوئی ہیں۔ یہ ویلٹ جس میں ہزار ہزار روپے کے سات نوٹ اور چند نوٹ سو روپے والے بھی ہیں۔ سونے کی یہ چین جو کم از کم دو تولے کی ضرور ہو گی۔ گولڈلیف کے سگریٹ ویلٹ ہی سے برآمد ہونے والی یہ تصویر.........

یہ تصویر دیکھ کر بتائیں کہ یہ آپ ہی کے بیٹے کی ہے نا؟ اور پھر یہ بتائیں کہ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا' آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی کالج سے آنے کے بعد وہ اپنا وقت کہاں گزارتا تھا' وہ کالج جاتا بھی تھا یا نہیں!"

"نہیں .... یہ جھوٹ ہے .... ریحان دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔" وہ شخص چیخا۔

"آپ بلاک ٹو میں چلے جائیے اور وہاں جا کر پوچھئے کہ آپ کا بیٹا کون تھا' وہ کس طرح میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔" شجاعت نے کہا۔ "آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں' وہ بہت معصوم تھا' بے گناہ تھا۔ آپ اس کی صفائی پیش کرنے آئے ہیں' اس لئے کہ وہ آپ کا بیٹا تھا۔ ان گھروں سے جا کر پوچھئے جنہیں وہ اجاڑ چکا تھا۔ آپ کا وہ معصوم اور بے گناہ بیٹا موت کا فرشتہ تھا۔ اب آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں' اگر آپ باعزت آدمی ہیں تو آپ کو تو یہ چاہئے تھا کہ اس کی شناخت ہی سے انکار

کر دیتے۔ اسے اپنا بیٹا ہی تسلیم نہ کرتے جو دہشت گرد بن کر نہ صرف بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا' بلکہ قومی سلامتی کے لئے بھی بہت بڑا خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس نے آپ کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ آپ لوگوں کے سامنے کس طرح کہہ سکیں گے کہ وہ دہشت گرد جس نے کل رات میدان میں کھیلتے ہوئے معصوم لڑکوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا' وہ آپ کا بیٹا تھا۔"

"میں اپنے بیٹے کی لاش لینے آیا ہوں۔" عبدالہادی نے روتے ہوئے کہا۔ "ہماری لاعلمی میں اس نے جو کچھ بھی کیا' ہمیں ذلیل و رسوا کیا' کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا لیکن کیا یہ سزا ہمارے لئے کافی نہیں' تھا تو وہ میرا بیٹا کیا اس کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں نہیں اتار سکوں گا؟"

"تو آپ اپنے بیٹے کی لاش لینے آئے ہیں؟" شجاعت نے اسے گھورا۔ "ایس ایچ او صاحب بیٹھے ہیں آپ ان سے بات کیجئے۔"

"آپ لاش کو تحویل میں لینے کے لئے درخواست لکھئے جس میں دہشت گرد سے اپنا رشتہ واضح طور پر تحریر کیجئے اور اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی لگا کر موجودہ رہائشی پتہ بھی لکھئے۔ یہ درخواست اوپر بھیجی جائے گی اور اس کے بعد ہی فیصلہ ہو گا۔" ایس ایچ او نے کہا۔

عبدالہادی اور اس کا بیٹا وہاں سے اٹھ کر محرر والے کمرے میں آ گئے اور محرر سے کاغذ اور بال پین لے کر درخواست لکھنے لگے۔

سب انسپکٹر شجاعت بلاوا آنے پر ڈی ایس پی کے دفتر چلا گیا۔

☆======☆======☆

"آؤ شجاعت بیٹھو۔" ڈی ایس پی نے سر کے اشارے سے اس کے سلیوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو سر!" شجاعت علی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ایس پی صاحب تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ انہوں نے ڈی آئی جی صاحب سے اس پولیس پارٹی میں شامل تمام پولیس اہلکاروں اور خصوصاً تمہارے لئے انعام اور اسناد کی سفارش کی ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"تھینک یو سر!" شجاعت نے کہا۔ "یہ سب کچھ آپ کی رہنمائی کا نتیجہ ہے سر۔

آپ جیسے مہربان افسران ہوں تو ماتحت اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"

"میں نے تمہیں یہ پوچھنے کے لئے بلایا تھا کہ جس دہشت گرد کو گرفتار کیا گیا ہے اس سے انکوائری شروع کی یا نہیں؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں سر!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "میرا ارادہ ہے کہ آج رات اسے ہسپتال سے تھانے منتقل کر دیا جائے گا اور پھر اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "انسپکٹر دلاور نے یہ کیس تمہارے سپرد کیا ہے' اس کیس کو تم نے ہی ہینڈل کرنا ہے لیکن اپنے اطراف سے ہوشیار رہنا' اس کے مفرور ہو جانے والے ساتھی کوئی اور مسئلہ کھڑا کر سکتے ہیں۔"

"میں خیال رکھوں گا سر!" شجاعت علی نے جواب دیا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

شجاعت علی نے اٹھ کر سلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

اس رات زخمی دہشت گرد کاشف کو ہسپتال سے تھانے لے آیا گیا۔ سب انسپکٹر شجاعت جب انٹیروگیشن سیل میں داخل ہوا تو ملزم کاشف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے زخمی ٹانگ سامنے فرش پر پھیلا رکھی تھی۔ سب انسپکٹر نے دو کرسیاں منگوا لیں۔ ایک پر کاشف کو بٹھا دیا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ ملزم کاشف الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرا تفتیش کا طریقہ کار ذرا مختلف ہے اور میں خود بھی دوسرے پولیس افسروں سے قدرے مختلف واقع ہوا ہوں۔" شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ پیار' محبت اور افہام و تفہیم سے بات ہو جائے لیکن اگر اس طرح کام نہ بنے تو مجھے زبان کھلوانے کے ایسے ایسے طریقے آتے ہیں کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم میری نظروں میں کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہو لیکن میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ اب تک کتنی وارداتیں کر چکے ہو اور یہ سب کچھ کس کے اشارے پر کیا جا رہا ہے؟ تمہارے مفرور ساتھی کون تھے؟ ان کے نام اور پتے بتاؤ۔"

"میں بھی دوسرے لوگوں سے ذرا مختلف واقع ہوا ہوں۔" دہشت گرد نے جواب

دیا۔ "تم تو کیا تمہارے فرشتے بھی میری زبان نہیں کھلوا سکیں گے۔"

"دیکھو کاشف!" شجاعت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی نوجوان ہو اور کالج میں زیر تعلیم بھی ہو۔ میں جانتا ہوں تم نے جو کچھ بھی کیا ہے کسی لالچ میں آ کر کیا ہے لیکن ابھی ساری زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے' یہ زندگی دہشت گردی اور ڈاکہ زنی میں نہیں گزاری جا سکتی۔ باعزت لوگوں کی طرح سینہ تان کر جینا سیکھو کہ کوئی تمہاری طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ بھلا یہ بھی کوئی جینا ہوا کہ ساری زندگی منہ چھپاتے رہو کبھی آزاد فضا میں سانس نہ لے سکو۔ ذہن پر ہر لمحہ یہ خوف سوار ہو کہ پکڑے جاؤ گے' تمہارے باپ نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں سوچا ہو گا' وہ تمہیں انجینئر' ڈاکٹر یا کوئی بڑا آفیسر بنانا چاہتے ہوں گے' تا کہ وہ فخر سے لوگوں کو بتا سکیں کہ ان کا بیٹا بڑا آدمی ہے لیکن جب انہیں پتہ چلے گا کہ ان کا بیٹا دہشت گرد ہے تو کیا وہ کسی کو منہ دکھا سکیں گے؟ کیا ان کی ساری عزت خاک میں نہیں مل جائے گی؟ میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ پولیس والوں کے پاس بڑے طریقے ہوتے ہیں' وہ کسی راہ چلتے شریف آدمی کو پکڑ کر قاتل ثابت کر سکتے ہیں اور قاتل کو بے گناہ ثابت کرنا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے' اگر تم قانون سے تعاون کرو تو قانون تمہاری مدد کرے گا اور تم ایک باعزت زندگی گزار سکو گے۔ کسی کی جان لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کے لئے جیا جائے۔ اپنا خون دے کر کسی اور کی زندگی بچائی جائے۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم اپنے لئے کون سا راستہ منتخب کرتے ہو۔"

"تقریر اچھی کر لیتے ہو۔" دہشت گرد کاشف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پانچ منٹ بعد آؤں گا۔" شجاعت علی کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

باہر کھڑے ہوئے سنتری نے دروازہ بند کر دیا اور رائفل سنبھال کر مستعد کھڑا ہو گیا۔

شجاعت' ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں اے ایس آئی شاہد بھی بیٹھا ہوا تھا اور سادہ لباس میں دو آدمی اور بھی تھے۔ ان کا تعلق سی آئی اے سے تھا' چائے کا دور چل رہا تھا۔ شجاعت علی جیسے ہی کرسی پر بیٹھا ایک کانسٹیبل نے اس کے سامنے بھی

چائے کا کپ لا کر رکھ دیا۔ وہ لوگ اس وقت آج دن میں ایک بینک کو لوٹے جانے کی واردات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ شجاعت بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد شجاعت دوبارہ انیروگیشن روم میں آگیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ اے ایس آئی شاہد بھی تھا۔

"ہاں تو مسٹر کاشف' تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" شجاعت نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔" کاشف نے جواب دیا۔ "میں اپنے دوستوں سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"دوستوں سے غداری نہیں کر سکتے لیکن اس سرزمین سے غداری کر سکتے ہو جس نے تمہیں جنم دیا' جہاں تم پل کر جوان ہوئے۔" شجاعت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں صرف ایک منٹ اور دے رہا ہوں۔"

وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ سیکنڈ والی سوئی نے جیسے ہی اپنی ایک گروش پوری کی وہ پھر کاشف کی طرف دیکھنے لگا جس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔

"اب تک کتنی وارداتیں کر چکے ہو؟ یہ سب کچھ کس کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور تمہارے مفرور ساتھی کون تھے؟" شجاعت نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" کاشف نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

شجاعت ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے کاشف کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اچانک ہی اس کا گھونسہ کاشف کے جبڑے پر لگا۔ کاشف کراہتا ہوا کرسی سمیت الٹ گیا۔ شجاعت نے کرسی پکڑ کر ایک طرف پھینک دی۔

"میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا' مگر تم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تم کتنے سخت جان ہو اور کتنی دیر تک اپنی زبان بند رکھتے ہو۔ اب تم کسی ہمدردی کے مستحق نہیں رہے۔"

شجاعت نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ کاشف ہر ٹھوکر پر بلبلا اٹھتا۔

"ان لوگوں کی تکلیف کا احساس کرو جنہیں تم گولیوں سے چھلنی کرتے رہے ہو' یہ تکلیف تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" شجاعت نے غراتے ہوئے اس کی پسلیوں پر ایک اور ٹھوکر ماری۔ اس کے چہرے پر درندگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"شاہد۔" شجاعت علی شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "رحمت کو بلاؤ' میں دیکھتا ہوں یہ کتنی دیر تک اپنی زبان بند رکھتا ہے۔"

شاہد نے دروازے کے قریب پہنچ کر رحمت کو آواز دی' رحمت اندر آگیا۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا' اس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا اور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔

"رحمت! اس پر ذرا ترکیب نمبر دس استعمال کرنا۔" شجاعت نے کہا۔

ترکیب نمبر دس شجاعت کی ایک خاص ٹیکنیک تھی جو اس جیسے مجرموں پر استعمال کی جاتی تھی۔ تمام پولیس والے شجاعت کی اس ٹیکنیک سے واقف تھے۔ اے ایس آئی شاہد نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کاشف کا ایک پیر گرفت میں لے لیا اور رحمت اس کا دوسرا پیر پکڑ کر مخالف سمت میں کھینچنے لگا۔ مارشل آرٹس میں اس ٹیکنیک کو اسٹرنگ کہا جاتا تھا لیکن شجاعت علی نے اسے ترکیب نمبر دس کا نام دیا تھا۔ جیسے جیسے کاشف کی دونوں ٹانگیں مخالف سمتوں میں پھیل رہی تھیں اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے' پھر چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہونے لگے' اس نے جبڑے بھینچ لئے۔

شاہد اور رحمت اس کی ٹانگیں چیرتے گئے۔ کاشف اب چیخنے لگا' شجاعت علی نے ان دونوں کو اشارہ کیا انہوں نے کاشف کی ٹانگیں وہیں روک لیں۔

"اب کیا خیال ہے' ترکیب نمبر دس ابھی آدھے راستے میں ہے۔ اسے آخری حد تک پہنچا دیا گیا تو نہ صرف تم اپنی ٹانگوں سے زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو جاؤ گے بلکہ تم اگلی نسل پیدا کرنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔" شجاعت علی نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" کاشف چیخا۔

"شجاعت علی اس کی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں پیر کاشف کی رانوں کے جوڑ پر تھے' کاشف ایک بار پھر چیخا۔

"نہیں .... تم مجھے مار ڈالو .... میرے منہ سے صرف یہی ایک لفظ نکلے گا۔"

شجاعت علی اس کی ٹانگوں پر کھڑا رہا اور شاہد اور رحمت کو اشارہ کیا وہ اس کی ٹانگوں کو مزید کھینچنے لگے کاشف ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا رہا تھا۔

"مجھے تم پر کوئی رحم نہیں آئے گا۔" شجاعت اس کی ٹانگوں سے اتر گیا۔ "میں

تمہارے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا۔"

اس کے اشارے پر شاہد اور رحمت کاشف کی ٹانگوں کو مزید کھینچتے چلے گئے۔ کاشف کے حلق سے نکلنے والی چیخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھیں۔

ٹھیک اسی لمحے تھانے کے باہر سے زبردست فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں' تھانے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ شجاعت اور اس کے ساتھی کاشف کو چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگے۔ باہر سے تھانے پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ تھانے میں موجود پولیس اہلکاروں نے ہتھیار سنبھال لئے اور حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔

وہ چھ آدمیوں پر مشتمل دہشت گردوں کی پارٹی تھی' جنہوں نے اپنے ساتھی دہشت گرد کاشف کو چھڑانے کے لئے تھانے پر حملہ کیا تھا............ ان کی اندھا دھند فائرنگ سے ایک کانسٹیبل جاں بحق ہو چکا تھا اور ایک زخمی ہوا تھا۔ شجاعت نے بھی ایک آٹومیٹک رائفل سنبھال لی اور دیواروں کی آڑ میں دہشت گردوں پر فائرنگ کرنے لگا۔

دہشت گرد تھانے کے سامنے مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھالے فائرنگ کر رہے تھے۔ شجاعت اے ایس آئی شاہد کو اشارہ کرتا ہوا تھانے والی عمارت کی پچھلی طرف دوڑا۔ یہ تھانہ چار سو گز پر مشتمل کارنر کے ایک بنگلے میں قائم تھا' چھت پر جانے کا زینہ پچھلی طرف تھا۔

"تم اوپر جاؤ۔" اس نے شاہد کو اشارہ کیا۔ "میں دیوار پھاند کر گلی میں نکلتا ہوں۔"

شاہد چھت کی طرف دوڑ گیا اور شجاعت نے عقبی چاردیواری پر چڑھ کر گلی میں چھلانگ لگا دی۔ اے ایس آئی شاہد چھت پر پہنچ کر فائرنگ کرنے لگا۔ شجاعت گلی میں دوڑتا ہوا کارنر والی دیوار کی آڑ سے دہشت گردوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ اس نے ایک دہشت گرد کو کوئی چیز تھانے کی دیوار کی طرف اچھالتے ہوئے دیکھا۔ وہ دستی بم تھا جو دیوار کے اندر کی طرف گر کر پھٹا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا' اس کے ساتھ ہی اندر سے دو چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔

دہشت گرد اب بھی بڑی شدید فائرنگ کر رہے تھے۔ اسی لمحے ایک موبائل سائرن بجاتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی۔ دہشت گرد چند گز آگے کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف دوڑے............ سب سے پیچھے والا دہشت گرد چھت پر سے اے ایس آئی شاہد کی

چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن کر چیختا ہوا گرا۔ پانچ دہشت گرد کار میں گھس گئے تھے۔ ایک ساتھی پہلے ہی سے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ انجن اسٹارٹ تھا ان کے بیٹھتے ہی کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ زخمی ہونے والا دہشت گرد چیختا ہوا کار کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ شجاعت فائرنگ کرتا ہوا آگے دوڑا' اسی کی ایک گولی کار کی طرف دوڑتے ہوئے دہشت گرد کی پشت پر لگی۔ اسی لمحے دوڑتی ہوئی کار سے بھی آٹومیٹک رائفل سے اس پر فائرنگ کی گئی' اس کا جسم چھلنی ہو گیا اور وہ سڑک پر گر کر تڑپنے لگا۔ شجاعت دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اور اپنی رائفل کی نالی اس کی کھوپڑی سے لگا دی' لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی' وہ دہشت گرد ختم ہو چکا تھا۔ پولیس موبائل ایک لمحہ کو وہاں رکی............

"کار کا پیچھا کرو............" شجاعت چیخا۔

موبائل حرکت میں آ گئی اور تیزی سے کار کے پیچھے روانہ ہو گئی جو اس دوران کافی دور نکل چکی تھی۔

شجاعت علی دوڑتا ہوا تھانے میں آ گیا۔ اے ایس آئی شاہد بھی چھت سے اتر کر نیچے آ چکا تھا۔ ایک کانسٹیبل جاں بحق ہوا تھا اور دوسرا شدید زخمی ہوا تھا' اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ایس ایچ او انسپکٹر دلاور بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی جو گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد قریبی تھانے سے دو موبائلز پہنچ گئیں۔ اطلاع ملنے پر ڈی ایس پی اور ایس پی صاحب بھی پہنچ گئے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ڈی آئی جی صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے۔ زخمیوں اور لاشوں کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال بھجوا دیا گیا۔

جب تھانے پر حملہ ہوا تھا تو تھانے میں شجاعت اور ایس ایچ او سمیت صرف پانچ آدمی تھے' سی آئی اے کے دو اہلکار کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے چلے گئے تھے۔ دہشت گردوں نے جس طرح حملہ کیا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تھانے کی عمارت اور اس کے اندر موجود ہر جاندار کو ملیامیٹ کر دیں گے لیکن ان پولیس اہلکاروں نے جس طرح ان کا مقابلہ کر کے انہیں راہ فرار اختیار پر مجبور کر دیا تھا' وہ قابل تعریف تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے پولیس کے ان اہلکاروں کی کارکردگی کو بے حد سراہا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد شجاعت ایک بار پھر انٹیروگیشن روم میں داخل ہو رہا تھا۔

دہشت گرد کاشف فرش پر پڑا تھا۔ شجاعت علی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔

"وہ لوگ تمہیں چھڑانے یا ختم کرنے آئے تھے لیکن اپنے ایک ساتھی کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہمارا ایک آدمی بھی جاں بحق ہوا ہے' اب بھی اگر تم نے زبان نہ کھولی تو........" شجاعت نے کہتے ہوئے ہولسٹر میں اڑسا ہوا ریوالور نکال لیا۔

"ب........ بتاتا ہوں۔" کاشف ہکلایا' اس کا چہرہ خوف سے ایک دم پیلا پڑ گیا تھا' اس کی زبان فرفر بولنے لگی اور وہ شجاعت کے ہر سوال کا جواب دیتا چلا گیا۔

انسپکٹر دلاور زخمی بازو کی پٹی کروانے کے بعد ہسپتال سے واپس آ چکا تھا۔ شجاعت جب تھانے سے نکلا تو رات کے دو بج رہے تھے........ قریب ہی ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا جو رات بھر کھلا رہتا تھا اور وہاں سے ٹیکسی وغیرہ مل جاتی تھی۔ اس وقت بھی ایک پیلی ٹیکسی وہاں کھڑی تھی' شجاعت پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ دو نوجوان تاریکی سے نکل کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے ٹیکسی کے پچھلے دونوں طرف کے دروازے کھولے اور شجاعت علی کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول شجاعت کے پہلوؤں میں چبھ رہے تھے۔ ایک نے اس کے ہولسٹر سے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔

"گاڑی چلاؤ۔" ایک نے غرا کر ڈرائیور کو حکم دیا۔ ٹیکسی حرکت میں آ گئی .... شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

☆------☆------☆

جمشید کی عمر اٹھائیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ قد پانچ فٹ آٹھ انچ' ٹھوس جسم' سرخی مائل گھنگریالے بال' جاذب نظر نقوش اور آنکھوں میں چمک .... جس نے اس کی شخصیت کو اور بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ جنس مخالف کے لئے اس میں بڑی کشش تھی۔ اس کے حلقے کا کوئی بھی شخص نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام جمشید ہے۔ کراچی کی زیر زمین دنیا میں اسے پرنس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پچھلے دو تین برسوں کے دوران اس نے کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے تھے کہ اس کا یہ نام بین الاقوامی طور پر بھی متعارف ہو گیا تھا۔ منشیات اور سونے کی اسمگلنگ میں اس نے بڑا نام کمایا تھا۔ ہیروئن کی اسمگلنگ کے سلسلے میں تو اسے ایسے ایسے طریقے معلوم تھے کہ کسٹمز اور نارکوٹکس والے

ناپتے رہ جاتے اور وہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لاکھوں کا مال نکال لے جاتا۔ بعض انٹرنیشنل گروہوں سے بھی اس کا رابطہ تھا۔ دبئی کے ایک گروہ سے تو اس کا مستقل لین دین تھا۔ اس گروہ کا سرغنہ انڈیا کا ایک شخص تھا جو دادا کے نام سے مشہور تھا۔ انڈیا میں دادا کے خلاف کئی مقدمات تھے۔ وہ بمبئی پولیس کو اغوا' قتل' ڈکیتی' منشیات کی اسمگلنگ اور اس قسم کی متعدد وارداتوں میں مطلوب تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بمبئی پولیس نے اس کے ایک اڈے پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہ صرف اس چھاپے میں پولیس کے ہاتھ لگنے سے بچ گیا تھا بلکہ سخت پابندیوں کے باوجود بمبئی سے فرار ہو کر دبئی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ دبئی میں بیٹھا انڈیا میں اپنے گروہ کو کنٹرول کر رہا تھا۔

پرنس سے دادا کی ملاقات چند مہینے پہلے دبئی ہی میں ہوئی تھی۔ دادا کراچی کے کسی ایسے شخص سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اپنا کاروبار استوار کر سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے پرنس کا انتخاب کیا تھا۔ ان میں طے ہوا تھا کہ پرنس اسے ہیروئن اور دیگر منشیات فراہم کرے گا جس کے بدلے وہ پرنس کو سونا اور قیمتی پتھر سپلائی کرے گا۔ اب تک ان میں کئی ڈیلز ہو چکی تھیں۔ ہر مرتبہ معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوا تھا۔ ہر مرتبہ پرنس کو ہیروئن کے بدلے سونا یا ہیرے مل گئے تھے جس سے اس نے لاکھوں روپے کمائے تھے۔

ایک مہینہ پہلے دونوں میں ایک اور معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے تحت پرنس دادا کو دو سو کلو ہیروئن سپلائی کرتا جس کے بدلے میں دادا اسے سونا دیتا۔ معاہدے کے مطابق یہ کام گزشتہ رات مکمل ہونے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق ماہی گیری کی ایک کشتی کراچی کے ویران ساحل پر لنگرانداز ہوتی جس پر سونا لدا ہوتا۔ دادا کے آدمی سونا پرنس کے حوالے کر کے ہیروئن وصول کر لیتے اور کشتی گہرے سمندر کی طرف واپس چلی جاتی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق دادا کے آدمی کل رات ایک بجے ویران ساحل کے مقررہ مقام پر پہنچنے والے تھے لیکن اس سے چند گھنٹے پہلے دبئی سے ایک آدمی نے ٹیلیفون پر یہ سنسنی خیز اطلاع دی کہ دادا کے آدمیوں نے اس کے خلاف ایک بہت ہی خوفناک منصوبہ بنا رکھا ہے۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ دادا کے آدمی اس سے دو سو کلو ہیروئن لے لیتے اور بدلے میں سونا دینے کی بجائے اسے قتل کر کے کشتی پر فرار ہو جاتے۔

یہ اطلاع ملتے ہی پرنس کے چہرے پر درندگی کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ فیئر ڈیل کے اصول پر کاربند تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر اس نے بھی دادا کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصہ پہلے پرنس کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا لیکن اس کے آدمی ایک ایک کر کے مارے گئے تھے۔ صرف اکرم نام کا ایک آدمی بچا تھا۔ گزشتہ رات اس نے اکرم کو ساتھ لے لیا تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ دبلا پتلا چھوٹے قد کا آدمی تھا لیکن لڑنے بھڑنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ پرنس کی ہدایت کے مطابق وہ رات گیارہ بجے ایک کار چرا کر مقررہ جگہ پر پہنچ گیا جہاں پرنس اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔ گروہ کے آدمی ختم ہو جانے کے بعد پرنس نے اپنے طریقہ کار میں کچھ تبدیلی کر لی تھی۔ اب وہ عام طور پر بھاری اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ صرف پستول اور موٹر بائیک کا دو فٹ لمبا کلچ وائر اپنی جیب میں رکھ لیا کرتا تھا۔ جسے وہ ناگہانی صورت حال میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

ساحل پر پہنچ کر انہوں نے کار دور ہی چھوڑ دی اور پیدل چلتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ وہ جھاڑیوں میں چھپ کر دادا کے آدمی کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک ایک بجے ساحل کے قریب سمندر میں ایک کشتی کا ہیولا دکھائی دیا۔ کشتی ساحل سے تقریباً دو سو گز دور تھی۔ پرنس چند لمحے کشتی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ٹارچ سے روشنی کا مخصوص سگنل دیا۔ جواب میں کشتی سے بھی روشنی کا سگنل دیا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک چھوٹی کشتی ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ اس کشتی کو ساحل تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ کشتی میں تین آدمی تھے۔ ایک تو کشتی ہی میں بیٹھا رہا اور دو ساحل پر اتر کر ان کے قریب آ گئے۔ پاس ورڈز کے تبادلے کے بعد ان میں سے ایک نے پرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مال کہاں ہے؟"

"کار میں رکھا ہے۔" پرنس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "سونا لائے ہو؟"

"ظاہر ہے۔ اس کے بغیر ہم اتنا طویل اور خطرناک سفر کر کے یہاں کیوں آتے۔ سونا کشتی میں ہے۔ تم اپنا مال منگواؤ۔ ہم سونا منگوا لیتے ہیں۔"

"نہیں پہلے سونا کشتی سے اتروا کر یہاں منگواؤ۔ تسلی کر لینے کے بعد میں اپنا مال تمہارے حوالے کر دوں گا۔" پرنس نے کہا۔

"اس سے پہلے کئی مرتبہ تم سے ہماری ڈیل ہو چکی ہے۔ تمہارا طرز عمل ایسا تو نہیں تھا۔" اس شخص نے پرنس کو گھورا۔ "بہرحال، تمہارے اطمینان کے لئے ہم کشتی سے سونا اتروا کر یہاں منگوا لیتے ہیں۔ اپنی تسلی کر لینے کے بعد تم مال ہمارے حوالے کر دینا۔" اس شخص نے ٹارچ کا رخ کشتی کی طرف کر کے روشنی کا مخصوص سگنل دیا۔ ان کا تیسرا ساتھی کشتی سے اتر کر ان کی طرف آنے لگا۔ اس نے کندھے پر کچھ لاد رکھا تھا۔ اس دوران پرنس سے گفتگو کرنے والے کا دوسرا ساتھی اپنی جگہ سے ہٹ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو کم از کم اکرم پر قابو پا سکے۔ پرنس نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ وہ ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔

ان کا تیسرا ساتھی قریب پہنچ گیا۔ پرنس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ اس کے کندھے پر لدے ہوئے تھیلے میں سونا نہیں ہو سکتا تھا۔ تھیلا نیچے سے پھولا ہوا تھا اور اس کی ایک نوک اوپر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس نے تھیلا زمین پر رکھ دیا۔ پہلے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر تھیلا کھولنے لگا۔ پرنس پوری طرح تیار تھا۔ دو سو کلو ہیروئن کے بدلے صرف ایک تھیلے میں سونا، وہ گہری نظروں سے تھیلے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھیلے کا منہ کھلتے ہی ان کی نظر آٹومیٹک رائفل کی اس نال پر جم گئی جو تھیلے میں سے جھانک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی رائفل تھیلے میں سے نکالتا، پرنس چیخا۔

"اکرم.......... ہوشیار.........."

اس کے ساتھ ہی اس نے اچھل کر تھیلا کھولنے والے کے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ تھیلا اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ خود پیچھے الٹ گیا۔ پرنس نے پلک جھپکنے کی دیر میں پستول نکال لیا تھا لیکن اسے پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس شخص پر پرنس کا حملہ اگرچہ ان لوگوں کے لئے غیر متوقع تھا لیکن اس کے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے پرنس کے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ پستول پرنس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ دوسری طرف اکرم نے اس شخص پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شخص اکرم سے پہلے ہی پستول نکال چکا تھا۔ اکرم نے جیسے ہی اس پر چھلانگ لگائی اس شخص نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اکرم کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر لگی۔ اکرم چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

پرنس تیزی سے گھوما۔ اس کے ہاتھ اور پیر بیک وقت حرکت میں آئے تھے۔ اس نے اچھلتے ہوئے اکرم کے قاتل کے سینے پر پوری قوت سے لات رسید کر دی اور اس کا گھونسہ دوسرے آدمی کی گردن پر پڑا تھا۔ وہ دونوں بلبلاتے ہوئے پیچھے الٹ گئے۔ ان کا تیسرا ساتھی سنبھلتے ہوئے تھیلے سے کلاشنکوف نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرنس نے اس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کی اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔

پرنس نہتا ہو چکا تھا اور وہ تینوں مسلح تھے۔ اکرم ختم ہو چکا تھا اور پرنس کے خیال میں ان تینوں کا مقابلہ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس صورت حال میں بہادری کا مظاہرہ کر کے خودکشی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو تینوں چند منٹ کے اندر اندر اسے گرفت میں لے لیتے اور جب انہیں معلوم ہوتا کہ اس کی کار میں ہیروئن نہیں ہے تو وہ اسے اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالتے اس لئے اس نے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

وہ سو گز دور گیا ہو گا کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ انہوں نے کلاشنکوف سے اس پر فائرنگ شروع کر دی تھی لیکن پرنس گولیوں کی زد سے محفوظ رہا اور وہ جھاڑیوں میں بھاگتا رہا۔

"موہن! تم کار تلاش کر کے مال کشتی پر پہنچاؤ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے۔ اگر یہ زندہ رہا تو ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے خطرہ بنا رہے گا۔"

پرنس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان کا ایک ساتھی وہیں رہ گیا تھا اور دو اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ پرنس کو یقین تھا کہ وہ واقعی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن کاسینو کی ویران عمارت میں پہنچ کر وہ دونوں اس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

جمشید عرف پرنس گریجویٹ تھا۔ اس کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں صبح کے ناشتے کے بعد دوپہر اور رات کے کھانے کی فکر رہتی ہے اور اگر رات کو پیٹ بھر کھانا کھا لیا جائے تو یہ فکر رہتی تھی کہ صبح ناشتے کا انتظام کہاں سے ہو گا۔ اس کا باپ ایک فیکٹری میں مزدور تھا۔ جمشید خود گریجویشن کر لینے کے باوجود ملازمت کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا کوشش کے باوجود اسے کسی دفتر میں کلرک تک کی نوکری نہیں ملی تھی۔ بیروزگاری کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹرز اور انجینئرز بھی ڈگریاں بغل میں دبائے کسی معمولی سی ملازمت کی تلاش میں دفتروں کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ وہ تو محض

گریجویٹ تھا۔ اسے کون گھاس ڈالتا۔

جمشید کا باپ افضل اگرچہ ایک فیکٹری کا مزدور تھا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو پیٹ پر پتھر باندھ کر بی اے کروایا تھا اور اب یہ ڈگری اسے دربدر کئے ہوئے تھی۔ ابھی ملازمت کی تلاش جاری تھی کہ جمشید کا گھر بجلیوں کی زد پر آ گیا۔

سہراب گوٹھ میں منشیات فروشوں کے خلاف ہونے والی کارروائی کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلا۔ موت کے سوداگر منشیات فروش خونخوار درندوں کی طرح معصوم اور بے گناہ شہریوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ املاک کو نذر آتش کیا گیا اور لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ جمشید کے والد افضل کا جسم بھی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

نوجوان جمشید باپ کے قتل کے بعد اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن کو بچانے کی فکر میں تھا لیکن اس کے سامنے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ حملہ آوروں نے اس کے مکان کو آگ لگا دی۔ خوف و دہشت سے اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی اس کی ماں کے کپڑوں کو آگ لگ چکی تھی۔ اس نے باہر بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی لیکن باہر کھڑے ہوئے وحشیوں نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔ جمشید اپنی بہن کو لے کر جلتے ہوئے مکان کے پچھلے دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہیں عثمانیہ کالونی میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ سہراب گوٹھ کے منشیات کے اڈے نے صرف جمشید ہی کا نہیں کراچی کے اور بھی سینکڑوں گھر اجاڑ ڈالے تھے۔

وہ اس اندوہناک واقعے کے بعد چوتھا دن تھا۔ جمشید اپنی بہن کے ساتھ عثمانیہ کالونی کے جس مکان میں رہ رہا تھا وہاں پولیس نے چھاپہ مارا۔ پولیس والے اس طرح گھر میں گھسے تھے جیسے چنگیز خان کے سپاہی حملہ آور ہوئے ہوں۔ انہوں نے گھر کی ہر چیز الٹ پلٹ کر کے رکھ دی۔ الماریاں کھول کر ان کا سامان پھیلا دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ وہ غریب گھرانہ تھا لیکن ان پولیس والوں کو تھوڑی بہت نقدی اور جو زیورات نظر آئے وہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لئے اور جمشید کو آتشزنی، بلوہ اور نہ جانے کن کن الزامات میں پکڑ کر لے گئے۔ پولیس والوں کے جانے کے بعد اس گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے قانون کے محافظوں نے نہیں ڈاکوؤں اور لٹیروں نے حملہ کیا ہو۔

جمشید چیختا چلاتا رہا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس کا تو اپنا گھر جل کر راکھ ہوا

ہے۔ ماں باپ گولیوں سے چھلنی ہوئے ہیں مگر پولیس والوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے تھانے میں لے جا کر بند کر دیا۔ جمشید پر تشدد کر کے اس سے وہ جرائم قبول کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی جن سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

کئی روز تک تھانے میں جمشید کے ساتھ مار پیٹ ہوتی رہی اور بالآخر اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ پہلی ہی پیشی پر اسے تین ماہ قید کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ وہ بے گناہ تھا۔ اس کا گھر برباد ہو گیا تھا۔ ماں باپ قتل ہو گئے تھے۔ قاتل اور دہشت گرد اب بھی شہر میں دندناتے پھر رہے تھے اور بے گناہوں کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

تین ماہ بعد جمشید جیل سے رہا ہوا تو اس کے تیسرے ہی دن پولیس نے اسے پھر دھر لیا۔ اس مرتبہ اس پر منشیات فروشی اور ناجائز اسلحہ رکھنے کا الزام تھا۔ پولیس نے اس کے قبضے سے دو سو گرام ہیروئن اور ایک پستول بھی برآمد کر لیا تھا۔ اسے ایک بار پھر چھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ اس مرتبہ جیل میں اس کی ملاقات ایسے دو آدمیوں سے ہوئی جو واقعی جرائم پیشہ تھے۔ جیل میں ان کا خوب دبدبہ تھا۔ باہر والوں سے بھی ان کے رابطے قائم تھے اور یہ دونوں جیل میں بھی ہیروئن کی پڑیوں کا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔

"اے لعنت ہے تجھ پر۔" شیرا نامی قیدی نے جمشید سے کہا۔ "کچھ کیا نہیں اور دوسری مرتبہ یہاں آ گیا ہے۔ مرد بن مرد......... کچھ کر کے دکھا۔ اب کے باہر جائے گا نا تو جلات خان سے ضرور مل لینا۔ ناظم آباد میں اس کا اڈہ ہے۔ میرا نام لینا۔ وہ تمہیں ایسے ایسے گُر بتائے گا کہ یہ پولیس والے بھی تمہارے سامنے جھکے رہیں گے۔"

سزا پوری ہونے کے بعد جمشید جیل سے رہا ہوا تو یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ وہ جس خاندان کے ساتھ رہ رہا تھا وہ لوگ وہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ جمشید کی بہن بھی ان کے ساتھ تھی۔ محلے کا کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ جمشید انہیں تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ پولیس نے پھر اسے دھر لیا۔ اس مرتبہ بھی اس پر کچھ ایسے الزامات لگائے گئے تھے کہ جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جمشید دو دن سے تھانے میں بند پولیس والوں سے پٹ رہا تھا۔ پولیس نے اس کی جاں بخشی کے لئے دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر انہیں یہ رقم ادا نہ کی گئی تو اسے قتل کے کیس میں پھنسا دیا جائے گا اور پھر اس رات ایک آدمی

جمشید کو پولیس کے شکنجے سے چھڑا کر لے گیا۔ وہ ناظم آباد کا جلات خان تھا جس نے پولیس کو دس ہزار روپے دے کر جمشید کو چھڑا لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"کیوں اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو تم۔" جلات خان نے اسے سمجھایا۔ "یہ پولیس والے اب زندگی بھر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جرائم کی خانہ پری کے لئے یہ لوگ بار بار تمہیں پکڑتے رہیں گے اور تمہاری زندگی اسی طرح جیل کے چکروں میں ضائع ہو جائے گی۔ کچھ کر کے دکھاؤ۔"

جلات خان منشیات اور اسلحہ کا بیوپاری تھا۔ جمشید نے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کو اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے دیکھا تھا اور پھر جمشید نے بھی کچھ کر کے دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جلات خان کا آلۂ کار بن گیا اور نوجوان نسل کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں ہیروئن کا زہر گھولنے لگا۔ کالج اور یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ اس کے گاہک تھے۔ اس کی پُرکشش شخصیت کے باعث لڑکیاں بھی اس کے جال میں پھنسنے لگیں۔ اس کے گاہکوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس نے آمدنی میں اضافے کے لئے نشے کی عادی دولت مند لڑکیوں کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے زندگی سے صرف ایک سبق سیکھا تھا کہ سب دولت اور طاقت کو سلام کرتے ہیں اور وہ دولت سمیٹ رہا تھا۔ طاقت حاصل کرنے کے لئے' اپنے اس دھندے کے ساتھ اس نے بہن کی تلاش بھی جاری رکھی تھی جس کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

وہ ہیروئن فروخت کرتے ہوئے کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا۔ اس کے قبضے سے ہیروئن بھی ہر مرتبہ برآمد ہوئی تھی لیکن وہ ایک مرتبہ بھی دو تین گھنٹوں سے زیادہ کسی تھانے میں نہیں رہ سکا تھا۔ اس کے پیچھے جلات خان کی طاقت تھی۔ پولیس اُسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے باوجود ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔

شہر کے فیشن ایبل علاقے جمشید کی شکارگاہ تھے۔ وہ کسی ریسٹورنٹ یا کسی پارٹی میں بیٹھ جاتا اور اس کے دولت مند گاہک خود بخود اس کے پاس آتے رہتے۔ اپنی پُرکشش شخصیت اور وجاہت کی وجہ سے وہ اس حلقے میں پرنس کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے تھے۔

اس روز جمشید کو ایک ضروری کام سے لالوکھیت آنا تھا نو بجے رات کو اسے کیفے دلگیر میں ایک آدمی سے ملنا تھا۔ جب وہ ریسٹورنٹ کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو نو بجنے

میں پانچ منٹ تھے۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بجلی کے کھمبے کے قریب ایک عورت پڑی ہوئی تھی۔ میلا کچیلا پھٹا ہوا لباس' دھول مٹی میں اٹے ہوئے بال' پچکے ہوئے رخسار اندر کو دھنسی ہوئی ویران آنکھیں۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو۔ وہ ڈیڈھ کا ڈھانچہ تھی۔ ہاتھوں پیروں اور چہرے پر میل جما ہوا تھا۔ جیسے اس نے مہینوں سے پانی نہ دیکھا ہو۔ شہر میں اس قسم کے مناظر عام طور پر دیکھنے میں آتے تھے۔ ہیروئن کے عادی' جن کے پاس ہیروئن خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے' اسی طرح فٹ پاتھوں پر پڑے بھیک مانگتے۔ پیسے مل جاتے تو نشہ پورا کر لیتے اور پھر اسی طرح فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے۔ جمشید کو ایسے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن اس عورت کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ اس کے قریب رک گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ پر بجلی گری ہو۔ اس نے اس عورت کو پہچان لیا تھا وہ اس کی بہن صائمہ تھی۔

جمشید کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اس نے صائمہ کو اٹھا کر ٹیکسی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ ہسپتال لے گیا۔ تین سال بعد اس کی گمشدہ بہن ملی تھی تو وہ اپنے بھائی کو نہیں پہچان پائی تھی۔ اس کی یادداشت ختم ہو چکی تھی۔

صائمہ کو بچانے کے لئے جمشید پانی کی طرح پیسہ بہا رہا تھا لیکن ایک ہفتے بعد صائمہ مرگئی۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہونے کے بعد جمشید اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش کرنے لگا کہ صائمہ اس حالت کو کیسے پہنچی تھی اور بالآخر وہ ان لوگوں تک پہنچ گیا جن کے گھر سے پولیس نے اسے آخری مرتبہ پکڑا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق پولیس جب اسے پکڑ کر لے گئی تھی تو انہوں نے پولیس کے خوف سے مکان بدل لیا تھا مگر پولیس نے انہیں تلاش کر لیا اور جب جمشید جیل سے رہا ہو کر کچھ عرصے کے لئے لاپتہ ہو گیا تو پولیس اس کا پتہ معلوم کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالنے لگی۔ پہلے ان کے بیٹے اور صاحب خانہ کو تھانے میں لے جا کر ان پر تشدد کیا گیا پھر اس کو ادھ موا کر کے چھوڑ دیا گیا۔ گھر آنے کے تین دن بعد وہ لڑکا مر گیا اور پھر ایک روز پولیس صائمہ کو پکڑ کر لے گئی۔ اسے دو دن تھانے میں رکھا گیا۔ اس دوران اس کے ساتھ زیادتی کی جاتی رہی اور جب صائمہ کو چھوڑا گیا تو وہ اپنے حواس کھو چکی تھی۔ وہ بار بار گھر سے نکل

جاتی۔ وہ اسے پکڑ کر لاتے لیکن وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی پھر بھاگ جاتی۔ آخری مرتبہ جب وہ گھر سے نکلی تو اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔

جمشید کے سینے میں انتقام کا لاوا کھولنے لگا۔ اسے ایک شریف انسان سے مجرم بنانے میں پولیس کا ہاتھ تھا اس کی بہن کی بربادی اور موت بھی پولیس کی زیادتیوں کا نتیجہ تھی۔ جن لوگوں کو عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ بنایا گیا تھا وہی لٹیرے بن گئے تھے۔ وہ عوام کے دشمن اور جرائم پیشہ افراد کے سرپرست بن گئے تھے۔

جمشید اس خطرناک راستے پر آگے بڑھتا رہا۔ اگر وہ واپس بھی آنا چاہتا تو نہیں آسکتا تھا۔ انہی دنوں جلات خان کا بھتے کے مسئلے پر پولیس سے جھگڑا ہو گیا۔ پولیس اور جلات خان میں ٹھن گئی اور بالآخر پولیس نے جلات خان کو سڑک پر گھیر کر گولیوں سے بھون ڈالا۔

جمشید کچھ عرصہ کے لئے زیر زمین چلا گیا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ وہی پولیس والے جنہوں نے جلات خان کو خطرناک اسمگلر قرار دے کر گولیوں سے بھون ڈالا تھا جمشید کے سرپرست بن گئے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس دن پولیس اس سے ناراض ہو گی اس کا انجام بھی جلات خان جیسا ہی ہو گا۔

اب جمشید نے اپنا گروہ بنا لیا تھا۔ اسے پولیس کے بعض اعلیٰ افسروں کی سرپرستی حاصل تھی اور وہ انہیں ہر مہینے لاکھوں روپے دیتا تھا۔ جلات خان کی زندگی میں جمشید کے کچھ ایسے لوگوں سے رابطے ہو گئے تھے جو ہیروئن کی اسمگلنگ کے سلسلے میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے جمشید کا نام بھی بین الاقوامی ڈرگ مافیا میں شہرت اختیار کر گیا لیکن اس کے اصل نام سے کوئی واقف نہیں تھا۔ لوگ اسے پرنس کے نام سے جانتے تھے۔ شہر میں اسلحہ اور منشیات فروشوں کے کئی گروہ سرگرم تھے۔ جمشید کی ایک گروہ سے ٹھن گئی۔ اس کے کئی آدمی مارے گئے۔ صرف اکرم بچا تھا اور اس رات وہ بھی ویران ساحل پر دادا کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

جمشید ٹانگ کے زخم پر پٹی باندھنے کے بعد سویا تو اسے دنیا کا ہوش نہیں رہا تھا۔ دوپہر کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ اس وقت بوڑھا ملازم کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا دروازے کی کال بیل بج اٹھی۔

"دیکھو۔ کون ہے؟" جمشید نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بوڑھا باہر چلا گیا۔ دو منٹ بعد راہداری میں ہلکے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ شبینہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

☆======☆======☆

ٹیکسی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی شاہراہ فیصل پر آ گئی۔ شجاعت علی ان دونوں نوجوانوں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ ان دونوں کے پستول شجاعت علی کے پہلوؤں کو چھو رہے تھے۔ اس وقت اگرچہ رات کے ڈھائی بج رہے تھے لیکن شارع فیصل پر متعدد گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ایئرپورٹ ہونے کی وجہ سے اس سڑک پر رات بھر ٹریفک کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔

ٹیکسی اسٹار گیٹ سے ابھی دور ہی تھی کہ سامنے پولیس کی ایک موبائل کھڑی نظر آئی۔ ایک پولیس والا سڑک کے بیچ میں کھڑا ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"موبائل کے قریب گاڑی روک لینا۔" شجاعت علی کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے ڈرائیور کو مخاطب کیا اور پھر شجاعت علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ پولیس والے یقیناً تمہیں جانتے ہوں گے۔ ہماری چیکنگ نہیں ہونی چاہئے اور اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے یا کوئی خفیہ اشارہ کرنے کی کوشش کی تو اپنی جان کی پروا بغرکئے بغیر تمہیں گولی مار دیں گے۔"

ٹیکسی کی رفتار کم ہونے لگی اور بالآخر وہ موبائل کے قریب رک گئی۔ دو پولیس والے رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ پولیس پارٹی کا انچارج ایک اے ایس آئی تھا۔ وہ چند مہینے شجاعت علی کی ماتحتی میں بھی رہ چکا تھا۔ اس نے ٹیکسی میں جھانک کر دیکھا تو شجاعت علی کو دیکھتے ہی چونک سا گیا۔

"سر آپ؟" وہ بولا۔ "اس وقت کہاں............"

"ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔" شجاعت علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ دائیں طرف والے نوجوان کی جیب میں رکھے ہوئے پستول کی نال اس کے پہلو کو چھو رہی تھی۔

"سر، اگر ہماری ضرورت ہو تو............"

"نہیں۔" شجاعت علی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "ذاتی کام ہے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں' چلو ڈرائیور۔" اس نے آخری الفاظ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

شجاعت علی چاہتا تو اس وقت بڑی آسانی سے اے ایس آئی کو اشارہ کر سکتا تھا۔ ٹیکسی کے دونوں طرف پولیس والے رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ ظاہر ہے اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو بھی اپنی زندگی پیاری تھی۔ وہ اسے شوٹ کر کے خود اپنی جان کبھی نہ گنواتے لیکن سب انسپکٹر شجاعت علی تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے اغوا کیوں کیا گیا ہے اور وہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔

"عقل مند ہو۔" بائیں طرف والے نوجوان نے کہا۔ اس وقت ٹیکسی پولیس کی موبائل سے کافی آگے نکل چکی تھی۔

"مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔" شجاعت نے کہا۔ "لیکن تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"تھوڑی دیر بعد پتہ چل جائے گا۔" اس نوجوان نے جواب دیا۔ "اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو طارق۔"

دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے جیب سے رومال نکال کر شجاعت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ٹیکسی کچھ دور جانے کے بعد دائیں طرف مڑ کر ریلوے لائن عبور کر گئی۔ یہ جگہ عام طور پر چھوٹا پھاٹک کے نام سے مشہور تھی۔

"یہاں گاڑی روک لو........" بائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے ڈرائیور کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ٹیکسی رک گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے مکان تھے لیکن ریلوے لائن کے قریب جہاں ٹیکسی رکی تھی وہاں ویرانہ تھا۔ "نیچے اترو۔" اس نوجوان نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم تمہیں زندہ چھوڑ رہے ہیں۔" اس نوجوان نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ ٹیکسی کو حرکت میں لے آیا۔

ڈرائیور نے ریلوے لائن کی طرف دوڑ لگا دی۔ پچھلی سیٹ پر شجاعت کے ساتھ اب ایک نوجوان رہ گیا تھا۔ اس نے پستول کی نال اس کے پہلو سے لگا رکھی تھی۔ ٹیکسی کئی موڑ گھومتی ہوئی بالآخر ایک بنگلہ نما مکان کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر

بیٹھے ہوئے نوجوان نے ہارن بجانے کی بجائے ہیڈ لائٹس کو تین مرتبہ آن آف کیا۔ گیٹ کھل گیا اور وہ ٹیکسی کو اندر لیتا چلا گیا۔ ٹیکسی رکتے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے دروازہ کھولا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے شجاعت علی کا بازو پکڑا اور اسے نیچے اتارنے لگا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان بھی نیچے اتر آیا۔ گیٹ کھولنے والا بھی گیٹ بند کر کے ان کے قریب آگیا تھا اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔

وہ تینوں اسے اندر لے آئے۔ ایک جگہ سیڑھیاں اترنے سے شجاعت کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی تہہ خانے میں لایا گیا تھا اور جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ تہہ خانہ ہی تھا بلکہ اسے عقوبت گاہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ دیواروں کے ساتھ آہنی کڑے اور لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ اس تہہ خانے میں کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو اذیت رسانی میں استعمال ہوتی تھیں۔

شجاعت علی کا سروس ریوالور تو ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ ایک آدمی اس پر کلاشنکوف تانے کھڑا رہا۔ دوسرا اس کی تلاشی لینے لگا لیکن اس کی جیبوں میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ اس کا پولیس کارڈ اور پیسے وغیرہ انہوں نے اس کی جیبوں ہی میں رہنے دیئے تھے۔

شجاعت علی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس کے ہاتھ آہنی کڑوں میں جکڑ دیئے گئے۔ اب پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے ہلکے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کوئی دہشت گردوں کا منظم گروہ تھا۔

"بہت دبدبہ ہے تمہارا۔" اس نوجوان نے شجاعت کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا جسے راستے میں طارق کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ "تم تو اپنے افسروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ بڑے بڑے مجرم تمہارے نام سے کانپتے ہیں لیکن دیکھا تم نے؟ ہم تمہیں کس آسانی سے یہاں لے آئے ہیں۔"

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

طارق نے کلاشنکوف والے کو اشارہ کیا۔ وہ اوپر سے جا کر موبائل ٹیلیفون لے آیا۔

"تم نے ہمارے ایک ساتھی کو پکڑ رکھا ہے۔" طارق نے کہا۔ "تمہاری وجہ سے

ہمارے جو ساتھی مارے جا چکے ہیں انہیں تو ہم بھول جائیں گے لیکن جو زندہ تمہارے قبضے میں ہے اسے نہیں بھول سکتے۔ اپنے تھانے کو فون کرو اور انہیں ہدایت دو کہ کاشف کو فوری طور پر چھوڑ دیا جائے۔"

"اوہ!" شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تو تھانہ پر حملہ تم لوگوں نے کیا تھا لیکن تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ پولیس ابھی بے بس نہیں ہوئی۔"

"بے بس تو ہم بھی نہیں ہیں۔" طارق نے کہا۔ "اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اتنے زبردست ہنگامے کے باوجود ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔ تمہارا ایک ہاتھ کھول دیا جائے گا۔ میں تمہیں تھانے کا نمبر ملا کر دے رہا ہوں انچارج سے کہو کہ کاشف کو فوری طور پر چھوڑ دیا جائے بصورت دیگر تمہاری لاش تھانے بھیج دی جائے گی۔"

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔" شجاعت علی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"انکار کا مطلب سمجھتے ہو؟" طارق نے اسے گھورا۔

"مجھے قتل کر دو گے۔ اس سے زیادہ اور کیا کرو گے۔" شجاعت علی نے کہا۔

"نہیں۔" طارق نے جواب دیا۔ "ہم تمہیں زندہ رکھیں گے اور اس طرح زندہ رکھیں گے کہ تم مرنے کی دعائیں مانگو گے اور تمہیں موت نہیں آئے گی۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے صرف ایک منٹ دے سکتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"ایک منٹ کی مہلت کی بھی ضرورت نہیں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "جو کچھ کرنا چاہتے ہو فوراً شروع ہو جاؤ۔"

طارق نے موبائل ٹیلی فون اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا اور ٹھیک ایک منٹ بعد اس نے شجاعت علی کے جبڑے پر پہلا گھونسہ رسید کر دیا۔ شجاعت علی کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اس کا سر پیچھے دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔

"تمہاری آواز اس تہہ خانے سے باہر نہیں جائے گی۔" طارق غرایا۔ "جتنا چیخنا چاہو چیخ لو۔" اس نے شجاعت علی پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ کوئی گھونسہ شجاعت علی کے منہ پر پڑتا کوئی سینے پر اور کوئی پیٹ پر۔ شجاعت علی اب واقعی چیخ رہا تھا۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔

"میں تمہیں ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔" طارق ہاتھ روک کر غرایا۔

"نہیں۔" شجاعت علی چیخا۔

"میں دیکھتا ہوں تم کب تک اپنی ضد پر قائم رہتے ہو۔" طارق نے کہتے ہوئے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

اس نے آہنی کڑوں سے شجاعت علی کے ہاتھ کھول دیئے۔ شجاعت علی لڑکھڑا کر اوندھے منہ فرش پر گرا۔ دو آدمی فوراً ہی اس کے اوپر چڑھ گئے اور اس طرح کودنے لگے جیسے بھنگڑا ڈال رہے ہوں اور پھر اس کے جسم پر زور زور سے ٹھوکریں مارنے لگے۔

"ہمارے آدمی کو چھوڑنے کو تیار ہو یا نہیں؟" طارق غرایا۔

"نن .... نہیں۔" شجاعت علی چیخا۔

طارق کے اشارے پر ان دونوں آدمیوں نے شجاعت علی کو گرفت میں لے لیا۔ طارق نے تہہ خانے کے ایک طرف میز پر پڑا ہوا پلاس اٹھا لیا اور شجاعت علی کے قریب بیٹھ گیا۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ طارق نے شجاعت علی کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن پلاس کی گرفت میں لے لیا۔ دوسرے آدمی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ طارق پلاس کو جھٹکے دینے لگا۔

شجاعت علی چیخ رہا تھا لیکن طارق کے چہرے پر درندگی تھی۔ اس کی عمر اگرچہ بائیس تیئس سال تھی لیکن وہ بے حد سنگدل اور سفاک انسان ثابت ہوا تھا۔ وہ شجاعت علی کی چیخوں کی پروا کئے بغیر پلاس کو زور زور سے جھٹکے دیتا رہا۔ شجاعت علی کا ناخن جڑ سے اکھڑ گیا خون کا فوارہ ابل پڑا شجاعت علی بری طرح تڑپنے لگا طارق نے اب انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کا ناخن پلاس کی گرفت میں لے لیا چند سیکنڈ بعد اس انگلی کا ناخن بھی جڑ سے اکھڑ گیا۔

شجاعت علی بری طرح چیخ رہا تھا اور پھر اس کی چیخیں ڈوبتی چلی گئیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

شجاعت علی جب ہوش میں آیا تو وہ تہہ خانے میں اکیلا تھا۔ اس کے انگوٹھے اور انگلی پر ناخن کی جگہ خون جما ہوا تھا' پورے بازو میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں خون فرش پر بھی اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اسے یہ جان

کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ تہہ خانے میں نہ صرف اکیلا تھا بلکہ وہ زنجیروں سے بھی آزاد تھا اور کمرے کے وسط میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک فرش پر بیٹھا رہا پھر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ تھا وہ اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا اور دبے قدموں سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تہہ خانے کا دروازہ لوہے کا تھا اور اندر کی طرف کھلتا تھا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ باہر قدموں کی آواز سن کر چونک گیا وہ دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔

قدموں کی آواز دروازے کے قریب آ کر رک گئی باہر سے کسی نے تالا کھولا اور پھر آہنی دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا شجاعت علی دیوار سے چپکا سانس روکے کھڑا تھا۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا سب سے پہلے کلاشنکوف کی نال نظر آئی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

دروازہ کچھ اور کھل گیا وہ جو کوئی بھی تھا بہت محتاط لگ رہا تھا رائفل کی نال کچھ اور آگے ہو گئی۔ شجاعت علی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اب رائفل پر دو ہاتھ بھی نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک پیر پہلی سیڑھی پر رکھا گیا۔ شجاعت علی نے بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں سے رائفل کی نال کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ آنے والا بظاہر محتاط تو لگتا تھا لیکن غالباً اس اچانک افتاد کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا۔ شجاعت بھی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا وہ بھی سیڑھیوں پر لڑھک گیا کلاشنکوف بھی دونوں کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

شجاعت پشت کے بل سیڑھیوں کے قریب فرش پر گرا تھا دوسرا آدمی اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا یہ وہی آدمی تھا جس نے رات ٹیکسی کے آنے پر بنگلے کا گیٹ کھولا تھا اس نے شجاعت پر چھلانگ لگا دی۔ شجاعت نے حواس سے کام لیتے ہوئے اسے دونوں پیروں پر روک کر دور اچھال دیا اور خود بھی فوراً ہی سنبھل گیا دوسرے آدمی نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اس شخص نے فرش پر پڑی ہوئی کلاشنکوف کی طرف چھلانگ لگائی۔ شجاعت نے پیر آگے کر دیا وہ شخص منہ کے بل گرا اس کا سر سب سے نچلی سیڑھی سے ٹکرایا اس کی

پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔ شجاعت زخمی تھا اس کے ایک ہاتھ کا انگوٹھا اور ایک انگلی بیکار ہو چکی تھی اس دھینگا مشتی سے اس کے انگوٹھے اور انگلی سے پھر خون بہہ نکلا تھا لیکن اس کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی یہاں سے نکلنے کا یہ اس کے لئے آخری موقع تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر حملہ آور کے دوسرے ساتھی دھینگا مشتی کی آواز سن کر آ گئے تو وہ لوگ اب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

حملہ آور نے اس کے منہ پر گھونسہ مارنا چاہا۔ شجاعت نے اس کا وار کلائی پر روکا اور اس کے ساتھ ہی اس کے پہلو پر زور دار ٹھوکر مار دی۔ وہ شخص کراہ کر الٹ گیا شجاعت نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا وہ شخص لڑھکتا ہوا کلاشنکوف تک پہنچ گیا اس نے جیسے ہی کلاشنکوف پر ہاتھ رکھا شجاعت نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی وہ شخص سینے کے بل فرش پر پڑا تھا اور شجاعت اس کے اوپر دونوں کے ہاتھ کلاشنکوف پر تھے اس شخص کی انگلی کلاشنکوف کے ٹرائیگر پر تھی۔ وہ کلاشنکوف کی نال شجاعت کے سر کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا اسی جدوجہد میں ٹرائیگر دب گیا۔ رائفل آٹومیٹک تھی گولیاں تڑاتڑ رائفل کی نال سے نکلیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی تہہ خانہ ایک انسانی چیخ کی آواز سے بھی گونج اٹھا تھا۔

وہ طارق کا دوسرا ساتھی تھا جو دھینگا مشتی کی آوازیں سن کر تہہ خانے میں آ رہا تھا وہ ابھی تیسری سیڑھی پر تھا کہ کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا اور وہ چیختا ہوا سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔

شجاعت علی ایک لمحے کو دم بخود سا رہ گیا اس شخص نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اس نے پوری قوت سے شجاعت کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا وہ اٹھ کر رائفل سیدھی کرنا ہی چاہتا تھا کہ شجاعت نے لیٹے ہی لیٹے لوٹ لگا کر اس کے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی۔ رائفل اس شخص کے ہاتھ سے نکل گئی اس شخص نے سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی شجاعت بھی سیڑھیوں کی طرف دوڑا اس شخص نے آخری سیڑھی پر پہنچتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شجاعت بروقت اوپر پہنچ گیا اس نے اپنا زخمی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ دروازے میں دب گیا وہ شخص دروازے کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ شجاعت کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی مشین میں دب گیا ہو اس نے سختی سے اپنے دانت بھینچ لئے اور پھر دوسرا ہاتھ دروازے میں

ڈال کر اسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

دوسری طرف سے اس شخص نے اچانک ہی دروازہ چھوڑ دیا اچانک جھٹکا لگنے سے شجاعت اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا وہ دوبارہ سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر اس نوجوان کی لاش پر گرا جو فرار ہونے والے شخص کے ہاتھوں کلاشنکوف کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔

وہ اٹھ کر سیڑھیوں پر بھاگا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ سامنے ایک مختصر سا کمرہ تھا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دوسرے دروازے کی طرف بھاگا۔

ٹھیک اسی لمحہ باہر سے کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی وہ دوسرے دروازے کی طرف دوڑا وہ جب دوسرے کمرے سے ہوتا ہوا باہر نکلا تو بنگلے کا باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور ٹیکسی بڑی تیزی سے ریورس میں گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

سب انسپکٹر شجاعت علی گیٹ کی طرف دوڑا ٹیکسی گیٹ سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکی تھی وہ دائیں طرف مڑی اور ٹائروں سے چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتی ہوئی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

شجاعت پاگلوں کی طرح ٹیکسی کے پیچھے دوڑا لیکن وہ دیکھتے ہی دیکھتے موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ شجاعت رک گیا اور ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے لگا اس کی ناک' ہونٹوں اور ہاتھ سے بہنے والے خون سے اس کی وردی تر ہو رہی تھی وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اسی وقت دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا لیکن وہ سڑک سنسان پڑی تھی۔

کلاشنکوف سے فائرنگ تہہ خانے میں ہوئی تھی لیکن اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا فائرنگ کی آواز باہر بھی سنی گئی ہو گی لیکن آس پاس کے مکانوں میں رہنے والا کوئی شخص باہر نہیں نکلا تھا۔ دہشت گردی کے واقعات سے لوگ سہمے ہوئے تھے لوگ فائرنگ کی آواز سن کر باہر تو کیا نکلتے وہ گھروں کی بتیاں تک بجھا لیتے تھے۔

شجاعت کو یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس وقت اس مکان میں اس حملہ آور اور طارق کے دوسرے ساتھی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ طارق کا ساتھی مارا گیا تھا اور حملہ آور فرار ہو گیا تھا۔ شجاعت وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور

اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے لیکن وہ کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ ٹھیک اسی وقت قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دی۔ پچھلے دنوں دہشت گردوں نے مسجدوں میں گھس کر جو قتل و غارت مچائی تھی اس سے سہم کر اکثر لوگ گھروں ہی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ ان لادین دہشت گردوں نے خانہ خدا کا تقدس بھی پامال کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس علاقے کے لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی ہو گی تو وہ لوگ اب گھروں سے نہیں نکلیں گے۔

شجاعت محتاط انداز میں چلتا ہوا دوبارہ اسی مکان میں داخل ہو گیا۔ ایک کمرے میں اسے ٹیلیفون مل گیا اس نے ریسیور اٹھا کر مقامی پولیس سٹیشن کا نمبر ڈائل کر کے اپنی شناخت کرائی اور اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ پولیس کی موبائل تقریباً دو گھنٹے بعد وہاں پہنچی تھی۔ شجاعت علی نے پارٹی انچارج کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

شجاعت یہاں سے فارغ ہو کر ہسپتال سے مرہم پٹی کرانے کے بعد جب اپنے تھانے پہنچا تو اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ کاشف نامی اس دہشت گرد کو جسے گزشتہ رات گرفتار کیا گیا تھا اسے چھوڑ دیا گیا ہے تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی پر حیرانیوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"لیکن کیوں؟ اسے کس کے کہنے پر چھوڑا گیا ہے؟" شجاعت علی نے عجیب سی نگاہوں سے انسپکٹر دلاور کی طرف دیکھا۔

"وہ بے گناہ تھا غلط فہمی کی بنا پر گرفت میں آ گیا تھا۔" انسپکٹر دلاور نے جواب دیا۔

"بے گناہ' غلط فہمی!؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔ "یہ آپ کہہ رہے ہیں سر! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسے خونی مقابلہ کے بعد پکڑا گیا تھا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کس بے رحمی سے میدان میں کھیلتے ہوئے بے گناہ اور معصوم لڑکوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ کس سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے دو لڑکوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور کئی لڑکوں کو زخمی کیا تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ غلط فہمی کی بنا پر پکڑا گیا تھا۔ کیا غلط فہمی تھی اس کے بارے میں کیا ہم نے اسے راہ چلتے زبردستی پکڑ لیا تھا؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" انسپکٹر دلاور نے جواب دیا۔ "وہ کھیلنے کے لئے میدان میں آ رہا تھا کہ اسی دوران دہشت گردوں نے وہاں آ کر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ ڈر کے مارے بھاگ رہا تھا کہ پولیس کی گولی سے زخمی ہو کر گر پڑا اور ہمارے قابو میں آ گیا۔ اس کا دہشت گردوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"اور رائفل بھی اس کے ہاتھ میں اتفاق سے آ گئی تھی؟" شجاعت علی نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہم نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی غلط فہمی کے نتیجے میں ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے اس نے تفتیش کے دوران کیا کیا اعترافات اور انکشافات کئے ہیں؟ وہ پکڑے جانے سے پہلے شہر کے مختلف علاقوں میں درجنوں بے گناہوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ گزشتہ رات ہمارے تھانے پر حملہ بھی اس کے ساتھیوں نے کیا تھا اسے چھڑانے یا ختم کر دینے کے لئے تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کا راز فاش نہ کر سکے۔ اس خونی کارروائی میں بھی دو آدمی ہلاک ہوئے تھے۔ ایک ان کا ساتھی اور دوسرا ہمارا کانسٹیبل۔ رات دو بجے مجھے اغوا کر کے کسی نامعلوم جگہ پر لے جا کر تہہ خانے میں بند کر دیا گیا اور مجھ پر تشدد کر کے اس حکم کی تعمیل کرانے کی کوشش کی گئی کہ میں تھانے فون کر کے اسے چھوڑ دینے کے لئے کہوں لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ انہوں نے میرے دو ناخن اکھاڑ دیئے اور مار مار کر میرا حلیہ بگاڑ دیا پھر بھی میں نے ان کی بات نہیں مانی لیکن آپ نے بڑے اطمینان سے اسے بے گناہ قرار دیتے ہوئے چھوڑ دیا۔ کاش! آپ کو یہ احساس ہوتا کہ اس دہشت گرد کو چھوڑ کر آپ نے کتنی بڑی غلطی کی ہے!"

"کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو؟" انسپکٹر دلاور نے اسے گھورا۔

"نو سر!" شجاعت علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی بیوقوف ایسی حرکت نہیں کر سکتا پولیس کے اس محکمے میں بیوقوفوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس محکمے میں تو صرف عقلمند لوگ ہی آتے ہیں اور ان کی عقل و ذہانت اپنے ذاتی مفاد تک ہی محدود رہتی ہے۔"

"سب انسپکٹر شجاعت علی!" انسپکٹر دلاور نے گھورا۔ "تم یہ بھول رہے ہو کہ تم میرے ماتحت ہو۔"

"ماتحت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے افسران جو چاہیں کرتے رہیں ماتحت اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پولیس کا یہ محکمہ اس لئے قائم نہیں کیا گیا کہ یہاں آنے والے اپنے

لئے دولت سمیٹتے رہیں اور عوام کو قاتلوں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمیں یہ وردی اس لئے نہیں دی گئی کہ ہم اسے پہن کر اپنے آپ کو ہر قانون سے بالاتر سمجھنے لگیں۔ ہمارا کام جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑنا ہے، ان کی پشت پناہی کرنا نہیں۔ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا بھی ہمارا کام نہیں۔ اس کے لئے عدالتیں موجود ہیں۔ آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ بے گناہ اور معصوم لوگوں پر گولیاں برسانے والا وہ دہشت گرد بے گناہ تھا اسے کس کے کہنے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔"

"اس سے تمہیں غرض نہیں ہونی چاہئے۔" انسپکٹر دلاور نے اسے گھورا۔

"مجھے غرض نہیں ہونی چاہئے!" شجاعت علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے ایک ایسے دہشت گرد کو پکڑا جس نے شہر کے مختلف علاقوں میں درجنوں بے گناہ افراد کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا سر! میں اسے اوپر تک لے جاؤں گا۔"

"تم نے پورے شہر کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" انسپکٹر دلاور دھاڑا۔ "تم اپنے افسر سے بدتمیزی سے بات کر رہے ہو۔ یہ ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے۔ میں تمہارے خلاف کارروائی کروں گا۔"

"کل تو آپ میری ترقی اور انعام کے لئے سفارش کر رہے تھے۔" شجاعت علی نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "ایک دہشت گرد کو چھوڑ کر میرے خلاف ڈسپلن کی کارروائی کریں گے .... کیا ملا آپ کو اس کی رہائی کے بدلے؟"

"شٹ اپ۔" انسپکٹر دلاور دھاڑا۔ "تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو سب انسپکٹر!"

"جب آپ جیسے افسران اپنے آپ کو بکاؤ مال بنا لیں تو ماتحتوں کو اپنی حد سے تجاوز کرنا پڑتا ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔

"شٹ اپ!" انسپکٹر دھاڑا۔ "میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" اس نے بڑی تیزی سے ریوالور نکال لیا۔

"کرو شوٹ، چلاؤ گولی۔" شجاعت علی سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

اے ایس آئی شاہد، سب انسپکٹر نعمان اور دوسرے کئی اہل کار دوڑتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے ان دونوں کو قابو کیا۔ اے ایس آئی

شاہد اور دو پولیس والے شجاعت علی کو پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئے۔ انسپکٹر دلاور کے کمرے سے اس کے چیخنے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر شاید وہ فون پر بات کرنے لگا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد شجاعت علی کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اے ایس آئی شاہد نے ریسیور اٹھا لیا۔ چند سیکنڈ بات کی پھر لیس سر کہتے ہوئے ریسیور شجاعت علی کی طرف بڑھا دیا۔

"ڈی ایس پی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیس سر!" شجاعت ریسیور لیتے ہوئے بولا۔ "سب انسپکٹر شجاعت علی بول رہا ہوں۔"

"تم فوراً میرے دفتر پہنچو سب انسپکٹر شجاعت علی۔" ڈی ایس پی کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سوری سر! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔" شجاعت نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ جیسے ہی تھانے سے نکلا ایک ٹیکسی گیٹ کے سامنے رکی۔ ایک بوڑھا آدمی ٹیکسی سے اترا۔ وہ ڈرائیور کو کرایہ دے رہا تھا کہ شجاعت پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر بوڑھے سے پیسے لے کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "کہاں چلوں جناب؟"

شجاعت نے اسے پتہ بتا دیا اور ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ٹیکسی ایس پی کے دفتر کے سامنے رک گئی۔ شجاعت نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر کر دفتر کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ایس پی سے ملاقات کے لئے اسے تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا اس نے دفتر میں داخل ہو کر سلیوٹ کیا اور میز کے سامنے رک گیا۔ ایس پی اس کے زخمی ہاتھ، ناک، منہ اور خون آلود وردی کو دیکھ رہا تھا۔

"سب انسپکٹر شجاعت!" ایس پی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ آفیسر کے سامنے کس طرح پیش ہوا جاتا ہے؟"

"سوری سر!" شجاعت نے جواب دیا۔ "مجھے وردی بدلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں کل سے گھر سے باہر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ کہو کیسے آئے ہو؟" ایس پی نے پوچھا۔

"سر! آپ کو یاد ہو گا دو دن پہلے ہم نے مقابلہ کر کے ایک دہشت گرد کو زندہ گرفتار کیا تھا۔ اسے پولیس کی تحویل سے چھڑانے یا ختم کرنے کے لئے کل شام تھانے پر حملہ بھی ہوا تھا اور پھر رات دو بجے مجھے اغوا کر کے تشدد کے ذریعے اس بات پر مجبور کیا جاتا رہا کہ میں اس دہشت گرد کو چھوڑ دوں۔ میں اگر چاہتا تو اغوا کرنے والے ان دونوں دہشت گردوں کو راستے ہی میں گرفت میں لے سکتا تھا یا فرار ہو سکتا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا کیونکہ میں ان دہشت گردوں کے پورے گروہ اور ٹھکانے کا پتہ چلانا چاہتا تھا۔ میں جس طرح ان دہشت گردوں کی قید سے نکلا ہوں اس کا اندازہ آپ میری اس حالت سے لگا سکتے ہیں لیکن جب میں تھانے پہنچا تو یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ انسپکٹر دلاور نے کاشف نامی اس دہشت گرد کو بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی گرفتاری کسی غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ جبکہ میں نے خود اسے اس وقت زخمی کر کے گرفتار کیا تھا جب وہ فائرنگ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے ڈی ایس پی صاحب نے فون پر تمہاری شکایت کی تھی۔" ایس پی نے کہا۔ "انسپکٹر دلاور سے تمہارا کوئی جھگڑا ہوا تھا تم نے اسے برا بھلا کہا تھا اور جب ڈی ایس پی صاحب نے تمہیں اپنے دفتر طلب کیا تو تم نے ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ تم جانتے ہو تمہارے خلاف ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

"لیس سر!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "حکومت نے مجھے یہ وردی دی ہے یہ صرف جسم پر سجانے کے لئے نہیں اس کا کچھ تقدس ہے اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ آپ جیسے افسروں نے مجھے حوصلہ بخشا ہے میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک یہ وردی میرے جسم پر رہے گی اس کی آن پر حرف نہیں آنے دوں گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس محکمے میں بعض لوگ محض دولت بنانے کے لئے آتے ہیں۔ میں نے انسپکٹر دلاور سے صرف یہ پوچھا تھا کہ اس دہشت گرد کو کس کے کہنے پر چھوڑا گیا ہے جس سے بات بڑھ گئی اور انسپکٹر نے مجھ پر ریوالور تان لیا۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" ایس پی نے کہا۔ "لیکن بعض اوقات حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے میرا خیال ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم چند

روز کے لئے چھٹی پر چلے جاؤ کچھ دن آرام کرو گے تو فریش ہو جاؤ گے۔ انسپکٹر دلاور والے معاملے کو میں دیکھ لوں گا۔"

"لیکن سر!"

"میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" ایس پی نے کہا۔ "اپنا علاج کراؤ اور آرام کرو۔ میں اس سارے معاملے کو دیکھ لوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"یس سر!" شجاعت نے سیلوٹ کیا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

☆======☆======☆

ایس پی کے دفتر سے نکل کر شجاعت ٹیکسی پر بیٹھ کر سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا اس وقت دو بج رہے تھے اس کے ماں باپ پریشان بیٹھے تھے اس کا حلیہ دیکھ کر ماں اس کی طرف لپکی۔

"یہ .... یہ کیا ہوا تمہیں۔ کیا حالت بنا رکھی ہے تمہاری وردی خون آلود ہے اور یہ ہاتھ پر پٹیاں کیسی ہیں؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"کچھ نہیں ہوا ماں جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔" شجاعت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو .... تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟ تم پولیس کی نوکری چھوڑ دو۔ نہیں چاہئے ہمیں تمہاری تنخواہ تمہارے باپ کی زمینوں سے اتنا کچھ آ جاتا ہے کہ کچھ نہ بھی کرو تو زندگی بھر آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی دن تمہاری بھی لاش آئے۔"

"ماں جی۔" شجاعت نے دونوں ہاتھ ماں کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ "میں نے پولیس کی نوکری پیسوں کے لئے تو نہیں کی میں تو یہ سوچ کر اس محکمے میں آیا تھا کہ اس معاشرے کو جرائم پیشہ عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کروں گا اس ملک کو جنت بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کروں گا۔ آپ ہی نے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور اب جبکہ اس شہر کو اس ملک کو میری ضرورت ہے آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ پولیس کی نوکری چھوڑ دوں جب تک آپ کی دعاؤں کا سایہ میرے سر پر سلامت ہے مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ پھر میں اکیلا نہیں ہوں میرے جیسے اور بھی بہت سے پاگل اس محکمے میں اب بھی موجود ہیں۔ اچھا اب آپ ایسا کیجئے کہ نصیر سے کہہ کر کھانا لگوا دیجئے۔ مجھے بڑے زور کی

بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم کپڑے بدلو میں کھانا منگواتی ہوں۔" ماں کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

"سلطانہ کہاں ہے؟" شجاعت نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"یونیورسٹی گئی ہوئی ہے تین بجے تک آئے گی۔" ماں جی نے کچن کے دروازے میں رک کر جواب دیا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

کھانا کھانے کے بعد شجاعت اپنے والد کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ شفاعت زمیندار تھے سکھر میں ان کی زرعی اراضی تھی انہوں نے کراچی میں بھی مکان بنا رکھا تھا۔ بچے کراچی ہی میں زیر تعلیم تھے ان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا کئی سال پہلے بیمار ہو کر انتقال کر گیا تھا۔ شجاعت اور سلطانہ کی پرورش کراچی کے ماحول میں ہوئی تھی انہیں امید نہیں تھی کہ یہ دونوں چند روز بھی گاؤں میں رہ سکیں گے اور جب شجاعت نے پولیس میں سروس جوائن کر لی تو ان کے اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی اب ان کا بھی گاؤں میں دل نہیں لگتا تھا اور ویسے بھی اب ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ انہوں نے زمین بٹائی پر دے دی اور خود بھی کراچی آ گئے۔

وہ دونوں باپ بیٹا دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر شجاعت علی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اس کے ہاتھ میں تکلیف مسلسل ہو رہی تھی اس نے ڈاکٹر کی دی ہوئی گولیاں کھا لیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام چھ بجے سلطانہ کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔

"کہاں غائب رہتے ہیں آپ؟ اور یہ انگلیوں پر نئی پٹیاں کیسی ہیں؟" سلطانہ نے اس کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رات کو گھر آتے ہوئے کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا صرف دو ناخن ہی اکھاڑے ہیں انہوں نے میرے۔" شجاعت نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کسی دن..........."

"کچھ نہیں ہوتا مجھے۔" شجاعت نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ یا آپ جیسے دو چار فرض شناس آفیسر کیا کر سکتے ہیں جبکہ آدے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یہ دیکھئے ایوننگ پیپر کی یہ ہیڈ لائن ایسی

خبروں سے پولیس کا امیج اور بھی بگڑ رہا ہے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے پولیس پر سے۔ جب صورت حال یہ ہو تو لوگ عدم تحفظ کا شکار کیسے نہیں ہوں گے۔" سلطانہ نے کہتے ہوئے شام کا ایک اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ایک پولیس آفیسر نے دہشت گرد کو پکڑا اور دوسرے نے اسے چھوڑ دیا۔"

یہ اس اخبار کی ہیڈ لائن تھی۔ متن میں اس پورے واقعے کی تفصیل تھی جو آج صبح تھانے میں پیش آیا تھا خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ انسپکٹر نے اپنے ماتحت سب انسپکٹر پر ریوالور تان لیا تھا۔ شجاعت کو حیرت ہوئی کہ یہ خبر پریس تک کیسے پہنچی اس کے ساتھ ہی ناظم آباد' گلبہار اور بعض دیگر علاقوں میں دہشت گردوں کی فائرنگ کی بھی خبر تھی۔ ان مختلف واقعات میں چھ افراد ہلاک اور ایک درجن سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی خبر اور بھی تھی جس میں پولیس کے شعبہ اطلاعات کی طرف سے کسی دہشت گرد کو چھوڑنے اور تھانے میں پیش آنے والے اس واقعے کی تردید کی گئی تھی۔

شجاعت نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا چوتھی گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا تھا۔

"شجاعت علی بول رہا ہوں۔ اے ایس آئی شاہد سے بات کراؤ۔" شجاعت علی نے کہا۔

"وہ تو پانچ منٹ پہلے یہاں سے نکلے ہیں۔ شاید گھر گئے ہیں۔" جواب ملا۔

"پریس کو صبح کے ہنگامے والی خبر کس نے جاری کی تھی؟" شجاعت نے پوچھا۔

"اخبار کے رپورٹر نے معمول کے مطابق فون کیا تھا سب انسپکٹر نعمان نے مذاق ہی مذاق میں سب کچھ بتا دیا اب وہ خود بھی پریشان ہو رہا ہے اوپر سے اس کی جواب طلبی ہوئی ہے کہ اگر آپس میں کوئی ایسی ناخوشگوار بات ہوئی بھی تھی تو اسے پریس میں اچھالنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ٹھیک ہے میں بعد میں فون کروں گا۔" شجاعت نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

"سب انسپکٹر نعمان کی حماقت سے یہ ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔" وہ سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ حالات نے پولیس والوں کے ذہن کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔" سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پولیس والے بھی انسان ہیں اور میرا خیال ہے ذہنی طور پر سب سے زیادہ وہی متاثر ہو رہے ہیں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو چائے بنا کر لاؤ۔" شجاعت نے کہا۔

سلطانہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی شجاعت اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا اس میں شبہ نہیں کہ دہشت گردی کے ان واقعات سے کراچی کے شہری نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو رہے تھے صبح کام دھندے کے لئے گھر سے نکلنے والوں کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ شام کو وہ زندہ واپس آئیں گے یا ان کی لاش آئے گی۔ گھر والے اس وقت تک دعائیں مانگتے رہتے تھے بچے اس صورت حال سے سب سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے وہ صبح اسکول جانے سے انکار کر دیتے کہ راستے میں فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہوتیں۔ وہ گھر سے باہر جا کر کھلی جگہ پر کھیل نہیں سکتے تھے۔ گھر والوں کی طرف سے طرح طرح کی پابندیوں سے وہ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ان کے مزاج میں تندی آ گئی تھی اور وہ مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔ ہر شخص عدم تحفظ کا شکار تھا۔ دہشت گردی کے ان واقعات سے دنیا بھر میں پاکستان کی جو رسوائی ہو رہی تھی وہ باعث شرم تھی لیکن شجاعت سوچ رہا تھا کہ جو لوگ امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے جنہیں تنخواہ ہی اس بات کی دی جاتی تھی کہ وہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کریں وہ اپنا فرض بھول گئے تھے رشوت اور لوٹ مار نے انہیں اپنے فرائض سے غافل کر دیا تھا اور خود لٹیرے بن گئے تھے۔ عوام کو دہشت گردوں اور دکانداروں کو ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا بدمعاشوں کی طرح پولیس اہلکاروں نے بھی علاقے تقسیم کر لئے تھے جہاں سے وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بھتے وصول کرتے۔ بھتہ نہ دینے والے دکاندار کو کسی ناکردہ جرم میں پکڑ کر بند کر دیا جاتا پولیس اہلکار جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کے بجائے عوام کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ روزانہ شہر میں کاریں چھینے جانے ڈکیتی اور رہزنی کی درجنوں وارداتیں ہو رہی تھیں لیکن کبھی کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا تھا اگر کوئی پکڑا بھی جاتا تو مٹھی گرم ہونے کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا۔ جو فرض شناس پولیس اہلکار اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں۔

شجاعت یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سلطانہ چائے لے کر آ گئی اس نے چائے کا کپ

اس کے ہاتھ میں تھمایا تو اس کا ہاتھ شجاعت علی کے ہاتھ سے چھو گیا وہ چونک گئی اس نے شجاعت کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔

"ارے! آپ کو تو تیز بخار ہو رہا ہے۔" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"معمولی سی حرارت ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" شجاعت بولا۔

"نہیں میں ڈاکٹر احمد کو بلاتی ہوں وہ اس وقت اپنے کلینک پر آ چکا ہو گا انگلیوں کے ان زخموں کی وجہ سے آپ کو بخار ہوا ہے لاپروائی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے میں بلاتی ہوں ڈاکٹر کو۔" سلطانہ نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور ڈاکٹر احمد کا نمبر ڈائل کرنے لگی لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کال خود ڈاکٹر احمد ہی نے ریسیو کی تھی۔ سلطانہ نے اسے شجاعت کے بارے میں بتایا اور اسے جلدی آنے کے لئے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

کلینک زیادہ دور نہیں تھا ڈاکٹر احمد پندرہ منٹ میں پہنچ گیا۔

"سلطانہ نے آپ کو بلاوجہ زحمت دی ڈاکٹر۔ معمولی حرارت ہے اور اس نے پریشان ہو کر فون کر دیا۔" شجاعت نے کہا۔

"میں ابھی دیکھ لیتا ہوں کہ حرارت کتنی ہے۔" ڈاکٹر احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بیگ سے تھرمامیٹر نکال کر چیک کیا اور تھرمامیٹر اس کے منہ میں لگا کر نبض دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی تشویش ابھر آئی ٹمپریچر ایک سو چار سے کچھ اوپر تھا۔ "تیز بخار ہے اور آپ کہہ رہے ہیں معمولی حرارت ہے یہ ہاتھ ادھر لائیے میں زخم دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر اس کے انگوٹھے کی پٹی کھولنے لگا پٹی کھل کر انگوٹھے کا زخم سامنے آیا تو سلطانہ کانپ اٹھی انگوٹھے کے ناخن کی جگہ زخم تھا جس پر خون جما ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے انگوٹھے کے زخم صاف کر کے ڈریسنگ کی پھر انگلی کی پٹی کھولنے لگا انگلی کا زخم بھی ویسا ہی تھا ڈاکٹر نے اس کی بھی ڈریسنگ کر دی۔

"آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے کاغذات پر دوائیں لکھتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ بی بی میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں انہیں باقاعدگی سے استعمال کراتی رہئے ابھی میں انجکشن بھی دے رہا ہوں پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھئے بخار فوراً اترنا چاہئے۔"

ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر سلطانہ کے حوالے کر دیا اور انجکشن تیار کرنے لگا۔

ڈاکٹر انجکشن لگانے کے بعد چلا گیا۔ ماں جی اور شجاعت کے والد بھی اسی کمرے میں آ گئے تھے۔ سلطانہ نے فریج میں سے برف کے ٹکڑے نکال کر پیالے میں ڈال لئے اور خوب ٹھنڈے پانی سے پٹیاں تر کر کے شجاعت کی پیشانی پر رکھنے لگی۔

"آپ نے سن لیا نا ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟" سلطانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر تو ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں بلکہ اچھے بھلے آدمی کو بیمار بنا دیتے ہیں سچ بتاؤ میں تمہیں بیمار لگتا ہوں؟" شجاعت بولا۔

"اگر آپ اپنے آپ میں کوئی کمزوری محسوس نہیں کرتے تو یہ آپ کی ول پاور ہے لیکن بہرحال ڈاکٹر نے آپ کو آرام کا مشورہ دیا ہے اور میں آپ کو بیڈ سے ہلنے نہیں دوں گی اور تمام دوائیں بھی زبردستی کھلاؤں گی دیکھتی ہوں ایک ہفتے سے پہلے آپ اس کمرے سے باہر کیسے نکلتے ہیں۔" سلطانہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میری بجائے تمہیں پولیس میں ہونا چاہئے تھا۔" شجاعت مسکرا دیا۔

یہ واقعی اس کی ول پاور تھی جو اس نے بخار کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا لیکن اس رات اس کی قوت مدافعت جواب دے گئی۔ گزشتہ رات کے تشدد، رات بھر جاگنے اور پھر بھاگ دوڑ نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کیا تھا۔ وہ رات بھر تیز بخار میں پھنکتا رہا اور سلطانہ اس کے سرہانے بیٹھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کی پیشانی پر رکھتی رہی۔

سلطانہ نے واقعی ایک ہفتے تک اسے کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا وہ اس کے آرام، دوا اور خوراک کا بہت خیال رکھے ہوئے تھی اس دوران اے ایس آئی شاہد دو تین مرتبہ اس کی عیادت کو آ چکا تھا۔ اس سے شجاعت کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ انسپکٹر دلاور کو کسی اور تھانے مین ٹرانسفر کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ انسپکٹر رفعت نے تھانے کا چارج سنبھال لیا تھا۔

شجاعت جس تیزی سے بیمار ہوا تھا اسی سرعت سے وہ صحت یاب بھی ہونے لگا انگوٹھے اور انگلی کا زخم بھی اب ٹھیک ہو رہا تھا مگر بہرحال ایک ہفتہ مزید اسے گھر پر ہی

رہنا پڑا اور جب وہ اپنی ڈیوٹی کی رپورٹ کرنے کے لئے تھانے پہنچا تو وہاں کی صورت حال بدلی ہوئی تھی۔ انسپکٹر رفعت بڑا سخت مزاج پولیس آفیسر تھا بھاری بھرکم جسم‘ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور سیاہ رنگت اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ ڈسپلن کے نام پر اس نے اپنے ماتحتوں کو دباؤ میں رکھا ہوا تھا اس نے شجاعت کو بھی وارننگ دے دی کہ وہ ڈسپلن کا خیال رکھے۔ سب انسپکٹر نعمان کا بھی کسی اور تھانے میں تبادلہ ہو گیا تھا اے ایس آئی شاہد ابھی تک کار چوری والے اسی کیس پر کام کر رہا تھا وہ کیس شجاعت علی کے سپرد کر دیا گیا اور اے ایس آئی شاہد کو بھی اس کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔

دو ہفتے کی کوشش کے بعد ان دونوں نے کار چوروں کے پورے گروہ کا سراغ لگا کر گروہ کے سرغنہ اور اس کے تین ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ گروہ کار چوری کے علاوہ ڈکیتی کی بہت سی وارداتوں میں ملوث تھا۔ ان کے قبضے سے سات کاریں‘ تین موٹر سائیکلیں‘ پانچ ٹی وی سیٹ‘ سات وی سی آر‘ لاکھوں روپے مالیت کے زیورات اور لاکھوں روپے کی نقد رقم بھی برآمد ہوئی تھی۔ انہوں نے پچھلے ایک سال کے دوران چالیس گاڑیوں کی چوری کا اعتراف کیا تھا جنہیں یا تو پرزوں کی صورت میں بیچا گیا تھا یا انہیں بلوچستان اور صوبہ سرحد کے علاقوں میں لے جا کر فروخت کر دیا گیا تھا۔

ان کار چوروں کا چالان مکمل کر کے انہیں عدالت میں پیش کیا گیا تو سب انسپکٹر شجاعت کو یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ گروہ کے ان چاروں آدمیوں کو پہلی ہی پیشی پر صرف دس دس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔

ان دنوں فیڈرل بی ایریا میں جھومر نامی ایک بدمعاش کا بڑا چرچا تھا اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن ایک کان میں لمبا سا بُندا پہنے رہتا تھا اور اسی بُندے کی نسبت سے وہ جھومر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی عمر بتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی لمبے قد کا دبلا پتلا سا آدمی تھا وہ ہر وقت کمانڈو جیکٹ پہنے رہتا آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ میں ہوتی کمر اور گلے میں کراس کی صورت میں لگے ہوئے بیلٹ گولیوں سے بھرے رہتے اس کا گروہ صرف چار آدمیوں پر مشتمل تھا اس کے پاس سرخ رنگ کی شیراڈ تھی۔ وہ ان علاقوں کے دکانداروں سے زبردستی بھتہ وصول کرتا تھا اس کے چاروں ساتھی بھی آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح رہتے تھے جو آدمی بھتہ دینے سے انکار کرتا اسے مار مار کر ادھ موا کر کے سڑک پر پھینک دیا جاتا۔

اس کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ وہ کسی بھی بازار کے چوراہے پر کھڑا ہو جاتا اور اعلان کر دیا جاتا کہ جھومر بدمعاش علاقے میں پہنچ چکا ہے تمام دکاندار اس کے آدمیوں کو بھتہ ادا کر دیں۔

علاقے کے لوگوں نے متعدد بار پولیس کو جھومر کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دی تھی مگر پولیس نے آج تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی البتہ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ پولیس کی کوئی موبائل یا کوئی پارٹی گشت پر ہوتی تو اس علاقے میں جھومر کی آمد کا سن کر پولیس والے وہاں سے نکل جاتے۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جھومر کو پولیس کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ اپنی لوٹ مار میں سے پولیس کو باقاعدہ بھتہ ادا کرتا ہے یہی وجہ تھی کہ پولیس نے اس کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ علاقے کے لوگوں کو اس دہشت گرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا لیکن پھر اچانک ایک اور گروہ پیدا ہو گیا اور اب بھتے کی وصولی کے سلسلے میں دونوں گروہوں میں تصادم ہونے لگے۔ تین ماہ کے عرصے میں ان دونوں دہشت گردوں کے گروہوں کے مسلح تصادم میں کئی بے گناہ مارے جا چکے تھے لیکن پولیس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

اور پھر جھومر نے مزید ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر دیئے اب وہ فیڈرل بی ایریا سے نکل کر گلشن کے علاقے میں بھی وارداتیں کرنے لگا تھا۔

اس شام چھ بجے کے قریب شجاعت تھانے میں موجود تھا کہ فون پر اطلاع ملی کہ جھومر گلشن کے علاقے میں واقع ایک بہت بڑے شاپنگ ایریا میں مورچہ لگائے کھڑا ہے اور اس کے مسلح آدمی دکانوں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔ انسپکٹر شجاعت نے پانچ چھ کانسٹیبل ساتھ لئے اور موبائل پر سوار ہو کر تیزی سے شاپنگ ایریا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جھومر کو پولیس کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مورچے سنبھال لئے اور پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ شجاعت کے حکم پر پولیس اہلکاروں نے بھی موبائل سے اتر کر پوزیشن سنبھال لی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ جھومر کا ایک آدمی مارا گیا۔ جھومر اور اس کے باقی ساتھی سرخ شیراڈ میں بیٹھ کر فائرنگ کرتے ہوئے راہِ فرار اختیار کرنے لگے تو پولیس نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ گلشن کے علاقے میں

خوف و ہراس پھیل گیا۔ ٹریفک رک گیا۔ سڑک کے کنارے شام کو اس وقت اگرچہ ٹریفک کا رش ہوتا تھا مگر جھومر کا ڈرائیور بے حد ماہر تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شیراڈ کو نیپا چورنگی سے یونیورسٹی روڈ پر حسن اسکوائر کی طرف نکال لے گیا پولیس موبائل بھی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے زبردست تبادلہ ہو رہا تھا۔ جھومر کی گاڑی سے کی جانے والی فائرنگ سے تین چار راہ گیر زخمی بھی ہوئے تھے۔

کسٹمز کلب کے قریب سرکلر ریلوے کراسنگ عبور کرنے کے بعد شیراڈ جیسے ہی آگے بڑھی عزیز بھٹی پارک کی طرف سے آنے والی ایک گاڑی اچانک ہی سامنے آگئی۔ جھومر کے ڈرائیور نے تصادم سے بچنے کے لئے گاڑی کو تیزی سے دائیں طرف موڑا لیکن وہ تیز رفتاری کی وجہ سے اسٹیئرنگ پر قابو نہیں رکھ سکا کار سڑک کے وسط میں ٹریفک آئی لینڈ سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئی۔ آگے ایک منی بس جا رہی تھی۔ کار منی بس کے پیچھے ٹکرا گئی۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے بریک لگا دیئے اور وہ چاروں کار سے اتر کر بائیں طرف گندے نالے کی طرف دوڑنے لگے۔ اس دوران پولیس کی موبائل بھی وہاں پہنچ گئی۔ شجاعت نے موبائل کے پوری طرح رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی اور رائفل سنبھالے فائرنگ کرتا ہوا ان کے پیچھے دوڑا۔ تین کانسٹیبل بھی موبائل سے کود کر دوڑے تھے۔

جھومر کا ایک ساتھی چھلانگ لگا کر چوڑا نالہ پار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نالے کے دوسری طرف ایک میدان کی چاردیواری تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ رہا تھا کہ ایک پولیس والے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

جھومر اور اس کے دو ساتھی نالے میں گر گئے تھے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے نالے میں دوڑنے لگے۔ سب سے پہلے شجاعت ہی نالے کے کنارے پہنچا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پوزیشن لے لی اور فائر کھول دیا۔ دوسرے کانسٹیبل بھی اس کی مدد کو پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بھی نالے میں فائرنگ شروع کر دی۔ جھومر اور اس کے دونوں ساتھی گولیوں سے چھلنی ہو کر نالے کی گندگی میں ڈھیر ہو گئے۔ گندگی کے کیڑے گندگی میں ختم ہو گئے تھے۔

دوسرے دن اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ دہشت گرد جھومر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اخباروں نے سب انسپکٹر شجاعت کی تصویریں

بھی شائع کی تھیں۔ اخبارات اور عوامی حلقوں نے سب انسپکٹر شجاعت کی تعریف کی تھی جس نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھومر جیسے دہشت گرد سے نجات دلا دی تھی لیکن دوسری طرف شجاعت بعض اعلیٰ افسروں کے زیر عتاب آگیا تھا۔ سب سے پہلے تو تھانے کا انچارج انسپکٹر رفعت ہی اس پر چڑھ دوڑا تھا۔

”تم نے کس کے حکم پر جھومر کے خلاف کارروائی کی تھی؟“ انسپکٹر رفعت نے اسے گھورا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کارروائی کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت ہے؟“ شجاعت نے کہا۔

”میں جھومر کی بات کر رہا ہوں۔“ انسپکٹر دھاڑا۔

”جھومر اور اس کے ساتھی دہشت گرد تھے۔ وہ علاقے میں واردات کر رہا تھا۔ ہم اطلاع پا کر موقع پر پہنچ گئے اور مقابلے کے بعد اسے ختم کر دیا۔“

”میں اپنے علاقے کو پُرسکون رکھنا چاہتا ہوں مسٹر سب انسپکٹر۔“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔

”آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی سر!“ شجاعت نے کہا۔ ”علاقے کو پُرسکون رکھنے کے لئے دہشت گردوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے‘ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟“

”اگر تم یہ جانتے کہ جھومر کے پیچھے کون لوگ ہیں تو شاید تم اس طرف جانے کی ہمت بھی نہ کرتے اس کی ہلاکت سے جو طوفان اٹھ کھڑا ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”جھومر جیسے دہشت گرد کی پشت پناہی اگر اس ملک کی اعلیٰ ترین شخصیت بھی کر رہی ہو تو میں اسے نہیں بخشوں گا۔“ شجاعت نے کہا۔ ”یہ وردی مجھے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے پہنائی گئی ہے اور جب تک یہ وردی میرے جسم پر موجود ہے میں اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔“

”مجھے معلوم ہے تم ایس پی کی شہ پر ناچ رہے ہو۔ وہ کل کا لونڈا ہم سے زیادہ تجربہ کار نہیں۔ بیس سال ہو گئے ہیں مجھے پولیس کے محکمے میں۔ میں سمجھتا ہوں کس کے خلاف کس وقت کیا کارروائی کرنی چاہئے۔ نمبر بنانے اور اخباروں میں تصویریں چھپوانے

کے لئے تم جو کچھ کر رہے ہو وہ تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو گا۔ جھومر کی ہلاکت کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے اس سے بھی تم جلد ہی واقف ہو جاؤ گے۔ محض تمہاری وجہ سے اوپر سے مجھ پر جو دباؤ پڑ رہا ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ فیڈرل بی ایریا کے پولیس والے بیوقوف نہیں تھے۔ وہ بھی جھومر کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے سچ سمجھ لیا جائے۔" سب انسپکٹر شجاعت علی نے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں لوگ؟" انسپکٹر نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ تمام جرائم اور دہشت گردی پولیس کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔" شجاعت علی بولا۔

"لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو لیکن۔" انسپکٹر نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "آئندہ میرے حکم کے بغیر تم کوئی کارروائی نہیں کرو گے۔"

"میں کوئی جرم ہوتے دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

"میں تمہارے خلاف اوپر رپورٹ لکھ کر بھیج دوں گا اور پھر تمہارا ایس پی بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔" انسپکٹر رفعت نے گھورا۔

"مجھے معلوم ہے۔ یہاں ایک دو نہیں کئی پولیس افسران ایسے ہیں جو میرے خلاف کارروائی کے لئے ہر وقت کسی موقع کی تاک میں ہیں لیکن یہ بات آپ کے علم میں ہونی چاہئے کہ اس محکمے میں میرے بھی کچھ حمایتی ہیں جو دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کا قلع قمع کر کے اس شہر کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اس شہر کو بچانا چاہتے ہیں۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "مجھے جب تک ان مخلص اور ذمے دار افسران کی حمایت حاصل ہے میں جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کارروائی جاری رکھوں گا۔ آپ کے پاس مجھ سے زیادہ اختیارات ہیں۔ آپ اس تھانے کے انچارج اور میرے افسر ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو تحریری طور پر مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی سے روک دیں۔"

شجاعت' انسپکٹر کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دیر تک انسپکٹر رفعت کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس کے محکمے میں کالی بھیڑوں کی کمی نہیں تھی۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ پولیس عوام کے جان و مال کی حفاظت کی بجائے دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کی سرپرستی کر رہی تھی۔ شہر کے مختلف علاقوں میں روزانہ درجنوں بے گناہ افراد دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہو رہے تھے۔ کاریں اور ٹیکسیاں گن پوائنٹ پر چھینی جا رہی تھیں۔ چھینی جانے والی یہی کاریں اور ٹیکسیاں ڈکیتیوں اور دہشت گردی کی وارداتوں میں استعمال ہو رہی تھیں لیکن کبھی کوئی ڈاکو یا دہشت گرد نہیں پکڑا گیا تھا۔ اگر کوئی ذمے دار پولیس اہلکار کسی مجرم کو پکڑ بھی لیتا تو چند ہی گھنٹوں بعد اسے چھوڑ دیا جاتا۔ عوام کا اعتبار پولیس پر سے اٹھ گیا تھا۔ جہاں پیسے ہی کو دین و دھرم بنا لیا جائے وہاں فرائض کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ یہاں تھانوں کا نیلام ہوتا ہے کسی مخصوص اور پسندیدہ تھانے میں تبادلہ کروانے کے لئے پولیس افسران لاکھوں روپے کی رشوت دیتے ہیں اور رشوت میں دیئے گئے یہ لاکھوں روپے وہ چند مہینوں بلکہ چند ہفتوں میں کما لیتے ہیں۔ جہاں صورت حال ایسی ہو وہاں ذمے داری کا احساس مٹ جاتا ہے۔ ضمیر مر جاتا ہے۔

یہ اس کے تین دن بعد کی بات ہے۔ شجاعت رات ایک بجے گشت پر تھا کہ نیپا چورنگی کے قریب ایک کار اور ایک پیلی ٹیکسی کو کھڑے دیکھ کر اس نے موبائل رکوا لی۔ کار کی چھت کے کیریئر پر سامان لدا ہوا تھا۔ وہ لوگ شاید ایئرپورٹ سے آئے تھے۔ دو آدمی ہاتھوں میں ریوالور لئے کار والوں کو باہر نکلنے کے لئے کہہ رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم لوگ؟" شجاعت نے موبائل میں بیٹھے بیٹھے پوچھا جبکہ موبائل کے پچھلی طرف سے ایک مسلح کانسٹیبل اتر کر نیچے آ گیا۔

"سر!" کار میں سے ایک ادھیڑ عمر آدمی اتر کر نیچے آ گیا۔ "ہم لوگ سعودی عرب سے آئے ہیں۔ یہ ہمارے پاسپورٹ ہیں۔ یہ لوگ شارع فیصل سے ہمارے پیچھے لگے تھے۔ یہاں انہوں نے ہمیں روک لیا اور اپنے آپ کو پولیس افسر ظاہر کر کے ہم سے دس ہزار روپے طلب کر رہے ہیں۔ انکار کی صورت میں ہمیں تھانے لے جا کر بند کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔"

شجاعت موبائل سے اتر آیا۔ وہ دونوں آدمی ایک طرف بھاگ اٹھے۔ پولیس

والے ان کے پیچھے دوڑے۔ تھوڑی دیر فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ دونوں پکڑے گئے۔

بازپُرس کرنے پر انکشاف ہوا کہ ان دونوں کا تعلق پولیس سے تھا اور وہ مختلف تھانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ایک اے ایس آئی تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔ وہ لوگ عرصے سے اس قسم کی وارداتیں کر کے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔

"تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے۔" شجاعت نے اے ایس آئی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لئے رکھا گیا تھا۔ لٹیرے کیوں بن گئے ہو؟"

"لٹیرا تو ہمیں اس محکمے نے بنایا ہے۔" اے ایس آئی نے جواب دیا۔ "میری تنخواہ صرف اٹھائیس سو روپے ہے اور مجھے ہر مہینے میں بیس ہزار روپے اوپر دینا پڑتے ہیں۔ کہاں سے لاؤں گا میں یہ رقم؟"

"تھانے چل کر بتاتا ہوں۔" شجاعت نے جواب دیا۔

ان دونوں کو تھانے لے آیا گیا۔ سعودی عرب سے آنے والے مسافر بھی ساتھ تھے۔ ان کی طرف سے ایف آئی آر درج کرانے کے بعد انہیں تو جانے کی اجازت دے دی گئی اور ان دونوں پولیس والوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ انسپکٹر رفعت بھی علاقے کے گشت پر گیا ہوا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو شجاعت نے ان دونوں رہزن پولیس والوں کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم ایف آئی آر کاٹ چکے ہو میں کیا کر سکتا ہوں۔" انسپکٹر نے جواب دیا اور کچھ ہی دیر بعد دوبارہ گشت پر نکل گیا۔

شجاعت سمجھ گیا کہ یہ کیس اب اسی کو ہینڈل کرنا تھا۔ دوسرے دن ان دونوں کو عدالت میں پیش کر کے تین دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا گیا۔

کراچی کی صورت حال خاصی سنگین ہو گئی تھی۔ دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ کراچی سٹی آف ٹیرر بن چکا تھا۔ وہ سڑکیں جہاں اکثر ٹریفک جام رہا کرتا تھا ویران نظر آنے لگی تھیں۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی سناٹا چھا جاتا۔ دہشت گرد مسجدوں میں گھس کر نمازیوں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے انہیں شہید کر رہے تھے۔ خانۂ خدا کے تقدس کو بھی پامال کیا جا رہا تھا اور یہ عبادت گاہیں بھی ویران ہو رہی تھیں۔ جس طرح دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ

دہشت گرد انتہائی تربیت یافتہ تھے۔ اور ان کے پاس جدید ترین ہتھیار موجود تھے۔

پولیس اہلکار چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ سب انسپکٹر شجاعت بھی تین دن سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔ اس دوران وہ فون پر گھر والوں سے بات کر لیتا تھا۔ چوتھے دن شام کو گھر آیا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ سو گیا۔

آدھی رات کے قریب چیخوں کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز تھی .... شجاعت علی بستر سے نکلا اور ریوالور سنبھال کر باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ چیخوں کی آواز اس کے سامنے والے مکان سے آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

پرنس جمشید چند لمحے حیرت سے شبینہ کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تت .... تم .... تم یہاں کیسے آئی ہو؟ میرا مطلب ہے تمہیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا؟" وہ عجیب سی نظروں سے شبینہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"تم اپنے آپ کو اتنا پُراسرار کیوں سمجھتے ہو پرنس جمشید؟" شبینہ نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا .... "نوری خالد کو تمہارے ایک ایک ٹھکانے کا علم ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ گزشتہ رات تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ پولیس کو وہ دو لاشیں تو بعد میں ملی تھیں مگر نوری کو پہلے پتہ چل گیا تھا۔"

"اوہ!" پرنس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "تو تم ابھی تک نوری کے لئے کام کر رہی ہو؟ حالانکہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ...."

"فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو جمشید ...." شبینہ نے اس کی بات کاٹ دی .... "تم بھی یہی دھندا کر رہے ہو اور اچھی طرح جانتے ہو کہ جس کو ایک مرتبہ یہ چسکا لگ جائے وہ اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دھندے میں قدم قدم پر خطرات موجود ہیں لیکن اس میں دولت کتنی ہے، اس کا بھی تمہیں اندازہ ہے اور ویسے بھی آج کل کون سا کام ایسا ہے جس میں خطرات نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں تو وہی کام کرنا چاہئے نا جس میں فائدہ زیادہ ہو۔"

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" جمشید نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"یہ بتاؤ تم یہاں کیوں آئی ہو اور نوری خالد کو رات والے واقعہ کا علم کیسے ہوا؟"

"اس میں شک نہیں کہ تم بہت چالاک اور دور اندیش آدمی ہو۔" شبینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "چالاکی اور دور اندیشی اس کاروبار کا تقاضا ہے۔ تم نے آج تک جو کچھ بھی کیا ہے پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکی۔ کاسینو میں دو آدمیوں کی لاشیں بھی پولیس کے لئے معمہ بنی ہوئی ہیں اور شاید پولیس ان کے قتل کا سراغ آسانی سے نہ لگا سکے لیکن نوری کو دن کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ دونوں دبئی والے دادا کے آدمی تھے اور انہیں موت کے گھاٹ تم نے اتارا تھا۔"

"کیا............؟" جمشید اچھل پڑا۔ اسے شبینہ کی ان معلومات پر شدید حیرت ہو رہی تھی۔

"کیا نوری نے کوئی خواب دیکھا تھا؟"

"خواب نہیں' یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے تم جھٹلا نہیں سکتے۔ تمہاری یہ زخمی ٹانگ بھی یہ ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے تم ہو؟" شبینہ نے کہا۔

"سمجھ گیا............" جمشید نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا سمجھ گئے؟" شبینہ نے اسے گھورا۔

"یہی کہ میرے ساتھ دھوکا دبئی کے دادا نے نہیں نوری نے کیا تھا۔" جمشید نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "وہ دادا کے آدمی نہیں' نوری کے آدمی تھے۔"

"نوری خالد ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔" شبینہ نے کہا۔ "وہ دادا ہی کے آدمی تھے اور تمہارے ساتھ یہ دھوکا دادا نے نہیں انہوں نے کیا تھا۔ ان کے دلوں میں کھوٹ آ گیا تھا۔ دادا سے تمہارا دو سو کلو ہیروئن کا معاملہ طے ہوا تھا جس کے بدلے وہ تمہیں سونا فراہم کرتا لیکن دادا کے ان کارندوں کی نیت بدل گئی تھی۔ وہ تمہیں قتل کر کے ہیروئن اور سونے پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔"

"مجھے اُن کے اس گھناؤنے منصوبے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس لئے میں بھی ان کے استقبال کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میں فیئر ڈیل کا قائل ہوں۔ انہوں نے مجھ سے دھوکا کرنا چاہا اور میں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ میرا اور دادا کا معاملہ ہے

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نوری خالد بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا اسے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ دونوں تمہارا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک آئے تھے اور تم نے اس ویران عمارت میں انہیں گھیر کر مار ڈالا۔" شبینہ نے کہا۔ "لیکن شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ ان کے باقی دونوں ساتھی بھی تمہاری اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں اس ویران عمارت تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دونوں ماضی میں نوری خالد کے لئے بھی کام کرتے رہے ہیں۔ واپس جانے کے بجائے وہ دونوں نوری خالد کے پاس پہنچ گئے اور اس سلسلے میں اس سے مدد کی درخواست کی۔"

"کیسی مدد؟" جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ جانتے ہیں کہ جب دادا کو اس صورت حال کا علم ہو گا تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوری تمہاری تلاش میں ان کی مدد کرے بلکہ تمہیں ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ منصوبہ ہو کہ تمہیں قتل کر دیا جائے اور واپس جا کر دادا کو کوئی من گھڑت قصہ سنا دیں۔"

"اوہ!" جمشید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تو تم اس لئے یہاں آئی ہو کہ............"

"کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے جلد بازی کی ضرورت نہیں۔" شبینہ نے اسے ٹوک دیا۔

"نوری خالد بھی کاروبار میں دیانت اور اصول پرستی کا قائل ہے۔ ان دونوں نے اگرچہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ تم نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور ان کا مال چھین کر لے گئے ہو مگر نوری تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے ان دونوں سے سچ اگلوا لیا اور سچ جاننے کے بعد اس نے ان دونوں کو اپنے آدمیوں کی نگرانی میں دے دیا اور ٹیلیفون پر دبئی میں دادا کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ دادا کے آدمی ایک دو دن میں انہیں لینے کے لئے آ رہے ہیں۔"

"اور وہ لوگ جو سونا لے کر آئے تھے؟" جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ سونا نہیں لائے تھے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "وہ تو تمہیں قتل کر دینے کا منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ دادا سے انہوں نے سونا وصول کر لیا تھا لیکن اسے دبئی ہی میں کہیں چھپا آئے تھے۔ ان کی نیت تو کچھ اور تھی۔ ساحل سے کچھ دور لنگرانداز وہ کشتی بھی ساحلی پولیس کو مل گئی ہے اور تمہارے ساتھی کی لاش بھی۔"

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" جمشید نے اسے گھورا۔

"نوری کا پیغام لے کر۔" شبینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کیوں؟" جمشید نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کوئی کاروباری معاملہ طے کرنا چاہتا ہوگا۔" شبینہ مسکرائی۔

"یہ پیشکش وہ مجھے پہلے بھی کر چکا ہے اور میں نے اس وقت بھی انکار کر دیا تھا' تم جانتی ہو اور وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اکیلا کام کرنے کا عادی ہوں۔"

"یہ اکیلے کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔" شبینہ نے کہا۔ "کراچی کے حالات سے تم واقف ہو۔ یہ موقع ہے فائدہ اٹھانے کا۔ چند دہشت گردوں نے اس شہر میں قیامت مچا رکھی ہے۔ پولیس بے بس ہو چکی ہے۔ لوگ پولیس سے مایوس ہو گئے ہیں۔ زندگی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے۔ لوگ اپنے طور پر دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں اسلحہ کی ضرورت ہے۔ نوری خالد ان کے ہاتھوں میں اسلحہ دینا چاہتا ہے۔ دہشت گردوں کی کئی پارٹیاں بھی نوری سے باقاعدگی سے اسلحہ خرید رہی ہیں۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ منافع میں پچاس فیصد حصے داری کی بنیاد پر تمہیں سرمایہ بھی نہیں لگانا پڑے گا۔"

"میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم جانتی ہو کہ مجھے اسلحہ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"حالانکہ اسلحہ اور ہیروئن میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔" شبینہ نے کہا۔ "ہیروئن انسان کو سلوموشن میں موت کے گھاٹ اتارتی ہے اور رائفل کی گولی سے نتیجہ فوری طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ اسلحہ اور ہیروئن کے استعمال سے مرنے والا کون ہے؟ ہمارا مقصد پیسہ کمانا ہے اور یہ پیسہ کمانے کا بہترین موقع ہے۔"

"دیکھو شبینہ۔" جمشید نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "پچھلی مرتبہ جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو میں نے تم سے کہا تھا کہ اس خطرناک دھندے سے نکل جاؤ۔ میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں جتنا پیسہ چاہئے مجھ سے لے لو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ اتنی دور کہ یہ لوگ تمہارا سراغ نہ لگا سکیں۔ میری یہ پیشکش اب بھی برقرار ہے۔"

"تمہیں میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" شبینہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں مجھ سے............"

"مجھے تم سے صرف ہمدردی ہے۔" جمشید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے اپنی بہن کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں وہ منظر آج تک نہیں بھلا سکا جب میں نے اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"سنا ہے تمہاری بہن ہیروئن کی عادی تھی اور وہ فٹ پاتھ پر............"

"ہاں۔" جمشید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے ہیروئن کا عادی بنایا گیا تھا۔ پولیس اس کے ذریعے مجھے گرفت میں لینا چاہتی تھی لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ پولیس والے میری بہن کو اٹھا کر لے گئے ہیں تو میرا سینہ انتقام کی آگ سے بھڑک اٹھا۔ میں انتقام لینا چاہتا تھا اور اس انتقام کی آگ نے مجھے مجرم بنا دیا لیکن اب میں اس گھناؤنے کھیل سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔"

"مگر تم الگ نہیں ہو سکتے۔" شبینہ نے کہا۔ "موت اور زندگی کے اس کھیل میں شامل ہونے کے بعد کوئی شخص اپنی مرضی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ راستے میں کئی خطرناک رکاوٹیں ہیں۔ پولیس سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ تم ان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہو۔ تمہیں مجرم بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ انہیں آمدنی کا ایک ذریعہ مل جائے۔ اب تم مر کر ہی ان سے پیچھا چھڑا سکتے ہو۔ پولیس کے علاوہ تمہارے کاروباری حریف اور حلیف تمہیں اس دھندے سے الگ نہیں ہونے دیں گے۔ تم ان سے فرار حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم دنیا کے کسی کونے میں چلے جاؤ وہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لئے کہ تم سے ان کے بہت سے مفاد اور راز وابستہ ہیں۔ وہ کہیں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہیں اس کا تجربہ ہے اور تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں یہ دھندا چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

"تم اگر چاہو تو میں تمہیں تحفظ دے سکتا ہوں۔" جمشید نے کہا۔

"جو خود عدم تحفظ کا شکار ہو وہ دوسروں کو کیا تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ ہمارے شہر کی پولیس کی طرح۔" شبینہ نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"بہر حال۔" جمشید نے اس کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "میں نوری کی کوئی پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔ میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔"

"سوچ لو پرنس جمشید۔" شبینہ نے کہا۔ "نوری تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ تمہارا کوئی بھی خفیہ ٹھکانہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"بلیک میلنگ!" جمشید نے اسے گھورا۔ "تم بھی یہ بات ذہن میں رکھو کہ پولیس کا سب انسپکٹر شجاعت علی تمہاری تلاش میں ہے۔"

"آہا۔" شبینہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "میں بھول گئی تھی کہ پولیس میں اس جیسے احمق بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پولیس کی نوکری چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا لیکن اسے فرض شناسی اور ذمے داری کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ وہ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے پیچھے خالد کی طاقت ہے اور جس کی پشت پر نوری جیسی طاقت ہو پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"تم آگ سے کھیل رہی ہو شبینہ۔" جمشید نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ یہ آگ تمہیں جلا کر بھسم کر ڈالے تم اس کھیل سے الگ ہو جاؤ۔"

"مشورے کا شکریہ۔" شبینہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا پیغام نوری خالد تک پہنچا دوں گی لیکن میرا بھی مشورہ ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔ میں اپنی طرف سے تمہیں ایک اور موقع دے کر جا رہی ہوں دو دن بعد پھر ملاقات ہو گی۔"

شبینہ چلی گئی اور جمشید اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔ شبینہ سے اس کی پہلی ملاقات تقریباً دس مہینے پہلے ہوئی تھی۔ وہ رات اسے کبھی نہیں بھولے گی۔ گیارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ اپنے ناظم آباد والے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ ٹیکسی اس نے نایاب سینما کے سامنے چھوڑ دی تھی۔ مارکیٹ کے قریب وہ جیسے ہی پارک کے سامنے پہنچا اسے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے سناٹا تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اس نے پارک کی طرف دیکھا۔ یہاں بھی تاریکی اور سناٹا تھا۔

چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ پارک میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے سنسان اور تاریک پارک میں ایک لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ لڑکی چیخ رہی تھی اور دو آدمی اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ لڑکی کسی پودے میں الجھ کر گر گئی۔ اس کا تعاقب کرنے والے اس کے سر پر پہنچ گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ لڑکی تک پہنچ سکتے جمشید ان کے راستے میں آ گیا۔ وہ دو تھے اور جمشید اکیلا لیکن اس نے ان دونوں کو گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ دونوں نوجوان تھے۔ اس طرح اچانک مداخلت پر وہ کسی قدر بدحواس ہو کر پٹتے رہے لیکن پھر جلد ہی سنبھل گئے۔ اب جمشید ان کے درمیان فٹ بال بن گیا۔ وہ دونوں اس کی پٹائی کرنے لگے۔ جمشید کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ زبان پر اپنے خون کا ذائقہ محسوس کر کے جمشید پر جنون سا طاری ہو گیا۔ اس نے سنبھل کر ان دونوں پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے چاقو نکال لیا۔ جمشید نے اس کے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ چاقو اس شخص کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور پودوں میں جا گرا۔ اس کے بعد جمشید نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دونوں راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ دونوں مختلف سمتوں میں بھاگ نکلے۔ اس کے جاتے ہی جمشید لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا جو پودوں میں سہمی ہوئی پڑی تھی۔

"کون ہو تم ....؟ اور یہ کون لوگ تھے؟" جمشید نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"مم .... میرا نام شبینہ ہے۔ یہ لوگ مجھے دھوکے سے لے آئے تھے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ وہ خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"کون تھے یہ لوگ؟" جمشید نے سوال کیا۔

"میرے کلاس فیلو۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ ان کے کہنے پر میں سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ ہم نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر یہ دونوں مجھے لے کر مختلف جگہوں پر گھومتے رہے۔ پھر ایک اور دوست کے گھر لے گئے مگر اس کے مکان پر تالا لگا ہوا تھا۔ پھر ہم یہاں پارک میں آ کر بیٹھ گئے۔ تاریکی اور سناٹے میں مجھے ڈر سا لگ رہا تھا۔ وہ لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے اور پھر ان میں سے ایک نے میرا منہ دبوچ لیا اور دوسرا.........."

شبینہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر اپنے بارے میں بتانے لگی۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی اور تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس کا باپ سرکاری ملازم تھا۔ وہ ایک ایسے محکمے اور ایسی سیٹ پر تھا جہاں بقول شخصے ہن برستا تھا لیکن اس نے کبھی رشوت نہیں لی۔ رزق حلال پر پانچ بچوں کی پرورش کر رہا تھا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ وہ کس طرح گزارہ کر رہا تھا۔ مگر اس کے بچے محرومی کا شکار تھے۔ شبینہ یونیورسٹی میں ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی احساس کمتری کا شکار تھی۔ آصف سے اس کی ملاقات ہوئی تو اسے اس لڑکے کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ اس کے پاس ہمیشہ نئی گاڑی ہوتی اور جیبیں نوٹوں سے بھری رہتیں۔

دوستی ہوتے ہی آصف نے اس پر نوازشات کی بارش کر دی۔ وہ اسے قیمتی تحائف دینے لگا شبینہ شروع میں تو یہ تحائف گھر والوں سے چھپاتی رہی مگر پھر اس کا یہ راز چھپا نہ رہ سکا۔ ماں باپ نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ عزت کا واسطہ دیا۔ ڈرایا دھمکایا مگر شبینہ اس راستے پر چل نکلی تھی جہاں کوئی پابندی اس کے پیروں کی بیڑی نہ بن سکی۔

چند ہفتوں بعد آصف کا دوست علی مراد بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بھی دولت مند لڑکا تھا اور ان دونوں کی دولت کی چمک نے شبینہ کو اندھا کر دیا تھا۔ وہ اس راستے پر اتنا آگے نکل چکی تھی کہ اس کے لئے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ وہ تو یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ ایک ایسے شریف گھرانے کی لڑکی ہے جہاں عزت ہی کو سب سے بڑی دولت سمجھا جاتا ہے اور پھر اس روز وہ ان کی ہوس کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اگر جمشید بر وقت نہ پہنچ جاتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ جمشید اسے ٹیکسی پر بٹھا کر اس کے گھر کے قریب چھوڑ آیا تھا۔

شبینہ سے دوسری ملاقات بھی محض اتفاقاً ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں ہو گئی تھی اور جمشید کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ شبینہ کے ساتھ وہی دو لڑکے تھے جن سے اس رات اس نے اسے بچایا تھا لیکن یہ بہت بدلی ہوئی تھی۔ تیسری ملاقات آج سے دو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تھی اور اس کے لئے نوری کی طرف سے ایک پیشکش لے کر آئی تھی۔ شبینہ کے منہ سے نوری کا نام سن کر جمشید چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"اوہ! تو اس رات وہ سب ڈرامہ تھا؟" جمشید نے اسے گھورا۔

"نہیں۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "وہ میری بربادی کی ابتدا تھی۔ وہ لوگ میرے گرد اس قدر مضبوط جال بُن چکے تھے کہ میں تو کیا کوئی بھی اس سے نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ دوستی کی آڑ میں مجھ پر وہ نوازشات کیوں ہو رہی تھیں۔ مجھے قیمتی تحائف کیوں دیئے جا رہے تھے۔ اب حقیقتاً میں اس مقام پر پہنچ چکی ہوں جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔"

جمشید نے اس وقت بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اب بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر شبینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آگ اور خون کے. اس کھیل میں شریک ہونے کے بعد کوئی اس سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔

شبینہ کے جانے کے بعد جمشید دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک اچھے اور شریف گھرانے کی لڑکی کس طرح محرومیوں کا شکار ہو کر خطرناک راستے پر چل نکلی تھی اور اب اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دفعتاً اسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔ اس نے بابا کو بلا کر کھانے کے بارے میں پوچھا۔ سالن تیار تھا۔ صرف روٹی پکانی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا۔" وہ پلنگ سے اترتے ہوئے بولا۔ "تم روٹی پکاؤ۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آ رہا ہوں۔"

"جمشید باتھ روم کی طرف بڑھا مگر زخمی پیر زمین پر رکھتے ہی اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ زخم کی وجہ سے ٹانگ میں اچھی خاصی تکلیف تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا باتھ روم تک گیا۔ چند منٹ بعد بابا روٹی پکا کر کھانا میز پر لگا چکا تھا۔

"بابا۔" جمشید اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر احمد کا کلینک ابھی کھلا ہو گا۔ تم جا کر ڈاکٹر احمد کو بلا لاؤ۔ کہنا ٹانگ پر چوٹ لگ گئی ہے' ڈریسنگ کرانی ہے۔"

"جی' میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" بابا کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

جمشید کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ٹانگ میں اچھی خاصی تکلیف تھی۔ ڈاکٹر احمد تقریباً چالیس منٹ بعد آیا تھا۔ اس ڈاکٹر سے جمشید کے تعلقات خاصے پرانے تھے۔ وہ اسے ایک کاروباری اور شریف آدمی سمجھتا تھا۔ اسے کبھی شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ جمشید کی اصلیت کیا ہے۔

"کیا ہوا .... کیسے چوٹ لگی؟" ڈاکٹر احمد نے اس کی ٹانگ کی پٹی کھولتے

ہوئے پوچھا۔

"چوٹ نہیں گولی لگی ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"گولی؟" احمد اچھل پڑا۔ "ایسی صورت میں تو آپ کو........"

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔" جمشید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کل رات میں اپنے ایک دوست کے پاس نارتھ ناظم آباد گیا تھا۔ ہم دونوں مارکیٹ کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ ایک دکان لوٹ کر فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی میری ٹانگ میں بھی لگی۔ افراتفری مچ گئی تھی۔ میرا دوست مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ میری حد تک معاملہ چونکہ زیادہ سنگین نہیں تھا اس لئے میں نے پولیس کو اپنے زخمی ہونے کی اطلاع نہیں دی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسے معاملات میں پولیس والے شریف لوگوں کو کس طرح پریشان کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر احمد نے پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لیا۔ اس نے اسپرٹ سے زخم صاف کر کے ڈریسنگ کر دی اور انجکشن تیار کرنے لگا۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ انجکشن لگا رہا ہوں۔ اس سے تکلیف کم ہو جائے گی۔" ڈاکٹر نے کہتے ہوئے انجکشن لگا دیا۔

جمشید نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کر رخصت ہو گیا جمشید صوفے پر نیم دراز ایک بار پھر شبینہ اور نوری خالد کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا راز فاش ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے مقابلے پر نوری خالد آ گیا تھا جسے زیر زمین دنیا کا سب سے خطرناک آدمی سمجھا جاتا تھا۔ وہ جمشید کے اس راز سے واقف ہو گیا تھا کہ گزشتہ رات اس نے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ وہ یقیناً اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا اور غالباً اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ شبینہ دراصل کوئی پیشکش لے کر نہیں آئی تھی بلکہ اسے نوری خالد کا یہ پیغام دینے آئی تھی کہ وہ اس کے لئے کام کرے۔ اگر پیشکش دوستانہ ہوتی تو کل رات والے واقعے کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن جمشید کو حیرت اس بات پر تھی کہ نوری خالد کو اس کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ کیسے چلا تھا؟ وہ اس بنگلے کو اپنے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھتا تھا جمشید کے اس شہر میں کئی خفیہ ٹھکانے تھے ہو سکتا ہے بہت سے ٹھکانے نوری خالد کی نظروں میں آ گئے ہوں'

لیکن جمشید کے خیال میں اس کا ایک خفیہ ٹھکانا ایسا بھی تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ نوری تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں ہو گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ اس ٹھکانے پر منتقل ہو جائے گا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے جمشید کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ یہ شاید انجکشن کا اثر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

جمشید کی آنکھ کھلی تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر تیار ہوا اور بابا کو کچھ ہدایات دیتا ہوا بنگلے سے باہر نکل گیا' گلیوں سے نکل کر وہ میدان عبور کر کے یونیورسٹی روڈ پر آ گیا۔ تقریباً نصف میل کا یہ فاصلہ طے کرنے سے اس کی ٹانگ میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی روڈ سے ان بنگلوں تک پیدل آمد و رفت کے لئے ایک راستہ سا بنا ہوا تھا۔ اس وقت لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہ اگرچہ خاصا محتاط نظر آ رہا تھا لیکن اس بات کا اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں۔

وہ ایک پیلی ٹیکسی پر بیٹھ کر سبزی منڈی پہنچ گیا۔ وہاں ٹیکسی چھوڑ دی اور سڑک عبور کر کے ایک رکشہ میں بیٹھ گیا۔ سبزی منڈی کے اسٹاپ پر اس وقت عام طور پر بڑی رونق ہوا کرتی تھی لیکن شہر میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی وارداتوں کے باعث یہاں زیادہ رونق نہیں تھی۔ اس نے رکشہ میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو ضیاء الحق کالونی چلنے کو کہا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ضیاء الحق کالونی کی دکانوں کے سامنے رکشے سے اتر رہا تھا۔ یہ گلشن اقبال کے بلاک ون کے بنگلوں کے سامنے گندے نالے کے کنارے بنگالیوں کی آبادی پر مشتمل کچی بستی تھی۔ وہ اس کچی بستی کی تنگ و تاریک اور پُر پیچ گلیوں میں چلتا ہوا ندی کے نشیب میں ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور جمشید اندر داخل ہو گیا۔

☆======☆======☆

چیخوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ جیسے کسی پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہو۔ شجاعت علی کے تمام گھر والے اٹھ گئے تھے۔ وہ جب دوڑتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکلا تو گلی سنسان پڑی تھی۔ شجاعت علی کو یقین تھا کہ دوسرے پڑوسیوں نے بھی چیخوں کی یہ آوازیں سنی

ہوں گی لیکن کوئی بھی صورت حال دریافت کرنے کے لئے باہر نہیں نکلا تھا۔ شہر کے حالات پُرسکون اور نارمل ہوتے تو اس وقت تک گلی میں لوگوں کا جمگھٹا لگ چکا ہوتا مگر......... دہشت گردی اور ڈکیتیوں کی وارداتوں نے شہریوں کو ایک عجیب سے خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کسی رکشہ وغیرہ کا پش فائر ہوتا یا کسی دکان کا شٹر گرانے یا اٹھائے جانے کی آواز سے بھی لوگ دہشت زدہ ہو جاتے۔ دن کا وقت ہوتا تو کھڑکیاں دروازے بند کر لیتے اور رات کے وقت ایسی کوئی آواز سنائی دیتی تو فوراً ہی بتیاں بجھا دی جاتیں۔

اس وقت تو گلی کے بیشتر مکانوں میں اندھیرا تھا۔ چیخوں کی آواز سن کر لوگ یقیناً خوفزدہ ہو گئے تھے۔ نسوانی چیخوں کے ساتھ اب مردوں اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ شجاعت علی نے سنسان گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا اور ریوالور سنبھالے دوڑتا ہوا سامنے والے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔

شجاعت علی کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ شاید اس مکان میں ڈاکو گھس آئے تھے اور گھر والوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا اس مکان میں معبود علی رہتے تھے۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھے۔ پانچ چھ بچے تھے۔ کوئی کالج میں اور کوئی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ یہ مکان انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا ان کی تنخواہ اتنی تھی کہ سفید پوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ڈاکو شاید یہ سمجھ کر گھر میں گھسے ہوں گے کہ یہاں سے انہیں بہت کچھ مل جائے گا۔

"معبود صاحب!" شجاعت علی دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے چیخا۔ "حوصلہ رکھئے .... میں آرہا ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد ہی معبود علی کے بیٹے صابر نے دروازہ کھول دیا۔ گھر والوں نے یقیناً شجاعت علی کی آواز پہچان لی تھی لیکن اس طرح دروازہ کھولے جانے پر شجاعت علی الجھن میں پڑ گیا۔ اگر گھر میں ڈاکو گھسے ہوتے تو گھر کا کوئی فرد اس طرح دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔

"کیا ہوا صابر.........؟ کون چیخ رہا ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔ ٹھیک اسی لمحے اندر سے کوئی شیشہ ٹوٹنے اور لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"فریدہ کو کچھ ہو گیا ہے۔ سوتے میں چیختی ہوئی اٹھی تھی اور توڑ پھوڑ شروع کر

دی۔ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی۔" صابر نے بتایا۔

"ابو سے کہو اگر میری ضرورت ہو تو میں باہر موجود ہوں۔" شجاعت علی نے کہا۔

صابر اندر چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد واپس آکر شجاعت علی کو اندر لے گیا۔ گھر کے تمام افراد جاگے ہوئے تھے۔ پریشانی اور تشویش ہر چہرے پر تھی۔ معبود علی اور ان کی بیگم نے فریدہ کو پکڑ رکھا تھا جو زمین پر اوندھی بیٹھی تھی اور اس نے دونوں ہاتھ بڑی سختی سے کانوں پر جما رکھے تھے۔

"یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں........." شجاعت علی فریدہ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں مسلسل بول رہی تھی۔ "کون چلا رہا ہے گولیاں .... وہ دیکھو......... اسے پکڑو........." وہ ایک دم چیخی۔ "اسے گولی لگی ہے .... خون......... خون بہہ رہا ہے......... چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مت چلاؤ گولیاں......... پکڑو اسے......... خون بہہ رہا ہے........."

شجاعت علی سکتے میں آگیا۔ فریدہ کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی وہ سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اکثر پڑھنے کے لئے سلطانہ کے پاس آئی رہتی تھی۔ بڑی ذہین اور خوش اخلاق بچی تھی۔ جب کبھی شجاعت علی سے آمنا سامنا ہوتا تو وہ اس سے یہ سوال ضرور کرتی۔ "بھائی جان! کراچی کے حالات کب درست ہوں گے۔ شہریوں کو کب سکون کا سانس لینا نصیب ہو گا؟ اس شہر پر چھائے ہوئے اندھیرے کب دور ہوں گے؟"

شجاعت علی نے بیگم معبود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور معبود علی کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ کمرے کے کونے میں میز پر رکھے ہوئے ٹی وی کا شیشہ اور پکچر ٹیوب ٹوٹی ہوئی تھی۔ شیشے کی کرچیاں آس پاس بکھری ہوئی تھیں۔ فریدہ کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے اور کتابیں کاپیاں اور بہت سی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں سلطانہ اور اس کی والدہ بھی آگئیں۔ محلے کی دوسری عورتیں بھی اطلاع پا کر آنے لگیں۔ آنگن میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہ شور و غوغا ڈاکوؤں کی وجہ سے نہیں تھا۔ گلی کے بہت سے گھروں کے مکین صورت حال معلوم کرنے کے لئے آ گئے تھے۔

"معبود صاحب!" شجاعت علی نے کہا۔ "بچی کو ہسپتال لے چلیں۔"

"لے جانا ہی پڑے گا۔" معبود علی نے افسردہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"میری گاڑی خود ورکشاپ میں ہے۔ میں ظہیر صاحب کی گاڑی نکلواتا ہوں۔ آپ اسے لے کر باہر آئیے۔" شجاعت علی کہتا ہوا باہر آگیا۔ باہر ان کا پڑوسی ظہیر بھی موجود تھا۔

"ظہیر صاحب۔" شجاعت علی اسے دیکھتے ہی بولا۔ "اپنی گاڑی نکالئے۔ بچی کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے جانا ہے۔ آپ گاڑی نکالئے میں ابھی آتا ہوں۔"

شجاعت علی نے اپنے کمرے میں آکر بڑی عجلت میں یونیفارم پہنی اور ریوالور ہولسٹر کا بیلٹ لگاتے ہوئے باہر آگیا۔ اسے شہر کے بیشتر تھانوں کے اہلکار جانتے تھے لیکن رینجرز نے بھی جگہ جگہ چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اس کی موبائلز چیکنگ کرتی رہتی تھیں۔ وردی اس نے اس لئے پہنی تھی کہ راستے میں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

معبود علی اور ان کی بیگم فریدہ کو دبوچ کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شجاعت علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ظہیر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ اسے گولی کیوں مار رہے ہو .... خدا کے لئے اسے گولی مت مارو .... چلے جاؤ .... جاؤ۔" فریدہ مسلسل بول رہی تھی اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ معبود علی اور ان کی بیگم بڑی مشکل سے اسے قابو میں کئے ہوئے تھے۔

فریدہ کی حالت دیکھ کر شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کراچی کے حالات نے اسے ذہنی طور پر بہت بری طرح متاثر کیا تھا۔ کراچی کا کوئی بھی شہری خواہ وہ بچہ ہو' جوان ہو یا بوڑھا............ اپنے آپ کو حالات سے لاتعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ طالب علم اس لحاظ سے بھی زیادہ متاثر ہو رہے تھے کہ ایک طرف ان کی تعلیم کا حرج ہو رہا تھا اور دوسری طرف ذہن پر یہ خوف طاری رہتا تھا کہ اسکول یا کالج آتے جاتے اچانک کسی طرف سے آنے والی گولی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ بات صرف ایک فریدہ کی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے لوگ اس طرح نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو رہے تھے اعصاب پر قابو رکھنے کے لئے کراچی میں رہنے والا ہر تیسرا فرد ٹرانکولائزر گولیاں استعمال کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے بھی فریدہ کی کیفیت کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں کی تھی' اسے فوری طور

انجکشن دے دیا گیا۔ لگتا تھا جیسے انجکشن میں بھی تاثیر نہ رہی ہو۔ فریدہ تقریباً آدھے گھنٹے تک چیختی چلاتی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی اور بالآخر اس کے اعضا ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اسے بیڈ پر لٹا دیا گیا اور کچھ ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

شجاعت علی رات بھر ہسپتال میں رہا۔ صبح چھ بجے انجکشن کا اثر زائل ہوتے ہی فریدہ نے ایک بار پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کبھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی اور کبھی خون خون چیخنے لگتی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق حالات نے اس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کے دماغ کی نسیں نہیں پھٹی تھیں لیکن وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی۔ ڈاکٹر نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ طویل عرصہ کے لئے اس اعصابی دباؤ میں رہ سکتی ہے۔

اس روز شجاعت علی بھی شدید طور پر ذہنی دباؤ میں رہا تھا۔ کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ کی نسیں پھٹ رہی ہوں۔ وہ بار بار دونوں ہاتھ سے کنپٹیاں مسلنے لگتا۔ کبھی اس کے جبڑے بھنچ جاتے اور کبھی مٹھیاں بھینچنے لگتا۔

تھانے کے انسپکٹر رفعت سے اس کی ٹھن گئی تھی۔ شجاعت علی نے جن دو پولیس والوں کو رہزنی کے الزام میں گرفتار کیا تھا اس سلسلے میں بھی اس پر شدید دباؤ تھا۔ انسپکٹر رفعت چاہتا تھا کہ ان دونوں پولیس اہلکاروں کے خلاف یہ کیس ختم کر دیا جائے۔

"یہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "کیس عدالت میں پہنچ چکا ہے اور دونوں ریمانڈ پر ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" انسپکٹر رفعت نے جواب دیا۔ "ایف آئی آر حرفِ آخر تو نہیں ہوتی۔ اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور بھی بہت سے طریقے ہیں اس کیس کو ختم کرنے کے۔ وہیں سے آنے والے جس شخص کی طرف سے رپورٹ درج کی گئی ہے اسے پکڑ کر جھوٹی اور غلط ایف آئی آر درج کرانے کے الزام میں بند کر دو۔ ان کے خلاف اسمگلنگ کا کیس بھی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کیس اس طرح بنے گا کہ اے ایس آئی بشیر اور کانسٹیبل نور محمد ڈیوٹی پر تھے انہیں باہر سے آنے والے ان مسافروں پر کسی قسم کا شبہ ہوا تھا انہوں نے کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کار روک کر چیک کر رہے تھے کہ مقامی تھانے کے اہلکار پہنچ گئے اور کار میں سوار لوگوں نے انہی پولیس اہلکاروں پر رہزنی

کا الزام لگا کر الٹا انہی کو پھنسا دیا۔ ان لوگوں کا ایڈریس تمہارے پاس موجود ہے جس شخص کی طرف سے ایف آئی آر درج کی گئی ہے اسے پکڑ کر بند کر دو۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ طریقے نہیں سیکھے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میں نہ تو کسی بے گناہ کو پکڑ کر بند کر سکتا ہوں اور نہ ہی کسی ملزم کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

انسپکٹر رفعت گشت پر چلا گیا۔ شجاعت علی نے پکڑے جانے والے رہزن اے ایس آئی اور کانسٹیبل پر کام شروع کر دیا۔ ان کا تین دن کا جسمانی ریمانڈ لیا گیا تھا۔

"تم دونوں کا تعلق پولیس سے ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ پولیس والے کسی ملزم کی زبان کھلوانے کے لئے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں لیکن میرا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ یہ وارداتیں کب سے کر رہے ہو اور تمہارے ساتھ دوسرے کون لوگ ہیں۔" شجاعت علی نے اے ایس آئی بشیر کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں۔" اے ایس آئی بشیر نے جواب دیا۔ "میں نے خطرناک ملزموں کا تعاقب کر کے انہیں پکڑا تھا لیکن تم نے رشوت لے کر انہیں چھوڑ دیا اور مجھے اور میرے ساتھی کانسٹیبل کو رہزنی کے الزام میں گرفتار کر لیا میں تمہارے خلاف کارروائی کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔"

"اوہ!" شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ انسپکٹر رفعت یا کوئی اور پولیس آفیسر تمہیں بچا لے گا۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے شام تک کا وقت دے رہا ہوں اس کے بعد تمہیں کوئی رعایت نہیں ملے گی۔"

شجاعت علی اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے میز کی دراز کا تالا کھول کر ڈائری نکالی اور اس کے صفحات کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس ڈائری میں چند روز قبل ہلاک ہونے والے دہشت گرد ریحان کے باپ عبدالہادی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا جو ریحان کی لاش لے کر گیا تھا اور دوسرے دہشت گرد کاشف نے جو انکشافات کئے تھے۔ اس کی خاص خاص باتیں بھی اس نے اس ڈائری میں نوٹ کر رکھی تھیں۔ کاشف نے گلشن اقبال ہی کے رہنے والے اس شخص کا نام اور پتہ بتایا تھا اور یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ داؤد نامی یہ شخص بھی کبھی کبھار ان کے لئے کام کرتا تھا۔ شجاعت علی کو اگرچہ یقین تھا کہ اس پتہ پر

داؤد نام کا کوئی شخص اب نہیں ملے گا لیکن اس نے چیک کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ عبدالہادی کا پتہ فیڈرل بی ایریا کے بلاک سولہ کا تھا۔

"اے ایس آئی شاہد کہاں ہے؟" اس نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر پوچھا۔

"وہ تو موبائل پر گئے ہوئے ہیں سر۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"جیپ کھڑی ہے باہر؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"یس سر۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"کانسٹیبل علی نواز سے کہو میں باہر جیپ پر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" شجاعت علی کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ تھانے کے گیٹ سے نکل کر جیپ پر بیٹھا ہی تھا کہ کانسٹیبل علی نواز بھی دوڑتا ہوا آ گیا۔ شجاعت علی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

فیڈرل بی ایریا کے بلاک سولہ میں عبدالہادی کا مکان تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ عبدالہادی بھی گھر پر ہی موجود تھا وہ شجاعت علی کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"جی فرمائیے۔ اب کیا آپ مجھے یا میرے دوسرے بیٹے کو گرفتار کرنے آئے ہیں؟" عبدالہادی نے کہا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"میں نہیں سمجھ سکا کہ پولیس کے بارے میں آپ لوگوں میں یہ غلط تاثر کیوں پیدا ہو گیا ہے کہ وہ عوام کی دشمن ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "پولیس والے امپورٹڈ نہیں ہیں۔ ہم بھی آپ ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ہمیں آپ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس محکمے میں بڑی تعداد میں کالی بھیڑیں موجود ہیں لیکن ہر پولیس والا بے ایمان' بد دیانت اور ظالم نہیں ہے۔ مجھے افسوس تو ان والدین پر ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو اس حد تک آزادی دے رکھی ہے کہ اب وہ خود اولاد سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے بیٹے پر نگاہ رکھی ہوتی تو آج آپ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"آپ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئے ہیں۔" عبدالہادی نے اسے گھورا۔

"جی نہیں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میں ریحان کے دوستوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے زیادہ تعلقات کس قسم کے لوگوں سے ہیں؟"

"تاکہ آپ انہیں بھی کسی ناکردہ جرم میں گولی سے اڑا دیں اور اس پر ڈاکو یا دہشت گرد ہونے کا لیبل لگا کر اپنے افسران سے داد وصول کر سکیں۔" عبدالہادی نے کہا۔

"عبدالہادی صاحب۔" شجاعت علی نے اس گھورا۔ "یہ سوالات پوچھنے کے لئے آپ کو تھانے میں طلب کیا جا سکتا تھا' لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں خود یہاں آیا ہوں۔ تفتیش میرا حق ہے۔ میں آپ سے ریحان کے دوستوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر ان دوستوں کے بارے میں جو اس کے بہت قریب تھے۔"

عبدالہادی چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "میں اس کے صرف دو دوستوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ ان میں سے ایک کا نام کاشف ہے اور دوسرے کا متین' کاشف کا تو مجھے پتہ نہیں۔ وہ کہاں رہتا ہے' لیکن متین کا گھر میں نے دیکھا ہوا ہے۔ وہ جمشید روڈ پر رہتا ہے حیدر آباد کالونی میں۔"

"کیا آپ اس کے گھر جا چکے ہیں؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نہیں۔" عبدالہادی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک روز میں اپنے دوست سے ملنے حیدر آباد' کالونی گیا تھا۔ واپس آ رہا تھا کہ میں نے متین کو ایک مکان سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گود میں کوئی بچہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ میں اس وقت دوسری گلی میں مڑ رہا تھا۔"

"کیا وہ شادی شدہ ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ سیکنڈ ایئر کا طالب علم ہے۔ وہ بچہ اس کا چھوٹا بھائی یا بھانجا بھتیجا ہو سکتا ہے لیکن آج کل وہ سکھر گیا ہوا ہے۔" عبدالہادی نے جواب دیا۔

"آپ کو کیسے پتہ کہ وہ سکھر گیا ہوا ہے؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔

"چند روز پہلے ریحان فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ متین سکھر گیا ہوا ہے اس کے واپس آنے کے بعد ہی پروگرام بنایا جائے گا۔" عبدالہادی نے جواب دیا۔

"اس کے گھر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نمبر وغیرہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ویسے سمجھا سکتا ہوں۔" عبدالہادی اسے مکان کا پتہ سمجھانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "گلی کے کونے کا مکان ہے۔ اس کی ایک

نشانی یہ ہے کہ دروازے کے اوپر سیمنٹ سے ایک ستارہ بنا ہوا ہے جس پر ہلکا نیلا رنگ ہے۔"

"ٹھیک ہے بہت شکریہ۔" شجاعت علی کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ وہاں سے سیدھا گلشن اقبال میں سرکلر ریلوے لائن کے سامنے وسیم باغ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ چند سال پہلے یہاں ایک خوبصورت باغ ہوا کرتا تھا مگر باغ کی جگہ اب لاتعداد مکانوں نے لے لی تھی۔ شجاعت علی کو متین کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی لیکن مکان کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ متین کئی روز پہلے کہیں چلا گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ واپس نہیں آیا تھا۔

شجاعت علی نے متین کے مکان کی نگرانی شروع کرا دی۔ نگرانی کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جس پر پولیس اہلکار ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تین دن کی نگرانی کے بعد جو صورت حال سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اس مکان میں رہنے والی خواتین اور بچے چند روز پہلے شہر چلے گئے تھے۔ شہر میں ان کے کسی قریبی عزیز کی شادی تھی۔ متین انہیں چھوڑ کر آیا تھا اور اب وہ گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے بعض دوست اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ اس رات بھی تین دوست اس مکان میں جمع تھے۔

شجاعت علی نے اپنے ایس پی کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اس مکان پر چھاپہ مارنے کی اجازت حاصل کر لی اور پھر اس رات گیارہ بجے شجاعت علی پولیس پارٹی لے کر اس علاقے میں پہنچ گیا' لیکن پولیس موبائل جیسے ہی مکان کے سامنے رکی۔ مکان کے اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ پہلی گولی موبائل کے ڈرائیور کو لگی تھی۔ شجاعت علی اور دوسرے پولیس اہلکار موبائل سے اتر آئے اور پھر اس علاقے کی فضا زبردست فائرنگ سے گونج اٹھی۔

شجاعت علی نے موبائل سے چھلانگ لگاتے ہی ڈرائیور کو کھینچ کر اپنی طرف سے نیچے اتار لیا تھا اور گاڑی کی آڑ میں اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا سامنے والے مکان کی دیوار کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ مکان سے چلائی جانے والی گولی ڈرائیور کی ران میں لگی تھی اور خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔

"حوصلہ رکھو صاحب داد۔" شجاعت علی نے ڈرائیور کی ہمت بندھائی۔ "تم یہیں دیوار کی آڑ میں بیٹھے رہو۔ یہ لوگ بچ کر نہیں جا سکیں گے۔"

شجاعت علی دوڑتا ہوا پھر موبائل کی آڑ میں پہنچ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ تمام کانسٹیبل مختلف جگھوں پر پوزیشن لے کر مکان پر فائرنگ کر رہے تھے۔ آس پاس کے تمام مکان تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی لوگوں نے بتیاں بجھا دی تھیں۔

مکان سے آٹومیٹک رائفلوں سے زبردست فائرنگ کی جا رہی تھی۔ پولیس موبائل کے آتے ہی مکان سے جس طرح فائر کھول دیا گیا تھا اس سے شجاعت علی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ لوگ پہلے سے ہوشیار تھے۔

شجاعت علی کچھ دیر تک موبائل کی آڑ میں کھڑا رہا پھر اس نے موبائل کا دروازہ کھول کر ڈیش بورڈ کے خانے میں نصب وائرلیس کا ریسیور اٹھا لیا وائرلیس آن تھا اور ایمرجنسی کنٹرول روم سے جوہر آباد تھانے کے لئے کوئی پیغام نشر ہو رہا تھا۔ شجاعت علی نے ریسیور اٹھانے کے ساتھ ہی وائرلیس کا ایک بٹن بھی دبا دیا تھا۔ وہ ریسیور لے کر گاڑی کے باہر ہی جھک کر بیٹھ گیا اور ایمرجنسی کنٹرول روم کو اپنی لوکیشن اور پوزیشن بتا کر کمک کے لئے کال نشر کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت مکان سے چلائی جانے والی دو تین گولیاں ونڈا سکرین پر لگیں۔ شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ شیشے کی کرچیاں شجاعت علی کے اوپر گریں' وہ کچھ اور نیچے جھک گیا۔

پیغام نشر کرنے کے بعد اس نے وائرلیس کا ریسیور باہر ہی لٹکا چھوڑ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف ایک مکان کے صحن والی دیوار کی آڑ میں دو پولیس اہلکار پوزیشنز لئے فائرنگ کر رہے تھے۔ ان میں ایک ہیڈ کانسٹیبل صغیر تھا اور دوسرا کانسٹیبل کرم علی۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد شجاعت علی دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی وقت لاتعداد گولیاں سڑک پر اسی جگہ لگی تھیں جہاں شجاعت علی کا آخری قدم پڑا تھا۔ اگر اسے چھلانگ لگانے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم ان گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔

"صغیر!" شجاعت علی نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس مکان کی پچھلی دیوار پر چڑھ کر چھت پر پہنچنے کی کوشش کرو اور کرم علی تم بائیں طرف اس مکان کی چھت پر چلے جاؤ۔" اس نے بائیں طرف والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اس پڑوس والے مکان کی چھت پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہم تین اطراف سے

انہیں گھیرنے کی کوشش کریں گے کسی کو بچ کر نہیں جانا چاہئے جو بھی فرار ہونے کی کوشش کرے' بھون ڈالو اسے۔"

شجاعت علی نے دوسرے کانسٹیبلوں کو بھی چیخ کر فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دیا اور ہیڈ کانسٹیبل صغیر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا اس مکان کے پچھلی طرف جا رہا تھا وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوا شجاعت علی نے کانسٹیبل کرم علی کو اشارہ کیا۔ اس کا ٹاسک خطرناک تھا' اسے سڑک پر سے ہو کر اس مکان تک جانا تھا جہاں سے وہ دہشت گردوں کو گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے دہشت گردوں والے مکان کی طرف دیکھا اس کے پاس آٹومیٹک رائفل تھی ایک میگزین فٹ تھا' دوسرا فاضل میگزین اس کے ساتھ ہی ڈوری سے بندھا ہوا تھا دو اور فاضل میگزین اس کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے تھے۔ وہ دہشت گردوں والے مکان کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے اس مکان کی طرف دوڑا جس کی چھت پر اسے پہنچنا تھا۔

کرم علی کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی وہ بے تحاشا فائرنگ کرتا ہوا مطلوبہ مکان کی دیوار کی آڑ میں پہنچ گیا اور دوڑتا ہوا مکان کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔

اب شجاعت علی کی باری تھی' اسے دہشت گردوں کے مکان کے پڑوس والے مکان کی طرف پہنچنا تھا اس کا منصوبہ یہ تھا کہ گلی سے اور دو مکانوں کی چھتوں سے فائرنگ جاری رکھی جائے اور وہ خود پڑوس والے مکان کی چھت سے دہشت گردوں کے مکان کی چھت پر کود جائے اس کا ٹاسک سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس ے دائیں بائیں دیکھا' وہ جس مکان کی آڑ میں تھا اس کی چھت سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل صغیر اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تھوڑی ہی دیر بعد کانسٹیبل کرم علی بھی دوسرے مکان کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ شجاعت علی نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود بھی فائرنگ کرتا ہوا اپنی کمین گاہ سے نکل کر سامنے والے مکان کی طرف دوڑا۔ ابھی وہ گلی کے وسط میں تھا کہ ایک گولی زناٹے کی آواز سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس نے چھلانگ لگا دی اور سانپ کی سی تیزی سے رینگتا ہوا مکان کی دیوار کے قریب پہنچ گیا وہ بڑی احتیاط سے کام لیتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا' اس نے ریوالور ہولسٹر میں اڑس لیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پہ جما کر اوپر چڑھ کر بڑی پھرتی سے دوسری طرف کود گیا' اس نے سنبھلتے ہی ریوالور دوبارہ

ہاتھ میں لے لیا تھا' اس کے کودنے سے دھب کی آواز ابھری تھی' مکان اگرچہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اندر سے ایک دم چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ شجاعت علی ایک کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ریوالور کا دستہ مار کر ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اندر سے چیخوں کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی۔ عورتیں مرد اور بچے شاید اس کمرے میں جمع تھے۔

"ڈریئے نہیں۔" شجاعت علی نے ٹوٹے ہوئے شیشے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں پولیس آفیسر ہوں۔ ساتھ والے مکان میں دہشت گرد موجود ہیں۔ پولیس نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ مجھے آپ چھت پر جانے کا راستہ بتائیے۔ میں اوپر سے اس مکان کی چھت پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ ڈریئے نہیں' آپ لوگوں کو کچھ نہیں ہو گا۔"

عورتوں اور مردوں نے چیخنا بند کر دیا مگر بچے بدستور اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ ایک آدمی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ شجاعت علی اندر داخل ہو گیا۔ اس آدمی نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

"اس طرف آؤ صاحب۔" اس آدمی نے کہا۔ "خدا غارت کرے ان دہشت گردوں کو۔ مجھے ان کے لڑکے پر پہلے ہی شبہ تھا۔ بالکل آوارہ اور بدمعاش لگتا ہے۔ ادھر آیئے۔ میں آپ کو اوپر جانے کا راستہ بتاتا ہوں۔"

وہ شخص کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر راہداری میں آ گیا۔ راہداری کے اختتام پر پچھلی طرف نکلنے والا دروازہ تھا اور اس کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اس کمرے میں محدود رہئے اور اپنے آپ کو کھڑکیوں سے نیچے رکھئے۔" شجاعت علی نے کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ راہداری میں بلب جل رہا تھا اس کی روشنی باہر سے نہیں دیکھی جا سکتی تھی لیکن سیڑھیوں پر مدھم سی روشنی موجود تھی' سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کی شیٹ کا دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ شجاعت علی نے وہ دروازہ کھول دیا اور باہر نکل کر سینے کے بل چھت پر رینگتا ہوا اس کنارے کی طرف بڑھنے لگا جو دہشت گردوں کے مکان کی طرف تھا۔ چھت کے کنارے پر تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی منڈیر تھی۔ منڈیر کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس

لمحے اسے بیک وقت دو چیخیں سنائی دیں ایک چیخ دہشت گردوں والے مکان سے ابھری تھی اور دوسری سامنے والے مکان کی طرف سے۔ شجاعت علی نے منڈیر سے اوپر اٹھ کر دیکھا سامنے والی چھت پر ہیڈ کانسٹیبل صغیر تھا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر وہ چھت پر گر گیا۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے گولی لگی تھی۔

شجاعت علی نے کھڑے ہو کر دوسری طرف جھانکا۔ دہشت گردوں والے مکان کی چھت تقریباً تین فٹ نیچے تھی وہ دوسری چھت پر کودنا ہی چاہتا تھا کہ اس مکان کے زینے سے دو آدمی دوڑتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک اگلے مکان کی چھت کی طرف دوڑا جبکہ دوسرا اسی مکان کی چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ شجاعت علی نے مخالف سمت میں دوڑتے ہوئے آدمی کا نشانہ لے کر ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کئے۔ ایک گولی تو نہ جانے کہاں چلی گئی البتہ دو گولیوں نے اپنا ٹارگٹ تلاش کر لیا تھا۔ ایک گولی بھاگتے ہوئے دہشت گرد کی کھوپڑی میں لگی تھی اور دوسری اس کی کمر پر۔ وہ خوفناک انداز میں چیختا ہوا چھت کے کنارے پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا دہشت گرد کمرے میں گھس گیا تھا۔ یہ کمرہ کار پورچ کے اوپر بنا ہوا تھا اس نے اس کمرے کی کھڑکی سے گلی میں پولیس والوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ شجاعت علی بڑی احتیاط سے اس مکان کی چھت پر اتر گیا اور دبے قدموں کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی اس نے دو تین فٹ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ زینے پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شجاعت علی نے اِدھر اُدھر دیکھا چھت پر مختلف جگہوں پر تقریباً تین تین فٹ اونچے ستون اٹھے ہوئے تھے تاکہ اگر کبھی دوسری منزل تعمیر کرنے کی ضرورت پڑے تو یہ ستون استعمال کئے جا سکیں۔ شجاعت علی پھرتی سے ایک ستون کے پیچھے لیٹ گیا۔ سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا آدمی سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس چھت کی طرف دوڑا جہاں سے شجاعت علی آیا تھا' وہ یقیناً اس طرف سے فرار ہونا چاہتا تھا۔

"رک جاؤ۔ تم میرے ریوالور کی زد پر ہو۔ گولی مار دوں گا۔" شجاعت علی چیخا۔

وہ آدمی رک گیا اس کے ساتھ ہی اس نے مڑ کر آواز کی سمت میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ کئی گولیاں شجاعت علی کے سامنے ستون پر لگیں اور کئی اس

کے دائیں بائیں اور اوپر سے گزر گئیں۔ وہ دہشت گرد ایک بار پھر دوسری چھت کی طرف دوڑا وہ چھت تقریباً تین فٹ اونچی تھی وہ اس پر چڑھ ہی رہا تھا کہ شجاعت علی نے فائر کھول دیا ایک گولی اس دہشت گرد کی ٹانگ پر لگی' اس کے منہ سے چیخ نکلی لیکن وہ دوسری چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شجاعت نے بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور منڈیر پر چڑھتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ریوالور سے صرف دو گولیاں نکلیں تیسری مرتبہ ٹرائیگر دبنے پر گولیاں نکلنے کے بجائے ٹک کی آواز ابھر کر رہ گئی تھی۔ ریوالور خالی ہو گیا تھا لیکن اس کی چلائی ہوئی دو گولیوں میں سے ایک گولی کام کر گئی تھی۔ وہ چھت پر دوڑتے ہوئے دہشت گرد کے بازو پر لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا چھت پر ڈھیر ہو گیا۔ رائفل بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری شجاعت علی دوڑ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ زینے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شجاعت علی نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ شجاعت علی کی ہر ٹھوکر اس دہشت گرد کو ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ شجاعت علی نے اس کی رائفل اٹھا لی اور دہشت گرد کو رائفل کی زد پر لیتے ہوئے غرایا۔ "اب اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو چھلنی کر دوں گا۔"

دہشت گردوں کے مکان میں اب اوپر والے کمرے سے فائرنگ ہو رہی تھی جبکہ گلی میں موجود پولیس اہلکار بھی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ شجاعت علی اس دہشت گرد کو رائفل کی زد پر لے کر چھت کے اس کنارے پر پہنچ گیا جہاں سے اس کمرے کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ ہال میں اندھیرا تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو فائرنگ بند کر کے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔" شجاعت علی نے ایک بار پھر وارننگ دہرائی' چند سیکنڈ بعد فائرنگ بند ہو گئی۔

"ہاتھ اٹھا کر کمرے سے نکل آؤ اور چھت کے وسط میں آ کر کھڑے ہو جاؤ۔" شجاعت علی چیخا۔ "میں صرف تین تک گنوں گا اس کے بعد جو کچھ بھی ہو گا اس کا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

اس نے گنتی شروع کر دی' تین کہتے ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے کمرے سے باہر آ گیا اور چھت کے وسط میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ بدستور سر سے اوپر اٹھا رکھے تھے۔

شجاعت علی نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے زخمی دہشت گرد کو زوردار ٹھوکر ماری۔ "چلو اوئے اس چھت پر واپس چلو۔"

دہشت گرد بڑی مشکل سے اپنی جگہ سے اٹھ سکا تھا۔ اس کی ٹانگ اور بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ منڈیر پر چڑھنے اور دوسری طرف آنے میں اسے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ شجاعت علی نے بھی اس سے پہلے ہی دوسری چھت پر چھلانگ لگا دی۔

"پرویز!" شجاعت علی ایک کانسٹیبل کا نام لے کر چیخا۔ "دو آدمیوں کو باہر چھوڑ دو اور باقی اندر آ جاؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد چار کانسٹیبل اوپر آ گئے۔ انہوں نے دونوں دہشت گردوں کو باندھ کر ڈال دیا۔ شجاعت علی اس کمرے میں آ گیا۔ اس نے بتی جلائی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک بیڈ بچھا ہوا تھا جس پر غیر ملکی ساخت کی ایک آٹومیٹک رائفل پڑی تھی۔ لاتعداد خالی کارتوس بستر پر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ بیڈ کے ساتھ ہی لکڑی کی ایک الماری ایستادہ تھی۔ ایک طرف چھوٹی ٹیبل اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میز پر کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ شجاعت علی نے الماری کھولنا چاہی مگر وہ مقفل تھی۔ اس نے اپنے قریب کھڑے کانسٹیبل کو اشارہ کیا اس نے رائفل کے دستے سے ضربیں لگا کر الماری کا تالا توڑ دیا۔ الماری کھلتے ہی شجاعت علی کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ اس کے ایک خانے میں چار ہینڈ گرنیڈ' چھ ریوالور' آٹھ ٹی ٹی پستول رکھے ہوئے تھے۔ ایک اور خانے میں دو جدید ترین وائرلیس سیٹ بھی نظر آئے۔ سب سے نچلے خانے میں چھ کلاشنکوف' رائفلیں اور کئی میگزین رکھے ہوئے تھے۔ شجاعت علی نے پلنگ کے نیچے جھانکا۔ لکڑی کی ایک لمبی سی پیٹی نظر آئی اس پیٹی میں بھی تالا لگا ہوا تھا' رائفل کی ایک ہی ضرب سے تالا ٹوٹ گیا۔ پیٹی میں ایک لائٹ مشین گن کھلی ہوئی پڑی تھی۔

"تم یہیں رکو' میں نیچے جا رہا ہوں۔" شجاعت علی کانسٹیبل کو وہیں رکھنے کا کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسرے پولیس اہلکار ابھی چھت پر ہی تھے۔ شجاعت علی نے ایک اور کانسٹیبل کو چھت پر چھوڑ دیا اور دوسرے کانسٹیبلوں اور دونوں دہشت گردوں کو لے کر نیچے آ گیا۔ روشنی میں آ کر زخمی دہشت گرد کی شکل دیکھتے ہی وہ چونک گیا' وہ کاشف تھا جسے چند روز پہلے انسپکٹر ولاور نے چھوڑ دیا تھا۔

نیچے آتے ہی ایک اور صورت حال دیکھ کر شجاعت علی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

نیچے تین کانسٹیبل تھے جنہوں نے گھر کا سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں ان کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل کی پتلون کی جیب سے ہزار ہزار روپے والے پرائز بانڈز کے بنڈل کا ایک کونا جھانک رہا تھا جبکہ دوسرا کانسٹیبل بھی نوٹوں کی ایک گڈی جیب میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شجاعت علی نے انہیں گھورا۔

"یہ .... یہ تو سر جی ہمارا حق بنتا ہے نا۔" ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"تم لوگ محافظ ہو لٹیرے نہیں۔" شجاعت علی بولا۔ "جو کچھ بھی جیبوں میں ٹھونسا ہے نکال کر اس میز پر رکھ دو۔"

"آپ تو بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں سر!" دوسرا کانسٹیبل بولا۔ "ہم نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر اس چھاپے کو کامیاب بنایا ہے۔ ہمارا بھی تو کچھ حق.........."

"میں کہتا ہوں سب کچھ جیبوں سے نکال کر میز پر رکھ دو۔" شجاعت علی غرایا۔ ان تینوں کانسٹیبلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیبوں سے پرائز بانڈز اور کرنسی نوٹوں کے بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ شجاعت علی انہیں گھورتا ہوا صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کے قریب ایک دہشت گرد کی لاش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی شجاعت علی کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ طارق نامی وہ نوجوان تھا جس نے اسے اس رات اغوا کر کے تہہ خانے میں تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اس کے دو ناخن اکھاڑ دیئے تھے لاش کے قریب بھی ایک آٹومیٹک رائفل پڑی تھی۔ چار بلٹ پروف ہیلمٹ اور دو موبائل ٹیلیفون بھی ملے تھے۔

اس کارروائی کے پندرہ منٹ بعد پولیس کی دو موبائلز پہنچ گئیں۔ "جوانوں" نے ایک بڑے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا' ایک موبائل میں علاقے کا انسپکٹر بھی تھا' اس نے دیر سے پہنچنے کی جو وجہ بیان کی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ یعنی فائرنگ کی وجہ سے "وہ" علاقے میں نہیں آ سکے تھے۔

"یعنی پولیس کو صرف اس جگہ موجود ہونا چاہئے جہاں مکمل سکون ہو۔" شجاعت علی کے لہجے میں طنز تھا۔ "جہاں فائرنگ ہو رہی ہو وہاں سے پولیس کو دور ہی رہنا چاہئے۔"

انسپکٹر خونخوار نگاہوں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

اعلیٰ افسران کو اس آپریشن کی اطلاع ہو گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ بھی پہنچ گئے اور پریس رپورٹرز اور فوٹوگرافرز بھی۔ اس کارروائی میں پولیس ہیڈ کانسٹیبل صغیر جاں بحق اور دو کانسٹیبل زخمی ہوئے تھے۔ دہشت گردوں کے دو ساتھی مارے گئے۔ ایک زخمی ہوا تھا اور چوتھے کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ہتھیار ڈالنے والا دہشت گرد متین تھا وہی اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لیاقت آباد کے علاقے میں جا کر ایک سیاسی لیڈر کے مکان پر حملہ کرنا چاہتے تھے وہ لوگ مکان سے نکلنے ہی والے تھے کہ پولیس کی موبائل پہنچ گئی اور اس طرح مقابلہ شروع ہو گیا۔

دوسرے مکان کی چھت سے ہیڈ کانسٹیبل صغیر کی لاش بھی اتار لی گئی تھی لاشوں اور زخمی کانسٹیبلوں کو ایدھی کی ایمبولینس پر ڈال کر ہسپتال بھیج دیا گیا۔ دہشت گرد کاشف بھی اگرچہ زخمی تھا مگر شجاعت علی اسے ہسپتال بھیجنے کے بجائے تھانے لے آیا۔

انسپکٹر رفعت ابھی ابھی تھانے میں داخل ہوا تھا' اسے بھی اپنی موبائل کے وائرلیس پر اس چھاپے کی اطلاع مل چکی تھی' لیکن اس کا موڈ آف تھا کیونکہ شجاعت علی نے اسے شروع ہی سے اس چھاپے کے بارے میں لاعلم رکھا تھا اس نے تو انسپکٹر کو اس بات کی بھی ہوا نہیں لگنے دی کہ وہ متین کے بارے میں خفیہ طور پر معلومات حاصل کرتا رہا ہے۔ ایس پی سے اجازت لینے کے بعد اس نے چھاپہ مار پارٹی بھی بڑی رازداری سے ترتیب دی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے علاوہ کسی اور پر اعتماد نہیں ہے۔" انسپکٹر رفعت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مجھے صورت حال سے آگاہ رکھتے تو کیا میں تمہیں اس کارروائی کی اجازت نہ دیتا؟ کیا تمہیں اپنے آفیسروں پر بھی اعتماد نہیں رہا؟"

"اب تک پیش آنے والے حالات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے سر!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "ایک منٹ آپ میرے ساتھ آیئے۔"

وہ انسپکٹر کو لے کر اس سیل میں آ گیا جس میں زخمی دہشت گرد کاشف کو رکھا گیا تھا۔ وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی ٹانگ اور بازو سے خون رس رہا تھا۔

"اس کا نام کاشف ہے۔" شجاعت علی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میدان میں کھیلتے ہوئے ایک دینی ادارے کے بے گناہ طالب علموں پر فائرنگ کی تھی جس سے دو لڑکے جاں بحق اور کئی

زخمی ہوئے تھے اس کا ایک ساتھی مارا گیا تھا اور اسے زخمی کرنے کے بعد گرفتار کر لیا گیا تھا اس رات اس کے ساتھیوں نے اسے چھڑانے یا ختم کرنے کے لئے اس تھانے پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں اس کا ایک ساتھی اور ہمارا ایک سپاہی مارا گیا تھا اور پھر اس کے ساتھیوں نے اس رات مجھے اغوا کر لیا۔ وہ ایک تہہ خانے میں رات بھر مجھ پر تشدد کرتے رہے۔ میرے یہ دو ناخن اکھاڑ دیئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں اپنے تھانے فون کر کے کاشف کو چھوڑ دینے کو کہوں۔ پھر میں ان کے شکنجے سے کس طرح نکلا یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن دوسرے دن گیارہ بجے کے لگ بھگ جب میں تھانے پہنچا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ انسپکٹر دلاور نے اسے چھوڑ دیا تھا اس کی منطق بھی بڑی دلچسپ تھی۔ انسپکٹر دلاور کے کہنے کے مطابق یہ بے گناہ تھا اور ہم نے اسے غلطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ بے گناہ اس وقت آپ کے سامنے ہے اور وہ اسلحہ جو ڈیوٹی روم میں رکھا ہوا ہے انہی کے قبضے سے برآمد ہوا ہے۔ یہ اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ اب تک نہ جانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ آج بھی ہمیں وہاں پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو یہ لوگ نکل چکے ہوتے اور شہر کے کسی علاقے میں بے گناہوں پر گولیاں برسا رہے ہوتے۔"

انسپکٹر خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا اور پھر سیل سے باہر نکل گیا۔

"مم .... میں زخمی ہوں۔ مجھے ہسپتال بھیج دو۔" دہشت گرد کاشف نے شجاعت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے اب تک نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون بہایا ہو گا تم نے کبھی سوچا تھا کہ تڑپتے ہوئے ان لوگوں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے تم تو موت کے فرشتے بن کر ان پر جھپٹے تھے تم تو انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ہی گھر سے نکلے تھے اور آج تم خود تکلیف میں مبتلا ہو تو تمہیں ڈاکٹر اور ہسپتال یاد آ رہا ہے۔ اپنا خون بہتا دیکھ کر تمہیں خوف آ رہا ہے۔ میں تمہیں ہسپتال نہیں بھیجوں گا' تمہارے خون کا ایک ایک قطرہ اسی طرح نچڑتا رہے گا اور تم اسی طرح تڑپتے رہو گے۔"

"خدا کے لئے مجھے ہسپتال بھجوا دو .... میں مر جاؤں گا.........." کاشف نے کہا۔

شجاعت علی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سیل سے نکل آیا۔ اس نے باہر

کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے سلاخوں والا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ شجاعت علی اب اس سیل میں آ گیا جہاں متین کو رکھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ اگر آج رات نہیں تو کل تمہارا باپ' بھائی یا کوئی دیگر وارث یہاں پہنچ جائے گا اور تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے گا۔ ہمیں دھمکیاں دی جائیں گی لیکن تمہیں اب دنیا کی کوئی طاقت یہاں سے نہیں چھڑا سکے گی۔" شجاعت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تم یہ سب کچھ کس کے اشارے پر اور کب سے کر رہے ہو؟ اب تک کتنے بے گناہوں کو ہلاک کر چکے ہو؟"

"میں.........."

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" شجاعت علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم کالج کے اسٹوڈنٹ ہو' ہم نے تمہیں جھوٹے الزام میں پکڑا ہے' یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" وہ چند لمحے اس کے چہرے کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "تم لوگوں کی پشت پناہی پر کون ہے اور یہ اسلحہ کس نے فراہم کیا ہے؟"

متین نے سختی سے جبڑے بھینچ رکھے تھے' شجاعت علی کچھ دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب اس نے زبان نہیں کھولی تو اس کے ہاتھ حرکت میں آ گئے' اس کا بھرپور گھونسہ متین کے جبڑے پر پڑا تھا۔

"بولو......... میں تمہیں خاموش نہیں رہنے دوں گا۔" شجاعت علی چیخا۔

متین پھر بھی خاموش رہا۔ شجاعت علی کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اس نے متین پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دیں۔

متین' کاشف کی طرح سخت جان ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ زیادہ مار برداشت نہیں کر سکا اور پھر اس نے جو انکشافات کئے وہ بڑے ہی سنسنی خیز تھے۔ وہ دہشت گردی کی وارداتوں میں اب تک کم از کم چالیس بے گناہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے اور انہیں جس ہستی کی پشت پناہی حاصل تھی اس کا نام سن کر شجاعت علی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس کیس کی وجہ سے سب انسپکٹر شجاعت علی اس رات گھر نہیں جا سکا تھا صبح چھ

بجے وہ اس کارروائی کی رپورٹ لکھنے کے لئے بیٹھ گیا' سات بج گئے اس نے ایک سپاہی سے کہہ کر ریسٹورنٹ سے چائے منگوائی' انسپکٹر رفعت رات تین بجے اپنے گھر چلا گیا تھا اور اب آٹھ بجے سے پہلے اس کی آمد کی توقع نہیں تھی۔

سب انسپکٹر شجاعت علی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے رپورٹ لکھ رہا تھا کہ باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی' شجاعت علی سمجھا کوئی موبائل ہو گی لیکن دو منٹ بعد ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا کہ رائے دلنواز ملنے آیا ہے۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد رائے دلنواز کمرے میں داخل ہوا' وہ سرخ و سفید رنگت کا لمبا تڑنگا آدمی تھا' وہ ایک بہت بڑا زمیندار تھا' کراچی میں بھی اس کا بہت لمبا چوڑا کاروبار تھا اس نے کئی کمپنیوں میں سرمایہ لگا رکھا تھا' وہ خود سیاست میں نہیں آیا تھا لیکن سیاسی جماعتوں کو سپورٹ کرتا تھا' وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والا تھا' اس نے ہمیشہ صاحب اقتدار لوگوں کا ساتھ دیا تھا اس کے علاقے کے ایم این اے اور ایم پی اے کی کامیابی اس کی مرہون منت تھی۔ ان دونوں کے الیکشن میں رائے دلنواز نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا اس نے جو خرچ کیا تھا اس سے کئی گنا اب تک وصول کر چکا تھا۔

رائے دلنواز کمرے میں داخل ہو کر بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا' اس کا گن مین سب مشین گن کندھے سے لٹکائے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ شجاعت علی اٹھ کر گن مین کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ رائفل مجھے دے دو اور راہداری میں بینچ پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے کہتے ہوئے گن مین کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

گن مین نے رائے دلنواز کی طرف دیکھا اور خاموشی سے رائفل کندھے سے اتار کر شجاعت علی کی طرف بڑھا دی۔ شجاعت علی اپنی کرسی پر آ گیا' رائفل اس نے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھی۔

"جی رائے صاحب! فرمایئے کیسے آنا ہوا؟" اس نے رائے دلنواز کی طرف دیکھا۔

"سب انسپکٹر۔" رائے دلنواز اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔ "تم بہت بڑے افسر بن گئے ہو۔ اپنے آپ کو قانون کا مالک بنا لیا ہے' بڑے بہادر ہو' کالج کے بچوں کو گولیوں سے مار کر کہتے ہو دہشت گرد مارے ہیں جس کو چاہتے ہو پکڑ کر بند کر دیتے ہو' آخر چاہتے کیا ہو تم؟"

"میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟" شجاعت علی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے دو لڑکوں کو پکڑ کر بے قصور بند کر دیا ہے۔ ان کو چھوڑ دو' وہ کیا دہشت گردی کریں گے وہ تو کالج میں پڑھتے ہیں بچوں کے ساتھ پنگے بازی مت کرو' کوئی مردوں والا کام کرو۔" رائے دلنواز نے کہا اور واسکٹ کی اندرونی جیب سے ہزار ہزار روپے کے نوٹوں والی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ "یہ رکھ لو' کچھ اور بھی چاہئے تو بتا دینا۔"

"رائے صاحب۔" شجاعت علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس اس رائفل کا لائسنس تو ہو گا؟"

"ارے بابا ہمیں لائسنس کی کیا ضرورت ہے۔" رائے دلنواز بولا۔

"اور آپ مجھے کہتے ہیں کہ مردوں والے کام کروں؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔

"ہاں بابا' ان بچوں کے پیچھے مت پڑو کوئی مردوں والا کام کرو۔" رائے دلنواز بولا۔

"میر علی..........." شجاعت علی نے آواز دی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل فوراً ہی اندر آ گیا۔ شجاعت علی نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ناجائز اسلحہ' کار سرکار میں مداخلت' پولیس آفیسر کو رشوت کی پیشکش' گرفتار شدہ دہشت گردوں کی سرپرستی اور انہیں رہا کرانے کی کوشش' یہ چارجز ہیں جو ان پر لگائے جائیں گے۔"

"سب انسپکٹر........" رائے دلنواز کا چہرہ سرخ ہو گیا' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر شجاعت علی دھاڑا۔

"گیٹ اپ۔ تم جیسے لوگوں نے ہی اس شہر کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اٹھ جاؤ کرسی سے۔"

"شاید تمہاری شامت ہی آ گئی ہے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔" رائے دلنواز کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری وردی اتروا دوں گا۔ کھال کھنچوا دوں گا تمہاری۔"

"فی الحال تو میں تمہاری کھال کھینچوں گا۔" شجاعت علی نے کہا۔ اس دوران دو

کانسٹیبل بھی اندر آ گئے تھے۔ "ان کی جامہ تلاشی لے کر بند کر دو انہیں۔"

رائے دلنواز چیخ چیخ کر اسے برے نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا مگر پولیس والوں نے اسے اور اس کے گن مین کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا اور سب انسپکٹر شجاعت علی کرسی پر بیٹھ کر نئے سرے سے رپورٹ لکھنے لگا۔

☆======☆======☆

وہ ایک ہفتے سے باقاعدگی سے اس مسجد میں آ رہا تھا۔ وہ عشاء کی نماز اسی مسجد میں پڑھتا۔ نماز کے بعد درس ہوتا اور وہ اس درس میں بھی شریک ہوتا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آتا تھا۔ کسی کو جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اللہ کے گھر میں آنے جانے والوں کا نام پتہ نہیں پوچھا جاتا تھا۔

اس کی عمر بائیس تیئس سال رہی ہو گی۔ قد تقریباً ساڑھے پانچ فٹ' صحت مند جسم اور گوری چٹی رنگت' وہ ہمیشہ سفید اجلے لباس میں ہوتا۔ سر پر سفید دھاگے کی بنی ہوئی ٹوپی۔

وہ بڑی خوبصورت مسجد تھی۔ وسیع آنگن' سفید موزائیک کا فرش جس پر جائے نماز کی طرح نشان بھی بنے ہوئے تھے۔ صحن سے آگے خوبصورت ہال تھا جس میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہال میں داخلے کے لئے شیشے کے بڑے بڑے کشادہ دروازے تھے۔

اس روز بھی معمول کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد ہال میں قرآن حکیم کا درس ہو رہا تھا۔ اس درس میں پندرہ آدمی شریک تھے جو ایک دائرے میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہر شخص کے سامنے رحل پر قرآن شریف کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس دائرے میں سامنے مسجد کے خطیب مولوی فضل بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک آیت پڑھتے اور پھر اس کی تفسیر بیان کرتے۔ بڑا دل نشیں انداز تھا ان کا۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوتا۔

وہ خوبرو نوجوان بھی اس درس میں شریک تھا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر مختصر سی سیاہ داڑھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی رحل پر قرآن شریف کھلا ہوا رکھا تھا لیکن آج اس کے انداز میں کچھ بے چینی سی نظر آ رہی تھی۔ وہ بار بار مڑ کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگتا۔ مسجد کے صحن کے بائیں طرف وضو کرنے کی جگہ

تھی جہاں تین آدمی بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ درس میں شریک آدمیوں میں سے کسی نے اس نوجوان کی بے چینی پر توجہ نہیں دی تھی۔ چند روز پہلے دہشت گردوں نے ایک مسجد پر فائرنگ کر کے دو نمازیوں کو شہید کر دیا تھا۔ شاید اس نوجوان کی بے چینی کی وجہ ایسا ہی کوئی انجانا خوف تھا۔

سرخ رنگ کی ایک کار مسجد کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اسٹیئرنگ کے سامنے' دوسرا اس کے ساتھ والی سیٹ پر اور دو پچھلی سیٹ پر۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی نیچے اتر کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جسموں پر چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے جوتے اتارنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے شیشے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی درس میں شریک خوبرو نوجوان اٹھ کر ان کی طرف دوڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا تھا۔

”شوٹ .... فائر..........“ وہ ان چادر پوشوں کی طرف دوڑتے ہوئے چیخا۔

ان دونوں آدمیوں نے چادریں اتار دیں۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ انہوں نے رائفلیں تان لیں اور درس قرآن میں شریک آدمیوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس نوجوان نے بھی پستول سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس کے پستول سے نکلنے والی پہلی گولی خطیب مولوی فضل کے سینے میں لگی جو شخص چند منٹ پہلے نیکی کی راہ پر چلنے کا درس دے رہا تھا۔ وہ اس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

لوگ جان بچانے کے لئے اٹھ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ مگر ان بے رحم اور سفاک انسانوں نے ان کے راستے بند کر دیئے۔ وہ گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ قالین اور دیواریں خون کے چھینٹوں سے تر ہو گئیں۔

مسجد کا ہال گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے والوں کی چیخوں اور فائرنگ سے گونج رہا تھا۔ وہ تینوں بھیڑیا نما انسان ہال سے باہر آ گئے۔ ان کا ایک ساتھی کار سے اتر کر کلاشنکوف سے ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ وضو خانے میں وضو کرنے والے تینوں آدمی اٹھ کر ایک طرف دوڑے تھے۔ مگر سفاک قاتلوں نے انہیں بھی گولیوں کی باڑھ پر رکھ

لیا۔ وہ تینوں مسجد کے صحن میں مختلف جگہوں پر گرے اور مسجد کا فرش ان کے خون سے تر ہونے لگا۔

وہ تینوں دوڑتے ہوئے مسجد سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ ہوائی فائرنگ کرنے والا بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رائفل کھڑکی سے باہر نکال کر فائرنگ کرتا رہا۔ کار کا انجن پہلے ہی سے اسٹارٹ تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے حرکت میں آ کر سامنے والی گلی میں داخل ہو گئی۔

مسجد سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا چوراہا تھا جہاں دو چھوٹے ریسٹورنٹ تھے۔ پان سگریٹ کے کیبن بھی تھے اور تمام دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ بڑی رونق تھی اس چوراہے پر ایک طرف پولیس کی ایک موبائل بھی کھڑی تھی۔ شہر میں اگرچہ دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی تھیں مگر یہاں کے لوگ شاید اس لئے مطمئن تھے کہ چوک پر پولیس کی موبائل کھڑی تھی۔ ان کے محافظ موجود تھے۔

مگر.......... فائرنگ کی آواز سنتے ہی چوک پر بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ تین چار پولیس والے پان سگریٹ کے ایک کیبن کے سامنے کھڑے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے دھواں اڑا رہے تھے۔ وہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی موبائل کی طرف دوڑے۔ دوسرے ہی لمحے موبائل حرکت میں آ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ فائرنگ کی جگہ جا کر دہشت گردوں کو گولیوں سے بھون ڈالیں گے مگر پولیس موبائل تیز رفتاری سے مخالف سمت میں دوڑتی ہوئی اس علاقے سے نکل گئی۔ عوام کے محافظ اس طرح وہاں سے بھاگے تھے جیسے جہنم کی بلائیں ان کا پیچھا کر رہی ہوں۔

☆------☆------☆

ایک کروڑ کی آبادی والے اس شہر پر سکوت طاری تھا۔ ایک سنسنی خیز سناٹا تھا جس نے شہر کی فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سڑکیں ویران و سنسان اور در و دیوار سوگوار تھے۔ رات کو دہشت گردوں کی فائرنگ سے نو نمازی شہید اور کئی زخمی ہوئے تھے اور اس سے اگلے دن ایک اور مسجد پر فائرنگ کر کے تین نمازیوں کو شہید کر دیا گیا تھا اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اس مسجد سے بھی تقریباً سو گز کے فاصلے پر پولیس کی ایک موبائل موجود تھی جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی بڑی تیزی سے اس علاقے سے نکل گئی تھی

اور دہشت گرد فائرنگ کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے موٹر سائیکلوں پر فرار ہو گئے تھے۔

پولیس کسی واردات میں مجرموں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ البتہ بے گناہوں کو پکڑ کر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ قانون کے یہ محافظ اپنی جھلاہٹ مٹانے کے لئے بے گناہوں کو پکڑ کر ان پر دہشت گرد ہونے کا لیبل لگا کر عوام کے سامنے پیش کر رہے تھے لیکن عوام اتنے بے وقوف نہیں تھے۔ پولیس کے اس قسم کے ایک ڈرامے کی پول اس وقت کھل گئی جب ایک اخبار کا رپورٹر پکڑے جانے والوں میں سے ایک ملزم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

صرف تین دن پہلے پولیس کے ذرائع نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ پولیس نے دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔ ٹیلی وژن اور اخبارات کے ذریعے بھی اس کی خوب تشہیر کی گئی تھی کہ پولیس نے زبردست مقابلے کے بعد ان دہشت گردوں کو گرفتار کر کے ان کے قبضے سے کثیر تعداد میں اسلحہ' لاکھوں روپے مالیت کے زیورات' نقد رقم' ٹی وی' وی سی آر' موٹر سائیکلیں اور کاریں برآمد کر لی تھیں۔ پولیس نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اس گروہ کے سرغنہ نے قتل' ڈکیتی اور دہشت گردی کی کئی وارداتوں کا اعتراف کیا ہے لیکن تیسرے روز اخبارات میں یہ دلچسپ خبر شائع ہوئی کہ یہ سب ڈرامہ تھا۔ جن لوگوں کو ڈاکو' قاتل اور دہشت گردوں کی حیثیت سے ٹی وی پر پیش کیا گیا تھا وہ چوری اور رہزنی جیسی مختلف وارداتوں میں پکڑے جانے کے بعد عدالتوں میں سزا یافتہ تھے اور پہلے ہی جیل میں سزا بھگت رہے تھے اور وہ اسلحہ اور دیگر ساز و سامان بھی مال خانے سے نکال کر ٹی وی کیمرے کے سامنے سجا دیا گیا تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی جب اس قسم کی باتیں سنتا تو اس کا سر ندامت سے جھک جاتا لیکن اس کی نیت صاف تھی وہ ایک عہد کر کے اور ایک عزم لے کر اس محکمے میں آیا تھا اور وہ قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے اپنا کردار ادا کر رہا تھا کوئی لالچ' کوئی ترغیب اور کوئی دھمکی اس کا راستہ نہیں روک سکی تھی وہ اب تک کسی دباؤ میں نہیں آیا تھا اس نے رائے دلنواز جیسے شخص کو آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا اور اس کے خلاف باقاعدہ پرچہ کاٹ دیا تھا۔

رائے دلنواز کی گرفتاری نے پولیس کی پوری مشینری کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ ترین آفیسرز تھانے پہنچ گئے تھے رائے دلنواز کی گرفتاری کی خبر اخبارات تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شجاعت علی نے دلنواز کی طرف سے پیش کی جانے والی نوٹوں کی گڈی اور بغیر لائسنس کی رائفل ان کے سامنے رکھ دی تھی اور بڑے ٹھوس انداز میں اسے دہشت گردوں کا سرپرست قرار دیا تھا۔ یہ اطلاع چونکہ پولیس کے اعلیٰ افسران سے پہلے اخباری رپورٹرز تک پہنچ چکی تھی اور اخباری رپورٹروں نے اعلیٰ افسران پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

"کیا آئندہ بھی ایسی بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالا جائے گا یا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے گا؟"

"رائے دلنواز کے بارے میں اگر پہلے سے معلومات حاصل تھیں تو اب تک کیوں چھوڑا گیا تھا؟"

"رائے دلنواز کس کے اشارے پر یہ خونی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا؟"

اس قسم کے بہت سے سوالات تھے جنہوں نے پولیس کے اعلیٰ افسران کا ناطقہ بند کر دیا تھا سب انسپکٹر شجاعت اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اپنے خلاف اپنے ہی محکمے میں ایک محاذ کھڑا کر لیا تھا۔ اسے ان مصائب اور دشواریوں کا بھی احساس تھا جو اس کے راستے میں آنے والی تھیں۔

جبکہ پولیس افسران نے رائے دلنواز کے خلاف یہ ساری کارروائی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ساری بات اس کے گن مین پر ڈالے جانے کی پلاننگ بھی ہوئی تھی لیکن بات بہت آگے نکل چکی تھی اسے عدالت سے ضمانت پر ہی رہائی مل سکتی تھی لیکن اس کے اگلے ہی روز سب انسپکٹر شجاعت علی کا تبادلہ اندرون سندھ ایک دور دراز کے قصبے میں کر دیا گیا۔ تبادلہ اگر عام حالات میں ہوتا تو شجاعت علی کو کہیں بھی جانے میں اعتراض نہ ہوتا لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی تھی۔ اس نے اس انتقامی کارروائی کے خلاف مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور طبی بنیادوں پر دو ماہ کی چھٹی کی درخواست دے کر گھر بیٹھ گیا اس نے محکمے میں جہاں بہت سے دشمن پیدا کر لئے تھے وہاں اس کے کچھ ہمدرد بھی موجود تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے یہ ہمدرد تبادلہ رکوانے کے لئے اس کی حمایت کریں گے۔ دو دن بعد اس نے اپنے

ہمدردوں سے رابطے شروع کر دیئے اور بالآخر پندرہ دن بعد اس کے تبادلے کا حکم منسوخ ہو گیا اور اسے اُسی تھانے میں ڈیوٹی ۔کے لئے رپورٹ کرنے کو کہا گیا جہاں وہ پہلے فرائض انجام دے رہا تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی نے جس روز دوبارہ تھانے میں ڈیوٹی سنبھالی اس روز وہ رات نو بجے گھر آ گیا رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا سلطانہ سے گپ شپ کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ سلطانہ قریب بیٹھی ہوئی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ چند لمحے دوسری طرف کی آواز سنتی رہی پھر شجاعت علی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے بولی۔

"آپ کے لئے کال ہے آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

"کیا مطلب؟" شجاعت علی نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے گھورا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ آپ کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے لیکن .... بہرحال آپ بات کیجئے۔" سلطانہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

"ہیلو سب انسپکٹر شجاعت علی اسپیکنگ۔" وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

"شبینہ بول رہی ہوں۔" ریسیور پر کھنکتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "بہت اچھے جا رہے ہو' تم نے ایک ایسے شخص پر ہاتھ ڈالا ہے جس کی طرف کوئی دوسرا پولیس آفیسر انگلی اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"ایک دن تمہارا بھی یہی حشر ہو گا۔" شجاعت علی نے کہا۔ "فون کیوں کیا ہے؟"

"تمہیں ایک ٹپ دینا چاہتی ہوں۔" شبینہ نے جواب دیا۔

اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر شجاعت علی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ سلطانہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"کون تھی............؟" سلطانہ نے مسکراتی ہوئی نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"جرائم پیشہ گروہ کی ایک رکن۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "اے ایس آئی حامد حسن کے قتل میں یہ لڑکی بھی ملوث ہے۔ قاتلوں میں سے ایک کو میں نے متعلقہ علاقے کی پولیس کے حوالے کیا تھا اور یہی لڑکی پولیس والوں کو بیوقوف بنا کر حوالات

میں بند ملزم کو زہریلا کیپسول دے گئی تھی جسے کھا کر اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس لڑکی کا تعلق نوری خالد کے گروہ سے ہے۔ مجھے بڑی شدت سے اس کی تلاش ہے۔"

"آواز سے تو وہ بڑی حسین لگتی ہے۔" سلطانہ نے کہا۔

"ہاں .... وہ واقعی بہت حسین ہے مگر بڑی خطرناک............" شجاعت علی بولا۔

"اگر وہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور خود بھی کسی جرم میں ملوث ہے تو اس نے آپ کو فون کیوں کیا تھا۔ اسے تو پولیس سے دور ہی رہنا چاہئے۔" سلطانہ نے کہا۔

"شبینہ نام کی یہ لڑکی ایک دو مرتبہ پہلے بھی فون کر چکی ہے اور ایک مرتبہ تو وہ میرے سامنے آ گئی تھی۔ اتفاق ہے کہ اس روز مجھے بروقت کوئی سواری نہیں مل سکی تھی ورنہ یہ اس روز میری گرفت میں آ چکی ہوتی۔"

"اس وقت اس نے فون کیوں کیا تھا؟" سلطانہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہیروئن کے ایک بہت بڑے اسمگلر کے بارے میں اطلاع دی تھی' اس کا خیال ہے کہ اگر میں آج رات چھاپہ ماروں تو پرنس نام کا یہ اسمگلر ہمارے ہاتھ آ سکتا ہے۔"

"کیا یہ اطلاع درست ہو سکتی ہے؟ آپ کے خلاف کوئی سازش تو نہیں؟"

"یہ اطلاع درست بھی ہو سکتی ہے اور میرے خلاف سازش بھی۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ اطلاع درست ہو گی کیونکہ منشیات فروشوں کے گروہ آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ اپنے مخالفین کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکیں۔ نوری خالد اسلحہ اور منشیات کا بہت بڑا بیوپاری ہے جبکہ پرنس بھی ہیروئن کا بین الاقوامی اسمگلر ہے۔ اس کی وجہ سے نوری خالد کو اپنے کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے وہ اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔"

"ہیروئن!" سلطانہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "یہ بھی ہماری قومی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ تیرہ سال پہلے پاکستان میں کوئی ہیروئن کا نام ہی نہیں جانتا تھا اور آج تیرہ سال کے بچے بھی اس لعنت کا شکار ہو چکے ہیں کیا یہ

نہیں کہ پاکستان میں پچاس لاکھ افراد ہیروئن کے عادی ہیں۔ پاکستان میں ہیروئن کے پھیلاؤ میں بڑا ہاتھ ہمارے حکمرانوں کا ہے۔ آج تک کسی بھی حکومت نے منشیات کے خاتمے کے سلسلے میں کوئی ٹھوس پالیسی نہیں بنائی۔"

"سلطانہ!" شجاعت علی نے کہا۔ "یہ دراصل ہمارے ہی ملک کا مسئلہ نہیں ہے۔ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں تقریباً پانچ کروڑ افراد اس نشے کے عادی ہیں۔ تمام دنیا کی حکومتیں ڈرگ مافیا سے خوفزدہ ہیں یہ ڈرگ مافیا ایک طرف سادہ لوح عوام کو تباہ کر رہی ہے تو دوسری طرف منشیات سے حاصل ہونے والی آمدنی سے حکومتوں کے لئے خوفناک مسائل پیدا کر رہی ہے۔ مافیا اپنی بے حساب دولت سے اراکین اسمبلی اور حکومت کے اہم افراد پر اثرانداز ہو کر من پسند فیصلے کرواتی ہے اس طرح معاشرے پر ان کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ کئی ممالک تو مکمل طور پر ڈرگ مافیا کی گرفت میں ہیں' کولمبیا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں پچھلے بارہ سالوں میں اکتالیس ججوں اور تیس صحافیوں کو بیدردی سے قتل کیا جا چکا ہے' وہاں ڈرگ مافیا نے متوازی حکومت بنا رکھی ہے۔ اصل حکومت ان کے سامنے بے بس ہو چکی ہے۔"

"لیکن ایران کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔" سلطانہ نے کہا۔ "ایران میں اسلامی انقلاب کے آتے ہی منشیات فروشوں کے لئے سزائے موت کے قانون پر عملدرآمد شروع کر دیا لیکن پاکستان میں ہیروئن کے انسداد کے لئے کیا کام ہو رہا ہے۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔" شجاعت علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں ہیروئن کے انسداد کے لئے وہ کام نہیں ہو رہا جو ہونا چاہئے اس وقت ہمارے ملک میں سترہ ایجنسیاں منشیات فروشوں کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن اس کے باوجود ہیروئن کی وبا تیزی سے پھیل رہی ہے اور ابھی تک اسے کنٹرول کرنے کے لئے بڑی کامیابی تو درکنار کوئی واضح حکمت عملی بھی تیار نہیں کی جا سکی۔ مختلف ادارے مبینہ طور پر منشیات فروشوں کے براہ راست حصے دار ہیں۔ بعض اہلکار' افسران اور بعض سیاستدان براہ راست اس کاروبار میں ملوث ہیں' جب تک افسران' سیاستدانوں اور اہلکاروں میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک منشیات کے اس کالے دھندے پر تو کیا کسی بھی جرم پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اسلحہ اور منشیات کے اس گھناؤنے

کاروبار میں ملوث افراد دراصل انسانیت کے دشمن اور ناقابل معافی ہیں لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ جب اس دھندے میں ملوث کسی شخص کو پکڑا جاتا ہے تو بااثر لوگ اسے چھڑانے کے لئے پولیس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کی ہوس نے ہر شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ ہیروئن کے عادی افراد کے علاج معالجے کی مناسب سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ ہسپتالوں کو اس سلسلے میں جو فنڈز مہیا کئے جاتے ہیں وہ عملے کے افراد اور افسران کھا پی جاتے ہیں۔ پرائیویٹ ہسپتال اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر ہسپتال انسداد منشیات کے بجائے فروغ منشیات کا کردار ادا کر رہے ہیں۔"

"دولت کی ہوس ہمیں اس مقام پر تو لے آئی ہے اس سے آگے کیا ہو گا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔" سلطانہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

سلطانہ کے کمرے سے جانے کے بعد شجاعت علی کافی دیر تک سلطانہ کی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور اپنے تھانے کا نمبر ملانے لگا۔

"شجاعت علی بول رہا ہوں۔" اس نے کال ریسیو ہونے پر کہا۔ "اے ایس آئی شاہد کو بلاؤ۔ اگر وہ نہ ہو تو ہیڈ کانسٹیبل امجد کو بلا دو۔"

"یس سر ہولڈ رکھئے سر!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "شاہد صاحب تو موبائل پر گئے ہوئے ہیں' میں ہیڈ کانسٹیبل امجد کو بلاتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد ٹیلیفون پر ہیڈ کانسٹیبل امجد کی آواز سنائی دی۔ "جی سر! امجد بول رہا ہوں۔"

"کیا کر رہے ہو اس وقت؟" شجاعت نے پوچھا۔

"وہی چھترول سر جی!" ہیڈ کانسٹیبل امجد نے جواب دیا۔ "ایک گھریلو ملازم نقدی اور زیورات چرا کر بھاگ گیا تھا ہم نے پکڑ لیا ہے اب اس سے پوچھ رہے ہیں کہ اس نے نقدی اور زیورات کیا کئے اور یہ کہ وہ اب تک کتنی وارداتیں کر چکا ہے۔"

"یہ کام کسی اور کے سپرد کر دو اور تم بنگالی پاڑے چلے جاؤ' کالیا بنگالی جہاں کہیں بھی ہو اسے لے کر تھانے پہنچو' میں بھی ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں۔" شجاعت علی نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب' میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔" ہیڈ کانسٹیبل امجد نے جواب

یا۔

ٹھیک ہے' میں آ رہا ہوں۔" شجاعت علی نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

"ٹھیک اسی لمحے سلطانہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی' اس نے ایک کپ ھائی کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا کپ خود لے کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ارے وہ فریدہ کا کیا حال ہے۔ کئی روز سے اسے دیکھا نہیں' کیسی طبیعت ہے اس کی؟" شجاعت نے سامنے والے پڑوسی معبود علی کی بیٹی کے بارے میں پوچھا جسے اس رات ہسپتال لے کر گئے تھے۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ ذہنی طور پر کبھی ٹھیک ہو سکے گی۔" سلطانہ نے جواب دیا۔ "وہ تو بالکل عجیب سی لگتی ہے۔ اس کے چلنے پھرنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی مشینی روبوٹ ہو' بہت عجیب و غریب باتیں کرنے لگی ہے' کبھی ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگتی ہے' اس کے ماں باپ کا تو برا حال ہو رہا ہے۔"

"جوان بچی ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "انہیں صدمہ تو ہونا چاہئے۔"

"اب تو زندگی بھر کا روگ لگ گیا ہے اس بچی کو۔" سلطانہ نے جواب دیا۔ "گھر میں کوئی مہمان آتا ہے تو چیخنے لگتی ہے' اسے گھر میں آنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں چھرے اور پستول نظر آتے ہیں' لوگوں نے ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔"

"اللہ رحم کرے اس بچی پر۔" شجاعت سعلی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "ان حالات کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ ابنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں' کتنے گھر اجڑے ہیں' کتنی عورتیں بیوہ ہوئی ہیں' کتنی بہنوں کے بھائی چھنے ہیں اور کتنے بوڑھے والدین کے سامنے ان کے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں نہلایا گیا۔ کاش! یہ شہر ایک بار پھر امن کا گہوارہ بن جائے۔"

"آج ہر شخص یہی دعا مانگ رہا ہے۔" سلطانہ نے کہا۔

شجاعت علی چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں' ہو سکتا ہے واپسی میں دیر ہو جائے یا رات وہیں گزر جائے۔"

"کوئی خاص کام؟" سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی سمجھ لو۔" شجاعت علی کہتا ہو ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں آ

گیا اور دروازہ بند کر کے ڈریس تبدیل کرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ یونیفارم پہنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سروس ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کھول کر اس کے چیمبر میں گولیاں چیک کیں اور ریوالور کو ہولسٹر میں اڑس لیا' وہ ڈرائنگ روم میں سے نکل کر باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں' فائرنگ کی یہ آوازیں انچولی کی طرف آ رہی تھیں یا تو دہشت گردوں نے کہیں فائرنگ کی تھی' یا کسی پولیس پارٹی اور دہشت گردوں میں تصادم ہو گیا تھا۔

"تھوڑی دیر رک جایئے بھیا' باہر کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔" سلطانہ نے کہا۔

"فائرنگ انچولی کی طرف کہیں ہو رہی ہے اور مجھے دوسری طرف سے نکل جانا ہے' تم دروازہ بند کر لو۔" شجاعت علی کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

شجاعت علی کے جانے کے بعد سلطانہ دیر تک دروازے میں کھڑی دعائیں مانگتی رہی ابھی اگرچہ سوا دس ہی بجے تھے لیکن گلی میں سناٹا تھا' جب حالات پُرسکون تھے تو رات گیارہ بارہ بجے تک بچے گلی میں کھیلتے رہتے تھے لیکن اب تو سرِشام ہی گلیاں ویران اور سنسان ہو جاتی تھیں۔ سلطانہ اس وقت تک دروازے میں کھڑی رہی جب تک شجاعت علی نظر آتا رہا اور جب وہ موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔

شجاعت علی گلیوں میں گھومتا ہوا مین روڈ پر نصیر آباد والے اسٹاپ پر آ گیا' سڑک سنسان پڑی تھی' یہاں دو تین ریسٹورنٹ تھے جو گیارہ بارہ بجے تک کھلے رہتے تھے لیکن اس وقت ہر قسم کی دکانیں اور ریسٹورنٹ بند تھے۔ واٹر پمپ کی طرف بھی گہرا سناٹا تھا۔ انچولی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ مگر فائرنگ کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔

شجاعت علی سڑک پر تنہا کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی گاڑی ابھی تک نہیں بنی تھی۔ وہ آج بھی ورکشاپ گیا تھا۔ مکینک نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو تین دن میں گاڑی تیار کر کے اس کے حوالے کر دے گا۔ تقریباً دس منٹ بعد عائشہ منزل کی طرف سے ایک رکشا آتا ہوا دکھائی دیا۔ شجاعت علی سڑک کے وسط میں آ گیا اور رکشا کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ اتفاق سے رکشا خالی تھا۔ شجاعت علی رکشے میں بیٹھ گیا۔

"مجھے گھر جانا ہے صاحب!" رکشا ڈرائیور نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے

تاثرات نمایاں تھے۔ "شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ لالو کھیت میں زبردست فائرنگ ہو رہی ہے جب میں وہاں سے نکلا تھا تو تین آدمی مارے جا چکے تھے۔ آگے بھی کہیں فائرنگ ہو رہی ہے' آوازیں آ رہی ہیں۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"بیس نمبر میں۔ ٹیلی وژن فیکٹری کے پیچھے ایک چھوٹی سی کچی بستی ہے۔ واٹر پمپ کی چورنگی یا اس سے پہلے ہی کسی گلی سے نکل جاؤں گا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"اچھا تو ایسا کرو کہ سامنے والی گلی سے نکل چلو۔" شجاعت علی نے کہا۔ "سولہ نمبر والی چورنگی سے ہوتے ہوئے فیاض پلازہ کی طرف نکل جائیں گے میں فیاض پلازہ پر اتر جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" ڈرائیور نے رکشا اسٹارٹ کر کے سامنے والی گلی میں موڑ دیا۔

کوئی پولیس والا کسی کے ساتھ ہو تو اسے تسلی اور ڈھارس ہوتی ہے مگر رکشا ڈرائیور کچھ اور سہما سہما سا نظر آنے لگا تھا' دہشت گردی کی ان بڑھتی ہوئی وارداتوں سے لوگ پولیس والوں سے خار کھاتے تھے۔ عام تاثر یہ تھا کہ ڈکیتیوں اور دہشت گردی کی وارداتوں کا ارتکاب کرنے والوں کو پولیس کی سرپرستی حاصل ہے۔ تھانوں اور پولیس موبائلوں پر حملے عوام کے اس تاثر کا نتیجہ تھے۔ اکا دکا پولیس والے بھی مارے جا چکے تھے۔ رکشے میں پولیس کے ایک باوردی سب انسپکٹر کی موجودگی نے ڈرائیور پر کچھ اور خوف طاری کر دیا تھا۔ اسے جتنی قرآنی آیات یاد تھیں وہ دل ہی دل میں ان کا ورد کرتا رہا۔ فیاض پلازہ کے موڑ پر ڈرائیور نے رکشہ روک لیا اور جب شجاعت علی نیچے اترا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یہ لو............" شجاعت علی نے دس کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "تم بھی اپنے گھر کے قریب پہنچ گئے اور میرا کام بھی ہو گیا۔"

ڈرائیور نے نوٹ لے لیا اور رکشا آگے بڑھا دیا۔ شجاعت علی فضل مل کے سامنے رک کر کسی اور سواری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک کار میں لفٹ مل گئی جس نے اسے گلشن چورنگی پر پہنچا دیا۔ گلشن چورنگی پر اس کے تھانے کی ایک موبائل کھڑی تھی اور پولیس اہلکار آنے جانے والی گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ اس

پولیس پارٹی کا انچارج اے ایس آئی شاہد تھا' اس نے شجاعت علی کو دیکھتے ہوئے قریب آ کر سلیوٹ کیا۔

"یہ کون ہے؟" شجاعت علی نے اس کے سلیوٹ کا جواب دیتے ہوئے موبائل کی طرف اشارہ کیا جس میں جینز کی پتلون اور جیکٹ میں ملبوس ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ موبائل سے دو قدم کے فاصلے پر ایک کانسٹیبل بھی رائفل سنبھالے کھڑا تھا۔

"یہ نوجوان رکشے پر اس طرف آ رہا تھا۔" اے ایس آئی شاہد نے نیپا چورنگی کی طرف اشارہ کیا۔ "تلاشی لینے پر اس کے قبضے سے ایک عدد بغیر لائسنس ٹی ٹی پستول اور تقریباً تین ہزار روپے کی رقم برآمد ہوئی ہے۔"

"میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "ایک کانسٹیبل کو اس کے ساتھ بٹھا دو۔ جو اسے حوالات میں بند کرنے کے بعد موبائل واپس لے آئے۔"

"بہتر سر!" اے ایس آئی شاہد نے موبائل کے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ رائفل سنبھال کر موبائل کی پچھلی سیٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا جبکہ اس نوجوان کو سامنے والی سیٹ پر آگے دھکیل دیا گیا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر اس نوجوان کو حوالات میں بند کر دیا گیا اور موبائل واپس چلی گئی' شجاعت علی نے ڈیوٹی محرر سے ہیڈ کانسٹیبل امجد کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا۔

"وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔" شجاعت علی کہتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا اور میز پر رکھے ہوئے کاغذات اٹھا کر دیکھنے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہیڈ کانسٹیبل امجد' کالیا بنگالی کو لے کر آ گیا۔ کالیا بنگالی کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی مگر قد بمشکل ساڑھے چار فٹ کا ہو گا۔ سیاہ رنگت' سرخ آنکھیں جیسے وہ کسی قسم کے نشے کا عادی ہو' الجھے ہوئے بال' دائیں کان میں بندا پہن رکھا تھا' جبکہ چیک دار کپڑے کی لنگی اور میرون رنگ کی بشرٹ' پیروں میں اسفنج کی چپل تھی' منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔

"سلام صاب۔" وہ میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا کر رہے ہو تم آج کل؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔

"گارمنٹ کا کام ہے سر! آپ جانتا ہے ہم تو لیبر سپلائی کرتا ہوں اس دھندے میں چار ٹکا کما لیتا ہوں۔" کالیا بنگالی نے جواب دیا۔

"اور عورتوں کا کاروبار کون کرتا ہے؟ کتنی عورتیں منگوائی ہیں اس ہفتے تم نے؟" شجاعت علی نے اسے گھورا۔

"میں نے وہ دھندا چھوڑ دیا صاب۔" کالیا نے جواب دیا۔ "وہ اچھا کام نہیں ہے، توبہ کرلیا ہم نے۔"

"عبدالودود کو جانتے ہو؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"کون عبدالودود صاب؟" کالیا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری ہی بستی میں رہتا ہے، سنا ہے کبھی سبزی بیچنے لگتا ہے کبھی پھلوں کا ٹھیلا لگا لیتا ہے، کبھی کبھی عورتوں کے دھندے میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔" شجاعت علی بولا۔

"اب سمجھ گیا صاب! لمبا سا آدمی ہے، سلہٹ کا رہنے والا ہے، تین سال پہلے یہاں آیا تھا، شروع میں عورتوں کا دھندا کرتا تھا مگر آج کل پھلوں کا ٹھیلا لگاتا ہے، پہلے تو وہ ٹھیلا لے کر سارا دن گلشن کی گلیوں میں گھومتا تھا مگر آج کل بنگالی پاڑے والی سڑک پر کھڑا رہتا ہے۔"

"اس کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "مگر وہ بنگالی نہیں۔ بستی کے لوگ بھی نہیں جانتے کہ اس کے گھر میں کوئی مہمان چھپا بیٹھا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ وہ کوئی خطرناک مجرم ہے، تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے، اس کا حلیہ نام اور وہ کیا کرتا ہے؟ تمہیں یہ سب کچھ کل شام تک معلوم کرنا ہے اور ایک بات ذہن میں رکھنا اگر اس بارے میں کسی اور کو پتہ چلا تو تمہیں الٹا لٹکا کر کھال کھینچ دوں گا۔"

"پہلے کبھی ایسا ہوا ہے صاب!" کالیا نے جواب دیا۔ "دو سال سے آپ لوگوں کا کام کرتا ہوں، کبھی آپ لوگوں کو شکایت نہیں ہوا۔ میں کل شام اس آدمی کے بارے میں سب کچھ معلوم کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" شجاعت علی نے کہا۔

کالیا سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ شجاعت علی، شبینہ کی فراہم کردہ اطلاع کے بارے میں سوچنے لگا۔ شبینہ ہی نے فون پر اسے یہ اطلاع دی تھی کہ پرنس نامی ہیروئن کا اسمگلر بنگالی پاڑے میں عبدالودود نامی پھل فروش کے گھر میں چھپا ہوا ہے، وہ نہ صرف ہیروئن کا اسمگلر ہے بلکہ چند روز پہلے اس نے کلفٹن میں ساحل سمندر کے قریب ایک

ویران عمارت میں دو آدمیوں کو قتل بھی کر دیا تھا اور مقامی پولیس ابھی تک ان دو آدمیوں کے قتل کا معمہ حل نہیں کر سکی۔ کلفٹن کے علاقے میں واقع ویران عمارت میں ملنے والی دو لاشوں کے بارے میں اطلاع درست تھی لیکن شجاعت علی، شبینہ کی فراہم کردہ اطلاعات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شبینہ کا تعلق نوری خالد کے گروہ سے تھا اور نوری خالد اس کے خون کا پیاسا تھا، ہو سکتا ہے اسے پھنسانے کے لئے کوئی جال پھیلایا جا رہا ہو لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے وہ خود تصدیق کرلینا چاہتا تھا۔

کالیا ماضی میں غیر قانونی کاموں میں ملوث رہا تھا، اسے ایک بار تین ماہ کی سزا بھی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وہ پولیس کے لئے مخبری کا کام کرنے لگا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً پولیس کو بنگالیوں کے غیر قانونی دھندوں کے بارے میں بتاتا رہتا۔ بہت سے بنگالی عورتوں کے کاروبار میں ملوث تھے۔ کالیا کی فراہم کردہ اطلاعات پر پولیس ان کے خلاف کارروائی کرتی رہتی تھی لیکن یہ کارروائی تھانے تک ہی محدود رہتی تھی۔ بہت کم بنگالیوں کو عدالت میں پیش کیا جاتا تھا جبکہ اکثر کو تھانے میں مک مکا کر کے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ شجاعت علی کو یقین تھا کہ کالیا عبدالودود اور اس کے پُراسرار مہمان کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گا۔

پولیس کے اہلکار ان دنوں تقریباً چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دے رہے تھے، افسروں کے لئے تو خاص طور پر یہ حکم تھا کہ وہ اپنے تھانے کی حدود میں چوبیس گھنٹے گشت کریں۔ ڈی ایس پی اور ایس پی حضرات بھی رات گئے تک علاقوں کا گشت کرتے رہتے تھے۔ جرائم کے خاتمے کے لئے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے لئے پولیس کی کئی فورسز معرض وجود میں آچکی تھیں لیکن نتائج پھر بھی بہتر نہیں ہوئے تھے۔

اصل بات یہ تھی کہ دہشت گردوں کے خلاف پولیس کی حکمت عملی بے حد ناقص تھی، مختلف فورسز کے درمیان رابطے کا فقدان تھا۔ پولیس کا نیٹ ورک بے حد کمزور تھا۔ آئے دن مانیٹرنگ سیل قائم کئے جا رہے تھے اور عوام کو ہدایات کی جا رہی تھیں کہ وہ کسی بھی واردات یا کسی غیر معمولی واقعے کے بارے میں ان فون نمبرز پر اطلاع دیں۔ فوری کارروائی کی جائے گی لیکن مانیٹرنگ کا یہ طریقہ بھی غیر مؤثر ثابت ہوا تھا۔ کوئی اطلاع ملنے پر فوری کارروائی کے بجائے اطلاع دینے والے کا نام پتہ اور فون نمبر

دریافت کیا جاتا۔ پھر اس نمبر پر فون کر کے اس بات کی تصدیق کی جاتی کہ کیا واقعی اس شخص نے اطلاع دی تھی یا نہیں۔ اس کام میں اتنا وقت ضائع ہو جاتا کہ واردات کرنے والے کہیں سے کہیں نکل چکے ہوتے اور جب مانیٹرنگ سیل سے پولیس موبائلز یا دیگر فورسز کی موبائلز کو الرٹ کیا جاتا تو یہ ہوتا کہ اصل مجرم تو اس علاقے سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکا ہوتا اور پولیس عام لوگوں کو پریشان کرنا شروع کر دیتی۔ گاڑیوں کے علاوہ لوگوں کی جامہ تلاشی بھی لی جاتی اور بعض اوقات تو لوگوں کی جیبوں سے رقم نکال کر انہیں ڈرا دھمکا کر بھگا دیا جاتا۔

شجاعت علی اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ایک موبائل تھانے کے سامنے آ کر رکی۔ پولیس کی یہ گشتی پارٹی کچھ مشتبہ لوگوں کو پکڑ لائی تھی اور انہیں حوالات میں بند کیا جا رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے دروازے میں داخل ہو کر شجاعت علی کو سلیوٹ کیا۔

"آپ کو ایس ایچ او صاحب یاد کر رہے ہیں صاحب۔"

"اچھا میں آ رہا ہوں۔" شجاعت علی نے کاغذات میز پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیئے اور اٹھ کر ایس ایچ او کی طرف بڑھ گیا' اس نے اندر داخل ہوتے ہی انسپکٹر کو سلیوٹ کیا۔

"یس سر!" وہ سوالیہ نظروں سے انسپکٹر رفعت کی طرف دیکھنے لگا۔

"بلاک تیرہ کے کسی گھر میں ڈاکو گھس گئے ہیں۔ انہوں نے گھر والوں کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ موبائل لے کر فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ جاؤ۔" انسپکٹر رفعت نے کہا۔

"یس سر!" شجاعت علی سلیوٹ مار کر فوراً ہی دفتر سے باہر آ گیا۔

اس نے نصف درجن کانسٹیبل ساتھ لئے اور موبائل پر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا' موبائل کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی' وہ دس منٹ میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ڈاکو اس وقت فائرنگ کرتے ہوئے ایک پیلی ٹیکسی پر فرار ہو رہے تھے۔ شجاعت علی نے دو کانسٹیبل اس بنگلے کے سامنے اتار دیئے جہاں ڈاکہ پڑا تھا اور موبائل پر ڈاکوؤں کی ٹیکسی کا تعاقب شروع کر دیا۔ ٹیکسی کافی آگے نکل چکی تھی۔ دو پولیس والے موبائل کے کیبن کے پچھلی طرف کھڑے تھے وہ کیبن کے اوپر سے ٹیکسی پر فائرنگ کر رہے تھے۔ شجاعت علی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہیڈ

کانسٹیبل بھی رائفل کی نال کھڑکی سے نکال کر فائرنگ کر رہا تھا۔

ٹیکسی بلاک تیرہ کی طرف نکل آئی اور ریلوے پھاٹک کے قریب مسجد کے سامنے رک گئی۔ ڈاکوؤں کی تعداد چار تھی وہ ٹیکسی سے اتر کر ریلوے لائن کی طرف دوڑے ان میں سے ایک پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ وہ چیختا ہوا ریلوے لائن پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں لگی تھی اور وہ فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ پولیس والوں نے بھی موبائل سے اتر کر ڈاکوؤں کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن ڈاکو ریلوے لائن کے دوسری طرف گلیوں میں دوڑتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈاکو کی لاش اٹھا کر موبائل میں ڈال دی گئی۔ لاش کے قریب ہی ایک کلاشنکوف رائفل بھی پڑی تھی' جسے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ شجاعت علی موبائل سے اتر کر ٹیکسی کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سیٹ کے سامنے فٹ سیٹ پر ایک پستول اور نیلے رنگ کا پلاسٹک کا ایک تھیلا پڑا تھا' شجاعت علی نے دونوں چیزیں اٹھالیں' تھیلے میں اچھی خاصی نقد رقم' پرائز بانڈز اور زیورات تھے۔

وہ لوگ اس بنگلے پر پہنچے تو گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ دونوں کانسٹیبل بنگلے کے گیٹ کے سامنے رائفلیں سنبھالے کھڑے تھے اور اندر سے اونچی آواز میں رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ شجاعت علی اندر داخل ہو گیا اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا نیلا تھیلا تھا۔

برآمدے میں ایک آدمی کی لاش دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا' بچے اور عورتیں لاش کے گرد جمع تھے اور اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ ان میں تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی تھا۔ شجاعت علی نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھالیا اور لاش کو دیکھنے لگا جس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں' اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

"یہ تمہارے............"

"یہ میرے ابو ہیں۔" لڑکے نے روتے ہوئے بتایا۔ "انہوں نے بھاگتے ہوئے ایک ڈاکو کو پکڑ لیا تھا۔ اس کے ساتھی نے ابو کو مار دیا۔"

"تمہاری امی کون ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

لڑکے نے ایک ادھیڑ عمر عورت کی طرف اشارہ کیا جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ

رہی ہو گی وہ بری طرح رو رہی تھی۔ شجاعت علی کے کہنے پر لڑکا اسے بازو سے پکڑ کر لے آیا۔

"مجھے افسوس ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "ہمیں پہنچنے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ ایک ڈاکو ہمارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ دوسرے بھی بچ کر نہیں جا سکیں گے ان شاء اللہ انہیں جلد ہی تلاش کر لیا جائے گا۔ یہ تھیلا سنبھال لیجئے۔ اس میں وہ مال ہے جو ڈاکو لوٹ کر لے گئے تھے۔

عورت نے وہ تھیلا کھول کر دیکھا اور پھر اسے ایک جوان لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ عورت کوئی بات کرنے کے قابل نہیں تھی۔ البتہ لڑکا ذرا حوصلہ مند ثابت ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ دروازے کی بیل بجی تھی۔ اس کے والد نے جا کر دروازہ کھولا تو چار ڈاکو اندر گھس آئے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور تین کے پاس رائفلیں۔ انہوں نے صاحب خانہ کے علاوہ گھر کے تمام افراد کو باتھ روم میں بند کر دیا۔ صاحب خانہ کو گن پوائنٹ پر رکھ کر انہوں نے پورے گھر کی تلاشی لی اور تقریباً چار لاکھ روپے مالیت کے زیورات ڈھائی لاکھ کے پرائز بانڈ اور تقریباً دو لاکھ روپے نقد رقم لوٹ کر فرار ہو رہے تھے کہ برآمدے میں صاحب خانہ نے ہمت کر کے ایک ڈاکو کو پکڑ لیا لیکن ڈاکو کے دوسرے ساتھی نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں اور لوٹا ہوا مال لے کر فرار ہو گئے۔ غسل خانے میں بند افراد خانہ کو ان دو پولیس والوں نے نکالا تھا جنہیں شجاعت علی موبائل سے اتار کر ڈاکوؤں کے تعاقب میں گیا تھا۔

شجاعت علی نے اس گھر کے ٹیلیفون سے انسپکٹر رفعت کو صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر ایدھی سینٹر کو بھی ایمبولینس کے لئے فون کر دیا' تقریباً پندرہ منٹ بعد انسپکٹر رفعت بھی پہنچ گیا۔ اس نے موبائل میں رکھی ہوئی ہلاک ہونے والے ڈاکو کی لاش کو دیکھا۔ اس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی جیبوں سے کچھ رقم اور کاغذات برآمد ہوئے جن سے پتہ چلا کہ وہ ناظم آباد کا رہنے والا تھا۔ چہرے اور لباس سے وہ کسی اچھے گھرانے کا فرد لگتا تھا۔

"یہ کلاشنکوف ہلاک ہونے والے ڈاکو کی ہے اور یہ پستول ٹیکسی میں پڑا ہوا تھا۔" سب انسپکٹر شجاعت علی نے بتایا۔

"لوٹا ہوا مال ملا یا اس کے ساتھی لے گئے۔" انسپکٹر رفعت نے پوچھا۔

"نقد رقم' پرائز بانڈز اور زیورات سے بھرا ہوا تھیلا بھی ٹیکسی میں مل گیا تھا بدحواسی اور جان کے خوف سے وہ لوٹا ہوا مال چھوڑ گئے تھے۔" شجاعت علی نے بتایا۔

"کہاں ہے وہ تھیلا؟" انسپکٹر رفعت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ میں نے خاتون خانہ کے حوالے کر دیا ہے۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

"عجیب احمق آدمی ہو۔" انسپکٹر نے اسے گھورا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کسی ڈکیتی میں لوٹا ہوا مال واپس کرنے کے لئے ضابطے کی کارروائی ضروری ہوتی ہے؟"

"بعض ضابطوں سے کارروائی میں پیچیدگیاں ہو جاتی ہیں۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "مال فوراً ہی برآمد ہو گیا تھا جو میں نے واپس کر دیا۔"

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کارروائی مکمل کر کے لاش ہسپتال بھجوا دو۔ میں گشت پر جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد تھانے پہنچ جاؤں گا۔"

"یس سر..........." شجاعت علی نے جواب دیا۔

انسپکٹر کے جانے کے بعد شجاعت علی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے جنہیں پولیس والے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ایدھی سینٹر کی ایمبولینس بھی سائرن بجاتی ہوئی پہنچ گئی۔ دونوں لاشوں کو ایمبولینس میں ڈال دیا گیا۔ عملے کے دو آدمی اور دو پولیس کانسٹیبل ایمبولینس کے ساتھ کر دیئے گئے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد شجاعت علی اپنے ماتحتوں کو لے کر موبائل پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ ہیڈ کانسٹیبل کر رہا تھا اور شجاعت علی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا' موبائل مختلف گلیوں سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر آئی ایک موڑ پر کھڑی ہوئی سرخ رنگ کی شیراڈ کار سے موبائل پر زبردست فائرنگ شروع کر دی گئی۔ ایک گولی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی ڈرائیور اور شجاعت علی کے درمیان سے نکل گئی۔ ایک گولی پچھلی سیٹ پر ایک کانسٹیبل کے کندھے میں لگی۔ ایک گولی نے موبائل کا اگلا ٹائر برسٹ کر دیا۔ موبائل بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

شجاعت علی اور دوسرے پولیس اہلکاروں نے موبائل سے چھلانگ لگا کر پوزیشن سنبھال لی اور جوابی فائرنگ کرنے لگے لیکن اس دوران وہ ٹیکسی حرکت میں آ چکی تھی۔ ٹیکسی میں سوار حملہ آور فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ شجاعت علی نے ٹیکسی کا نمبر

دیکھ لیا تھا۔ اس نے موبائل کے وائرلیس پر فوراً ہی ایمرجنسی سینٹر کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے ٹیکسی کا نمبر بتا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایمرجنسی سینٹر سے اس ٹیکسی کو روکنے کے لئے علاقے میں موجود موبائلز کے لئے جنرل کال نشر کی جانے لگی۔

شجاعت علی کا خیال تھا کہ یہ دہشت گردوں کی کوئی اور پارٹی تھی یا وہی ڈاکو تھے جو سرکلر ریلوے لائن پار کر کے یونیورسٹی کی طرف فرار ہو گئے تھے اور وہاں سے کوئی ٹیکسی چھین کر اس طرف آ گئے تھے اور ان کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

موبائل کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ شجاعت علی نے ایک بار پھر اپنے تھانے کو اس واقعے کی اطلاع دی اور زخمی کانسٹیبل کو دیکھنے لگا گولی اس کے کندھے کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی' خون بہہ رہا تھا اور کانسٹیبل بے ہوش ہو چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد یامین آباد کی طرف سے ایک ٹیکسی کو آتے دیکھ کر شجاعت علی نے اسے روک لیا اور زخمی کانسٹیبل کو اس ٹیکسی میں ڈال کر ایک اور کانسٹیبل کے ساتھ ہسپتال روانہ کر دیا' تھوڑی ہی دیر بعد رینجرز کی ایک موبائل پہنچ گئی۔ شجاعت علی نے اپنی موبائل رسے سے رینجرز کی موبائل کے پیچھے باندھ دی اور اس طرح وہ زخمی موبائل کو کھینچتے ہوئے تھانے تک لے آئے۔ دونوں موبائلز جیسے ہی تھانے کے سامنے رکیں نیپا چورنگی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رینجرز کی موبائل فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

دو منٹ بعد وائرلیس پر اطلاع ملی کہ نیپا کے قریب یہ فائرنگ دہشت گردوں اور انسپکٹر رفعت کی گشتی پارٹی میں ہوئی تھی۔ انسپکٹر رفعت اور ایک کانسٹیبل جاں بحق ہو گئے تھے۔ دہشت گردوں کی تعداد تین تھی۔ وہ ایک ٹیکسی پر سوار تھے۔ وہ ٹیکسی چھوڑ کر سڑک پار کر کے عزیز بھٹی پارک کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ان کا ایک آدمی پولیس کی گولی سے زخمی بھی ہوا تھا۔

اس وقت تھانے میں کوئی موبائل موجود نہیں تھی' ایک آدمی اپنے گھر پر نامعلوم حملہ آوروں کی فائرنگ کی رپورٹ لکھوانے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کی گاڑی تھانے کے سامنے کھڑی تھی۔ شجاعت علی نے اس شخص سے گاڑی کی چابی لی اور جتنے کانسٹیبل اس گاڑی میں آ سکتے تھے انہیں لے کر نیپا چورنگی کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ واقعہ یونیورسٹی روڈ کے قریب پیش آیا تھا اس سڑک کے بائیں طرف ہاکی

کمپلیکس کا گراؤنڈ تھا اور ٹیکسی جنگلے کے قریب کھڑی تھی' سڑک کے دوسری طرف انسپکٹر رفعت کی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے قریب ہی انسپکٹر کی لاش پڑی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کانسٹیبل کی لاش بھی پڑی تھی' انسپکٹر رفعت کے ساتھ تین کانسٹیبل تھے جن میں سے ایک جاں بحق ہو گیا تھا۔ دوسرے کانسٹیبلوں نے بتایا کہ انہوں نے اس ٹیکسی کو مشکوک پا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا تو دہشت گردوں نے ٹیکسی روکنے کے بجائے زبردست فائرنگ شروع کر دی جوابی فائرنگ سے ایک دہشت گرد زخمی ہوا تھا لیکن وہ لوگ ٹیکسی چھوڑ کر سڑک عبور کر کے عزیز بھٹی پارک میں فرار ہو گئے۔ کانسٹیبل کے مطابق اس دہشت گرد کو بازو میں گولی لگی تھی۔

وائرلیس پر پورے علاقے کی ناکہ بندی کے احکامات جاری کر دیئے گئے پولیس کے اعلیٰ افسران اطلاع پا کر فوراً ہی موقعہ پر پہنچ گئے۔ پولیس والے دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے تو اعلیٰ افسران کیوں نہ پہنچتے۔ مرنے والے عوام میں سے ہوتے تو ان افسران کا دور دور تک کوئی پتہ نہ چلتا۔

یہ وہی ٹیکسی تھی جس سے شجاعت علی کی موبائل پر فائرنگ کی گئی تھی لیکن یہ اتنی دیر تک اس علاقے میں کیوں رہے؟ ممکن ہے راستے مخدوش پا کر وہ کسی تاریک گلی میں چھپے کھڑے ہوں اور پھر موقع پا کر اس طرف نکلنے کی کوشش کی ہو مگر یہاں بھی پولیس ان کی منتظر تھی اور اس طرح وہ ایک انسپکٹر اور ایک کانسٹیبل کو چھلنی کر کے فرار ہو گئے۔

سب انسپکٹر شجاعت علی کو فوری طور پر اپنے تھانے کا ایس ایچ او مقرر کر دیا تھا۔ ایک ہی رات میں ایک ہی علاقے میں یکے بعد دیگرے تین واقعات پیش آئے تھے جن میں ایک ڈاکو سمیت چار افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ شجاعت علی کو ایک کڑے امتحان کا سامنا تھا۔ وہ رات بھر مشتبہ افراد کی گرفتاری کے لئے مختلف مقامات پر چھاپے مارتا رہا۔ صبح چھ بجے ایک گمنام ٹیلیفون کال ملی۔ فون کرنے والے نے بتایا کہ فجر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف جا رہا تھا کہ ایک زیر تعمیر مکان میں سیمنٹ کے بلاکوں کے ڈھیر کے پیچھے ایک آدمی کو بے ہوش پڑے دیکھا اس کا بازو زخمی تھا' یہ کال عزیز بھٹی پارک کے عقب میں واقع بلاک نمبر دس سے کی گئی تھی اور اس زیر تعمیر مکان کا حدود اربعہ بھی بتایا گیا تھا۔

یہ اگرچہ شجاعت علی کا علاقہ نہیں تھا لیکن اطلاع ملتے ہی وہ چند کانسٹیبلوں کو لے کر دوڑ پڑا' اسے یقین تھا کہ یہ انہی ڈاکوؤں یا دہشت گردوں کا زخمی ساتھی ہو گا جو گزشتہ رات انسپکٹر رفعت اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر کے اس طرف فرار ہوئے تھے۔ روانگی سے پہلے اس نے متعلقہ تھانے کو بھی اطلاع دے دی تھی۔

بلاک دس کے اس بنگلے کی تعمیر غالباً کئی ہفتے پہلے چھوڑ دی گئی تھی۔ ایک طرف کنکریٹ کے بلاکس کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس ڈھیر کے پیچھے وہ آدمی اوندھا پڑا تھا جب شجاعت علی وہاں پہنچا تو تقریباً اسی وقت متعلقہ تھانے کی موبائل بھی پہنچ گئی تھی۔ اوندھے پڑے ہوئے شخص کو سیدھا کیا گیا تو وہ سب اچھل پڑے۔ اس کے پیٹ میں بھی گولی لگی تھی اور زخم سے بہنے والا خون اس کے نیچے ریت پر جما ہوا تھا اس کے ساتھی شاید اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے لیکن وہ زندہ تھا اس کی نبض بہت ہلکی چل رہی تھی۔ شجاعت علی نے اسے فوراً ہی موبائل میں ڈالا اور موبائل کو طوفانی رفتار سے ہسپتال کی طرف دوڑا دیا۔ مقامی تھانے کی پولیس پارٹی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹلی اور وہ لوگ تفتیش کے جنجال سے بچ گئے تھے۔

زخمی کو سخت پہرے میں ہسپتال چھوڑ کر شجاعت علی واپس آ گیا' رات بھر کی بھاگ دوڑ اور جاگتے رہنے سے وہ بری طرح تھک گیا تھا' وہ آرام کرنے کے لئے صرف دو گھنٹوں کے لئے گھر گیا تھا' پھر تھانے واپس آ گیا' اس روز انسپکٹر رفعت اور جاں بحق ہونے والے کانسٹیبل کے جنازوں کو بھی کندھا دیا۔

مغرب کی اذان کے آدھے گھنٹے بعد کالیا آ گیا۔

"کیا رہا؟ کچھ معلوم کیا؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"بہت کچھ معلوم کیا صاب!" کالیا نے جواب دیا۔ "عبدالودود کا مہمان بنگالی نہیں ہے۔ اس کا ٹانگ زخمی ہے' عبدالودود آج دن میں بستی کے ڈاکٹر کو لے کر گیا تھا اس کو پٹی کرنے کا سو روپیہ دیا۔ وہ ڈاکٹر بھی کیا ڈاکٹر ہے' پہلے کمپوڈر تھا پھر بہت سال پہلے اس نے بستی میں دکان کھول لیا اور ڈاکٹر بن گیا۔"

"مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ۔ اسے دیکھا ہے تُو نے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"میرا بیوی اس کا گھر گیا تھا۔" کالیا نے جواب دیا۔ "اس کمرے کا دروازہ تھوڑا

کھلا تھا' میری بیوی نے اسے دیکھ لیا' وہ گورا لمبا آدمی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "اب تم جاؤ اور رات کو ٹھیک دو بجے ہمیں بستی کی سڑک پر ہوٹل کے سامنے ملنا۔ کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔"

"جی صاب۔" کالیا سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

شجاعت علی کو یقین ہو گیا کہ شبینہ کی اطلاع درست تھی اور عبدالودود کے مکان میں ہیروئن کا اسمگلر پرنس ہی چھپا ہوا تھا اس رات ٹھیک دو بجے وہ موبائل پر پولیس پارٹی لے کر بنگالی پاڑے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ آٹھ پولیس والے تھے۔ کالیا بنگالی ہوٹل کے قریب ایک تاریک گوشے میں ان کا منتظر کھڑا تھا۔

پولیس پارٹی کالیا کی رہنمائی میں بنگالی پاڑے کی تاریک اور پُر پیچ گلیوں میں آگے بڑھنے لگی۔ بعض گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ دو آدمی بمشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ وہ ان گلیوں میں نشیب میں اترتے رہے ایک موڑ پر کالیا رک گیا۔

"اس گلی میں آخری مکان ہے' اس سے آگے والی گلی ندی تک چلی جاتی ہے۔" کالیا بنگالی نے سرگوشی میں بتایا۔

شجاعت علی اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا اور پھر وہ ایک کانسٹیبل کو لے کر دوسری گلی میں مڑ گیا' ابھی وہ چند قدم آگے بڑھے تھے کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی شجاعت علی کے ساتھی کانسٹیبل کے بازو پر لگی' وہ چیخ کر گرا' شجاعت علی نے بڑی پھرتی سے تاریکی میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی شجاعت علی بغلی گلی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ یہ گلی کچھ زیادہ ہی تنگ تھی۔ جو عبدالودود کے مکان کی پچھلی طرف سے ہو کر گزرتی تھی۔ دیوار کی آڑ میں ہوتے ہی وہ گھوم گیا۔

"کرم خان' تم ٹھیک ہو؟" اس نے سرگوشی کی۔

"میرے بازو میں گولی لگی ہے سر۔" کانسٹیبل کرم خان کی آواز سنائی دی۔

"اس گلی میں پیچھے ہٹ جاؤ اور اپنا خیال رکھو۔" شجاعت علی نے کہا۔

"یس سر! آپ میری فکر مت کریں۔" کرم خان نے جواب دیا۔

شجاعت علی اس تنگ گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ اب باقاعدہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی' عبدالودود والے مکان سے دو آدمی فائرنگ کر رہے تھے' ان میں سے

ایک کے پاس آٹومیٹک رائفل تھی اور دوسرے کے پاس غالباً ریوالور یا پستول تھا۔ جواب میں دو اطراف سے پولیس والے بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازوں سے پوری بستی کے لوگ بیدار ہو گئے تھے اور کئی گھروں سے عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

شجاعت علی دوڑتا ہوا عبدالودود کے مکان کی پچھلی طرف والے مکان کی دیوار پر چڑھ گیا اور پھر مکان کی چھت پر پہنچنے میں بھی اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مکان کی چھت ایسبٹاس شیٹس کی تھی اور اندیشہ تھا کہ اس کے بوجھ سے کوئی شیٹ ٹوٹ نہ جائے وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔

دفعتاً ایک گولی زناٹے کی آواز سے اس کے کان سے صرف دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ شجاعت علی نے لمحہ بھر کو اپنے کان پر تپش سی محسوس کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بڑی پھرتی سے چھت پر گیا اور یکے بعد دیگرے اس طرف دو فائر کر دیئے جس طرف سے اس پر گولی چلائی گئی تھی۔

"پرنس!" شجاعت علی پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ "تم پولیس کے گھیرے میں ہو۔ مقابلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔"

جواب میں فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور پھر اس کے بعد یوں لگا جیسے کوئی اونچی جگہ سے کود کر بھاگا ہو' وہ کم از کم دو آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ شجاعت علی نے چیخ کر اپنے دو آدمیوں کو عبدالودود کے مکان کو کور کرنے کا حکم دیا اور باقیوں کو نالے کی طرف جانے کا حکم دیتے ہوئے خود بھی دیوار سے کود کر گلی میں آ گیا اور نشیب کی طرف دوڑنے لگا۔ تاریکی میں اسے دو مرتبہ ٹھوکر لگی تھی اور وہ گرتے گرتے بچا تھا۔

اس گلی میں سے کئی گلیاں نکل رہی تھیں اور ہر گلی نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ بالآخر وہ بستی کے آخر میں گندے نالے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی وقت دو کانسٹیبل بھی ایک گلی سے نکل کر وہاں پہنچ گئے۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ مگر کوئی سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"تم اس طرف جاؤ اور تم اس طرف گلی میں دیکھو۔" شجاعت علی نے دونوں کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔

"وہ .... وہ رہا .... نالے میں۔" ایک کانسٹیبل چیخا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فائر کھول دیا تھا۔

شجاعت علی نے نالے کی طرف دیکھا۔ نالے کے دونوں کناروں پر اندر تک کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ پانی کی گزرگاہ صرف پندرہ بیس فٹ چوڑی رہ گئی تھی۔ ایک انسانی سایہ پانی کے دوسرے کنارے پر اٹھ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اب تک شاید رینگتا ہوا پانی میں سے گزرتا رہا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں نظر نہیں آ سکا تھا لیکن پانی سے باہر نکلنے کے لئے وہ جیسے ہی پیروں پر کھڑا ہوا سپاہی کی نظروں میں آ گیا اور سپاہی نے آٹومیٹک رائفل کا فائر کھول دیا اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک بھیانک چیخ بھی گونجی تھی اور وہ شخص شڑاپ کی آواز سے پانی میں گر گیا تھا۔

ابھی تک صرف ایک آدمی ان کی نظروں میں آیا تھا جو گولی کا نشانہ بن گیا تھا جبکہ دوسرا آدمی ابھی تک نظر نہیں آیا تھا اور یہ بھی علم نہیں تھا کہ گولی کا نشانہ بننے والا کون تھا۔ ہیروئن کا اسمگلر پرنس یا اسے پناہ دینے والا بنگالی عبدالودود۔

اس دوران ایک کانسٹیبل اور پہنچ گیا۔ وہ شجاعت علی کے قریب ہو کر بولا۔ "مکان میں عبدالودود کی بیوی کے سوا اور کوئی نہیں ہے سر! ایک کانسٹیبل وہاں رک گیا ہے۔"

"وہ دو تھے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "ایک گولی کا نشانہ بن کر نالے کے دوسرے کنارے پر گر گیا ہے۔ تم لوگ دوسرے کو تلاش کرو وہ بھی اس طرف سے بھاگنے کی کوشش کرے گا اور فیاض تم میرے ساتھ آؤ۔" شجاعت علی پانی کی طرف بڑھا۔

"گندا پانی ہے سر!" کانسٹیبل فیاض نے کہا۔ "تقریباً پچاس گز آگے پانی میں بڑے بڑے پتھر ڈال کر راستہ بنایا گیا ہے اس طرف سے چلیں۔"

"چلو.........." شجاعت علی نے جواب دیا۔

وہ تین چار منٹ میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ آدمی گولی کھانے کے بعد پانی میں گرا تھا اور اس کی ٹانگیں کنارے پر تھیں اور جسم کا باقی حصہ پانی میں تھا۔ اس کا سر بھی پانی میں ڈوبا ہوا تھا اس کے قریب ہی آٹومیٹک رائفل تھی جو آدمی پانی میں ڈوبی ہوئی

تھی اور آدمی باہر تھی۔ گندے پانی کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ شجاعت علی اور فیاض نے مل کر لاش کو پانی سے باہر نکالا۔ فیاض نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی اور اس کی روشنی میں جھک کر لاش کو دیکھنے لگا۔

شجاعت علی بھی آگے جھک گیا وہ عبدالودود تھا۔ گولی اس کی پشت پر بائیں طرف لگی تھی اور شاید دل میں پیوست ہو گئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔" شجاعت علی بڑبڑایا پھر کانسٹیبل فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہیں رکو' میں آدمیوں کو بھجواتا ہوں۔ تم اس کی لاش اٹھوا کر لے آنا۔" اس نے عبدالودود کی رائفل اٹھائی اور پتھروں والے راستے سے ہوتا ہوا واپس آ گیا۔

"دوسرے کا پتہ نہیں چلا سر!" ایک کانسٹیبل نے کہا۔ "وہ تاریکی میں کسی طرف نکل گیا ہے۔"

"اب وہ زیادہ عرصے تک آزاد نہیں رہ سکے گا۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

وہ لوگ عبدالودود کے مکان پر آ گئے۔ گلیوں میں اب بہت سے بنگالی جمع ہو چکے تھے۔

"تین چار آدمیوں کو ساتھ لے جاؤ اور نالے سے لاش اٹھوا لاؤ۔" شجاعت علی نے کہا۔

ایک کانسٹیبل تین چار بنگالیوں کو ہانکتا ہوا لے گیا۔ شجاعت علی عبدالودود کے مکان میں داخل ہو گیا اس نے اس بستی کے دو تین بنگالیوں کو ساتھ لے لیا تھا تاکہ ان کی موجودگی میں مکان کی تلاشی لی جائے۔

عبدالودود کی بیوی ایک کمرے میں چارپائی پر سہمی بیٹھی ہوئی تھی عام بنگالی عورتوں کے برعکس اس کا رنگ گورا اور چہرے کے نقوش بھی خاصے دلکش تھے اس کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ شجاعت علی نے بستی والوں کی موجودگی میں پہلے مکان کی تلاشی لی ایک صندوق میں کپڑوں کے نیچے دو آٹومیٹک رائفلیں اور دس بھرے ہوئے میگزین برآمد ہوئے۔ رائفلیں نئی تھیں اور غالباً ابھی تک استعمال نہیں ہوئی تھیں ایک اور صندوق سے ہیروئن کا ایک تھیلا برآمد ہوا اس میں تقریباً آدھا کلو ہیروئن تھی۔

"وہ آدمی کب سے یہاں چھپا ہوا تھا؟" شجاعت علی نے ودود کی بیوی سے پوچھا۔

"چھ سات دن سے۔" عورت نے جواب دیا۔ "ودود نے بتایا کہ وہ اس کا دوست ہے اور باہر سے آیا ہے۔"

"ودود تمہارا شوہر تھا یا ویسے ہی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں؟"

"میں نے اس سے شادی بنایا تھا۔ چھ مہینے پہلے۔" عورت نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کتنی شادیاں کر چکی ہو؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"پانچ۔" عورت نے جواب دیا۔ "تین سال پہلے عبدالودود ہی مجھے بنگلہ دیش سے لے آیا تھا وہ کسی سے میرا شادی بناتا پھر چھڑا لیتا۔ چھ مہینہ پہلے اس نے خود میرا ساتھ شادی بنایا تھا۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ عبدالودود یہ دھندا کرتا ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"ہاں۔" عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ مجھے دھمکی دیتا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو میرے کو مار دے گا۔ میں اس واسطے خاموش رہا میں ڈرتا تھا۔"

"اب تمہیں عبدالودود سے ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ ختم ہو چکا ہے۔"

"اوہ......... اوہ مر گیا۔" وہ عورت ایک دم چیخ اٹھی۔

"ہاں۔ وہ مر گیا ہے اور تم ہماری حراست میں ہو۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

اس دوران عبدالودود کی لاش بھی آ گئی۔ لاش کو باہر سڑک پر بھجوا دیا گیا۔ شجاعت علی نے رائفلیں میگزین اور ہیروئن اپنے قبضے میں لے کر اپنی نگرانی میں مکان کو تالا لگایا اور روتی پیٹتی بنگالی عورت کو ساتھ لے کر سڑک پر آ گیا۔ تقریباً اسی وقت ایک پیلی ٹیکسی وہاں آ کر رکی اس میں سی آئی اے کے دو آدمی تھے شجاعت علی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی شکار کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شہر میں غیر قانونی طور پر آباد بنگالیوں کی بستیاں پولیس اور سی آئی اے والوں کی شکار گاہیں تھیں وہ لوگ ان بستیوں سے بڑا مال بناتے تھے۔ شجاعت علی نے ان سے ٹیکسی لے لی۔ عبدالودود کی لاش پچھلی سیٹ پر ڈال دی گئی۔ زخمی کانسٹیبل اور اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیکسی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ موبائل میں بیٹھ جاؤ۔ چوک پر کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل جائے گی تم لوگوں کو۔" شجاعت علی نے سی آئی اے کے آدمیوں سے کہا۔

"ہماری ٹیکسی واپس آ جائے گی اور ہم یہیں رک کر اس کا انتظار کریں گے۔" ان

میں سے ایک نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" شجاعت علی نے کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا' وہ لوگ عبدالودود کی بیوی کو لے کر موبائل میں سوار ہو گئے۔ شجاعت علی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی اور موبائل حرکت میں آ گئی۔

رائے دلنواز کی طرف سے سب انسپکٹر کو مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ دیگر ذرائع سے بھی اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ ایف آئی آر میں سے رائے دلنواز کا نام نکال دیا جائے مگر ایسے لوگوں کو شجاعت علی کا ایک ہی جواب ہوتا کہ وہ نوکری تو چھوڑ سکتا ہے مگر دہشت گردوں کی سرپرستی کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتا۔

رائے دلنواز پکڑے جانے والے دہشت گردوں متین اور کاشف کو چھڑانے آیا تھا اور اس کے لئے اس نے شجاعت علی کو رشوت بھی پیش کی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ ان دہشت گردوں کو رائے دلنواز ہی کی سرپرستی حاصل تھی لیکن بہت اوپر کی سطح کے بعض حکام اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور سب انسپکٹر شجاعت علی اس کے گرد پھیلائے جال کو مزید تنگ کر رہا تھا۔ اسے اگر بعض فرض شناس اعلیٰ پولیس والوں کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو پولیس کے محکمے سے اس کی چھٹی ہو چکی ہوتی۔

دہشت گرد متین نے بھی یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ وہ لوگ دہشت گردی اور ڈکیتی کی کارروائیاں رائے دلنواز کی شہ پر کرتے رہے تھے' رائے دلنواز اگرچہ خود کبھی سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس کے احکامات ٹیلیفون پر ملتے تھے اور اسلحہ بھی اس کے آدمیوں کے ذریعے انہیں پہنچایا جاتا تھا۔

بات اب شجاعت علی کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ ڈکیتیوں' قتل و غارت اور دہشت گردی کی ان وارداتوں کے ذریعے شہر میں خوف و ہراس کیوں پھیلایا جا رہا تھا لیکن وہ کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سیاست سے بری اس دنیا میں اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بے گناہ عوام کا جس طرح خون بہایا جاتا ہے اس کی بدترین مثال ان دنوں کراچی میں دیکھنے میں آ رہی تھی۔ دنیا میں ہر جگہ ہر ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ قربانی کا بکرا عوام ہی بنتے ہیں۔ خواص میں سے کبھی کوئی نہیں مارا گیا لیکن سب انسپکٹر شجاعت علی نے طے کر لیا تھا کہ وہ رائے دلنواز نامی اس خاص بندے کو نہیں چھوڑے گا جس کے ہاتھ کئی بے گناہوں کے

خون سے رنگے ہوئے تھے مگر اس کا شمار شہر کی معزز ترین ہستیوں میں ہوتا تھا۔

دہشت گرد متین اور کاشف ریمانڈ پر تھے۔ ان کے بیانات میں ہر اس جرم کی تفصیل شامل تھی جس کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا۔ ہر واردات کی تاریخ وقت اور مقام کا حوالہ بھی دیا گیا انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ ڈکیتی دہشت گردی اور قتل و غارت گری کی یہ تمام وارداتیں انہوں نے رائے دلنواز کے کہنے پر کی تھیں اور یہ کہ ان وارداتوں میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور گرفتاری کے وقت ان کے قبضہ سے برآمد ہونے والا اسلحہ بھی انہیں رائے دلنواز کے آدمیوں نے فراہم کیا تھا۔

دو دن بعد ملزمان کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔ سب انسپکٹر شجاعت علی نے اپنا کیس تیار کر لیا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھوس دلائل کے ساتھ رائے دلنواز کی ضمانت کی منسوخی اور دوبارہ گرفتاری پر بھی زور دیا تھا۔

اس روز شجاعت علی صبح نو بجے عدالت میں پہنچ گیا تھا۔ ساڑھے نو بجے ملزمان کو عدالت میں لایا جانے والا تھا۔ شجاعت علی ایک اور انسپکٹر کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انسپکٹر سے گفتگو کرتے ہوئے بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً فائرنگ کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ انسپکٹر بھی اس کے ساتھ اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔

فائرنگ ایک تسلسل سے ہو رہی تھی۔ عدالت کے احاطے میں بھگدڑ مچ گئی لوگ بدحواسی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اسٹامپ فروش' اوتھ کمشنرز اور وکیلوں نے اپنی جو میزیں جما رکھی تھیں وہ الٹ الٹ کر گر رہی تھیں۔ لوگ جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور پھر شجاعت علی نے ان لوگوں کو دیکھ لیا جو فائرنگ کر رہے تھے اور ان لوگوں کو بھی جن پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔

حملہ آوروں کی تعداد چار تھی۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ان کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کا نشانہ وہ ملزمان تھے جنہیں پولیس عدالت میں پیش کرنے کے لئے لائی تھی۔ قیدیوں کی تعداد چھ تھی اور ان کے ساتھ پولیس کے محافظوں کی تعداد چار تھی۔ اس وقت جو منظر شجاعت علی کے سامنے تھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔

تین قیدی زمین پر پڑے تھے۔ ان کے جسم حملہ آوروں کی گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ایک پولیس اہلکار بھی چھلنی ہو گیا تھا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا اور باقی دو پولیس

والے پوزیشنز لے کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب انسپکٹر شجاعت علی ہولسٹر سے ریوالور نکالتا ہوا ایک طرف دوڑا اور ایک دیوار کی آڑ میں پوزیشن لے کر فائرنگ کرنے لگا لیکن حملہ آور فائرنگ کرتے ہوئے وکیلوں کی میز کے پچھلی طرف تین چار فٹ اونچی باؤنڈری وال کود کر عقبی سڑک پر پہنچ گئے یہاں ایک کار پہلے ہی سے موجود تھی کار کا انجن اسٹارٹ تھا اور ڈرائیور اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے تیار بیٹھا تھا۔ وہ رائفلیں کھڑکیوں سے باہر نکال کر ہوائی فائرنگ کرتے رہے۔ کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی کسی نے کار کا تعاقب نہیں کیا تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی دوڑ کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں زمین پر قیدیوں کی لاشیں گری پڑی تھیں اور پھر دو قیدیوں کے چہرے دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ متین اور کاشف تھے ان کے جسم بری طرح چھلنی تھے اور زخموں سے بہنے والا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ باقی قیدی مختلف مقدمات کے سلسلے میں عدالت میں لائے گئے تھے ان میں سے ایک کے سر میں گولی لگی تھی۔ ایک پولیس اہلکار چھلنی ہو گیا تھا اور دوسرا شدید زخمی تھا۔

وہاں قیامت کا منظر تھا۔ جو لوگ جانیں بچانے کے لئے دوڑ کر کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے وہ اب واپس آ رہے تھے لیکن ان میں سے بہت سے لوگ وہاں رکے بغیر عدالت کے احاطے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شجاعت علی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ حملہ متین اور کاشف کو ختم کرنے کے لئے کیا گیا تھا کہ وہ عدالت میں کوئی بیان نہ دے سکیں۔ حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ شجاعت علی اپنا کیس عدالت میں پیش نہیں کر سکا۔ عدالت کے احاطہ میں پیش آنے والے دہشت گردی کے اس واقعے کے بعد کیس کو ازسرنو تیار کرنے کی ضرورت تھی۔

شجاعت علی جب اپنے تھانے واپس پہنچا تو سہ پہر کے چار بج چکے تھے اس دوران عدالت میں پیش آنے والے اس سانحہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اخبارات کی سنسنی خیز سرخیوں نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔

دہشت کی فضا کچھ اور سنگین ہو گئی تھی۔ اسی روز بارہ بجے کے قریب شاہ فیصل کالونی میں بھی دہشت گردی کی ایک واردات ہوئی تھی جس میں تین بے گناہ مارے گئے تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے لوگوں کے بیانات کے مطابق دہشت گرد تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک کالونی کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے فائرنگ کرتے رہے لیکن انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

جہاں دو آدمی جمع ہوتے ان کا موضوع گفتگو یہی ہوتا........... "کراچی جل رہا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی اپنی وقعت کھو چکے تھے۔ تخریب کاری قتل و غارت، خونریزی اور دہشت گردی اس شہر کی شناخت بن چکی ہے۔ کل کا عروس البلاد آج "سٹی آف وائلنس" بن گیا ہے۔ کراچی کا ہر شہری آج اپنے مستقبل سے مایوس اور خوفزدہ ہو چکا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس شہر کی رونقیں کبھی بحال ہو سکیں گی؟ کیا یہ شہر دوبارہ امن کا گہوارہ بن سکے گا۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران کراچی میں ہزاروں بے گناہ شہری دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں مگر حکمران سب ٹھیک ہے کے بیانات سے عوام کو دھوکا دے رہے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان بیانات کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے دہشت گردی کی کوئی نئی واردات ہو جاتی ہے اور شہر میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ ایک طرف "سب ٹھیک ہے" کی گردان ہوتی ہے تو دوسری طرف ماؤں کے جگر کے ٹکڑے خون میں نہلا دیئے جاتے ہیں۔ سہاگنوں کی مانگ اجاڑ دی جاتی ہے اور کتنی ہی بہنوں کے آنچل سروں سے نوچ لئے جاتے ہیں۔

کراچی کے ہر شہری کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ ان کے دم گھٹنے لگے ہیں سڑکوں پر بے گناہوں کا بہتا خون دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ رہی ہیں ہر روز بیس بیس پچیس پچیس جنازے اٹھا کر ان کے بازو شل ہو چکے ہیں، مگر کوئی چارہ گر نہیں جو اس جاں کنی سے انہیں نکال سکے۔ نفرتوں نے چہرے مسخ اور دل سیاہ کر دیئے ہیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ صرف توڑے جانے کے لئے ہیں اور بندوقیں دوسروں کے نہیں اپنوں کے سینوں میں گولیاں اتارنے کو بے تاب ہیں۔

شجاعت علی صرف پولیس والا ہی نہیں ایک انسان بھی تھا اس کے سینے میں بھی دل تھا، شہر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ دیکھ کر اس کا دل بھی خون کے آنسو روتا تھا، وہ اپنی ہمت

اور اختیارات کی حد تک حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر قدم قدم پر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اس روز وہ تھانے میں آکر دیر تک افسردہ بیٹھا رہا آج عدالت کے احاطے میں جو کچھ بھی ہوا اس کا اسے افسوس تھا یہ کوئی پہلی مثال نہیں تھی پکڑے جانے والے دہشت گردوں کو اوپر سے دباؤ کی وجہ سے چھڑا لیا جاتا تھا یا انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے سرپرستوں کے راز فاش نہ کر سکیں اور جنہیں کسی نہ کسی طرح عدالت میں پیش کر بھی دیا جاتا تھا وہ ضمانتوں پر رہا ہو کر لاپتہ ہو جاتے اور دوبارہ خونریزی شروع کر دیتے۔

وہ دہشت گرد ابھی تک ہسپتال میں تھا جسے زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں بلاک تین کے ایک زیر تعمیر مکان سے پکڑا گیا تھا اور جس کے بارے میں شبہ تھا کہ بلاک تیرہ ڈی میں ڈکیتی، قتل اور انسپکٹر رفعت کے قتل میں بھی ملوث ہے۔ اس کا خیال آتے ہی شجاعت علی نے فون کا ریسیور اٹھا کر ہسپتال کا نمبر ڈائل کیا لائن تیسری کوشش پر مل سکی تھی۔ متعلقہ ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض اب اس قابل ہے کہ اس سے ملاقات کی جا سکے۔

شجاعت علی اپنے دو ماتحتوں کو لے کر ہسپتال پہنچ گیا اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ عدالت سے واپس آتے ہی اس نے فون کر کے ملزم کی حفاظت کے انتظامات سخت کروا دیئے تھے کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اس دہشت گرد کو بھی ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ملزم ہوش میں تھا۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ دو مسلح کانسٹیبل کمرے کے سامنے کھڑے تھے اور ایک کمرے کے اندر موجود تھا۔ شجاعت علی بیڈ کے قریب کھڑا ہو گیا اور گہری نظروں سے ملزم کی طرف دیکھنے لگا اس کی عمر تیئس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

"تمہارے ساتھی تمہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔" شجاعت علی اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "انہیں صرف اپنی زندگیاں عزیز تھیں تمہاری جان کی انہیں پروا نہیں تھی۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو تو تمہیں سلطانی گواہ بنایا جا سکتا ہے اس صورت میں تمہیں کچھ رعایت بھی مل سکتی ہے۔ بصورت دیگر تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"وہ .... وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" ملزم نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔

"وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "گلشن کے بلاک تیرہ ڈی کے مکان میں ڈکیتی کی واردات میں تم بھی شامل تھے؟"

"نہیں۔" ملزم نے نفی میں سر ہلایا۔

"موچی موڑ پر پولیس موبائل پر فائرنگ تم لوگوں نے کی تھی؟"

"ہاں۔" ملزم نے جواب دیا۔ "عجب خان ہمارے گروہ کا سرغنہ ہے۔ یہ حملہ تم پر کیا گیا تھا۔ ہم کئی روز سے موقع کی تلاش میں تھے اور بالآخر اس رات موقع مل گیا۔ ہم وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ تم اس حملہ میں ختم ہو چکے ہو گے۔ فرار ہونے کی کوشش میں ہم گلیوں میں پھنس گئے اور بالآخر پولیس کی ایک دوسری پارٹی سے سامنا ہو گیا۔ ہم ٹیکسی چھوڑ کر پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میرے پیٹ میں گولی لگی۔ میرے ساتھی مجھے لے کر کسی نہ کسی طرح بھٹی پارک کے دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے میں گر پڑا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا مگر میرے ساتھی مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔"

"مجھ پر حملہ کس کے کہنے پر کیا گیا تھا؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"یہ صرف عجب خان جانتا ہے۔" ملزم نے جواب دیا۔ "اسے کسی اور جگہ سے احکامات ملتے ہیں۔ وہ کون ہے؟ میں نہیں جانتا لیکن وہ جو کوئی بھی ہے دہشت پھیلانا چاہتا ہے اس کے لئے ہمیں پیسے دیئے جاتے ہیں۔"

"مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ کس نے کی تھی؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"عجب خان ہی کا گروہ تھا لیکن میں اس میں شامل نہیں تھا۔" ملزم نے جواب دیا۔ شجاعت علی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

"عجب خان اور اس کے ساتھیوں کے پتے بتاؤ۔ وہ کہاں مل سکتے ہیں۔"

"وہ اب تمہیں نہیں ملیں گے۔" ملزم نے جواب دیا۔ "وہ اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کورنگی میں بلال کالونی کے ایک مکان سے تمہیں اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ وہ مکان عجب خان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ کسی واردات سے پہلے ہم اس

مکان میں جمع ہو کر پلاننگ کرتے ہیں۔"

"مکان کا پتہ بتاؤ۔" شجاعت علی نے کہا۔ "اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سراج ہے۔" زخمی ملزم نے جواب دیا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بلال کالونی کے مکان کا پتہ بتا دیا۔

شجاعت علی نے ملزم کے لئے حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیئے کیونکہ اسے شبہ تھا کہ اگر عجب خان یا اس کے ساتھیوں کو پتہ چل گیا کہ سراج زندہ ہے تو وہ لوگ اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔

شجاعت علی ہسپتال سے نکل کر سیدھا ڈی ایس پی کے دفتر پہنچا اس وقت اگرچہ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے لیکن ڈی ایس پی صاحب دفتر میں موجود تھے جب سے شہر میں دہشت گردی کی وارداتوں میں اضافہ ہوا تھا ڈی آئی جی کے حکم کے مطابق تمام پولیس افسران رات گئے تک اپنے علاقوں میں موجود رہتے تھے۔

شجاعت علی فوری طور پر بلال کالونی والے مکان پر چھاپہ مارنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو سراج کے زندہ ہونے کی خبر نہیں ملی تھی تو ممکن ہے عجب خان یا اس کا کوئی ساتھی اب بھی اس مکان میں موجود ہو اس نے ڈی ایس پی کو صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر چند منٹ میں یہ بات ڈی آئی جی صاحب تک پہنچ گئی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی جا رہی تھی۔

☆------☆------☆

کورنگی کے ایک علاقے میں شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ شہر کے بعض علاقے ایسے تھے جہاں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا' رات بھر پولیس اور دہشت گردوں میں آنکھ مچولی ہوتی رہتی تھی' صبح پتہ چلتا تھا کہ اتنے افراد مارے گئے۔ اتنے زخمی ہوئے لیکن فائرنگ کرنے والوں میں سے کوئی ایک بھی پولیس کے ہاتھ نہ لگتا البتہ پولیس بعض گھروں میں گھس کر بے گناہ نوجوانوں اور بوڑھوں کو پکڑ کر لے جاتی۔ بعض اوقات تو دس گیارہ سال کی عمر کے بچوں تک کو دہشت گردی کے الزام میں پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور انہیں ان جرائم کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا جاتا جس کا یہ معصوم اور بے گناہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس رات بھی صرف ایسی ہی صورت حال تھی۔ مقامی پولیس دہشت گردوں سے

آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھی۔ ایس ایچ او اپنے صرف دو کانسٹیبل شجاعت علی کی پولیس پارٹی میں شامل کر سکا تھا۔

رات ایک بجے اس مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ شجاعت علی کا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو سراج کے زندہ ہونے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ اس وقت مکان میں دو آدمی موجود تھے۔ انہوں نے پولیس پارٹی پر فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس جدید ترین ہتھیار تھے۔

فائرنگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ مکان میں موجود دونوں آدمیوں نے فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کی مگر وہ دونوں پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ مکان کی تلاشی کے دوران چھ سب مشین گنیں' کئی میگزین اور لاتعداد گولیوں کے علاوہ ایک الماری کے خفیہ خانے سے لاکھوں روپے مالیت کے طلائی زیورات بھی برآمد ہوئے تھے جو یقیناً کسی جیولر کی دکان سے لوٹے گئے تھے۔

مارے جانے والے دہشت گردوں میں سے ایک عجب خان تھا جبکہ دوسرے کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ تلاشی کے دوران ایک موبائل ٹیلیفون بھی ملا تھا۔ پلنگ کے سرہانے طرف دیوار پر پنسل سے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ شجاعت علی نے وہ نمبر نوٹ کر لیا۔

شجاعت علی اپنی پولیس پارٹی کے ساتھ جب اپنے تھانے واپس پہنچا تو صبح ہونے والی تھی۔ اس کا جسم تھکن سے چُور ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے محرر سے کہہ کر نمریکل ٹیلیفون ڈائریکٹری منگوائی اور اس میں وہ نمبر تلاش کرنے لگا جو اس نے مکان کی دیوار سے نوٹ کیا تھا اور جب ڈائریکٹری میں وہ نمبر ملا تو وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ نمبر رائے دلنواز کا تھا۔

شجاعت علی نے اپنے افسروں کو بھی اس نمبر کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ رائے دلنواز پر اس طرح ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہے اس لئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر رائے دلنواز کے خلاف تحقیقات جاری رکھے گا وہ صبح آٹھ بجے تھانے سے نکل کر گھر آ گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی کسلمندی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔ جب وہ باتھ روم سے نکلا تو سلطانہ' ماں جی اور اس کے والد ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آج کئی روز بعد وہ اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کر

رہے تھے۔ اس دوران ڈرائنگ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ شجاعت علی اٹھنے لگا مگر سلطانہ اس سے پہلے ہی اٹھ گئی۔ "آپ ناشتہ کیجئے میں دیکھتی ہوں کون ہے۔"

سلطانہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

"میں یہ سوچ کر گئی تھی کہ آپ کے لئے کسی کا بھی فون ہو گا تو منع کر دوں گی۔" وہ شجاعت علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "فون تو آپ کے لئے ہے لیکن میں اسے منع نہیں کر سکی۔ جائیے فون پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

سلطانہ کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ دیکھ کر شجاعت علی الجھ سا گیا۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ فون کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے کسی آفیسر کی کال ہو گی اس لئے سلطانہ نے منع نہیں کیا ہو گا۔

"ہیلو۔ شجاعت علی بول رہا ہوں۔" ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

"بہت اچھے جا رہے ہیں سب انسپکٹر صاحب۔" ریسیور پر نسوانی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ "میں نے رات والے کارنامے پر مبارک باد دینے کے لئے تمہیں فون کیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" شجاعت علی بولا۔ اس نے شبینہ کی آواز پہچان لی تھی اب وہ سلطانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا۔ "یہ خبر تو ابھی کسی اخبار میں بھی نہیں چھپی۔"

"ہم جیسے لوگوں کے لئے اس قسم کی خبریں جاننے کے لئے کسی اخبار کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "بہرحال میں نے ایک خاص مقصد کے لئے فون کیا تھا۔ اس روز پرنس تمہارے ہاتھ نہیں آ سکا جس کا مجھے افسوس ہے لیکن آج رات آٹھ بجے میں تمہیں ایک اور ٹپ دوں گی۔" شبینہ نے کہا۔

"تم مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو؟ تم ایسی اطلاعات کسی اور پولیس آفیسر کو بھی دے سکتی ہو۔ مجھ پر ہی یہ مہربانی کیوں؟" شجاعت علی بولا۔

"اس لئے کہ ہر پولیس آفیسر تمہاری طرح نہیں ہے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "اور پھر تمہارے نام سے نہ جانے دل میں گدگدی سی کیوں ہونے لگتی ہے اور وہ تمہاری بہن۔ اسے میں نے دیکھا تو نہیں لیکن آواز سے لگتا ہے کہ بڑی پیاری سی لڑکی

ہو گی کبھی موقع ملا تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔"

"مطلب کی بات کرو اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ جب بھی میرے سامنے آئیں تمہیں ہتھکڑی لگانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔"

"مطلب کی بات۔" شبینہ کی آواز سنائی دی۔ "اپنا موبائل فون نمبر بھی دے دو۔ آج رات نو بجے کے بعد موبائل' گھر یا تھانے کے نمبر پر تم سے رابطہ کر کے تمہیں ایک اہم اطلاع دوں گی۔"

شجاعت علی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنا موبائل فون نمبر اسے لکھوا دیا اور فون بند کر کے دوبارہ ناشتے کی میز پر آ گیا۔

"کون تھا؟" ماں جی نے پوچھا۔ "اتنی دیر کر دی فون پر بات کرتے ہوئے تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"ایک دوست کا فون تھا۔" شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

ناشتے کے بعد سلطانہ یونیورسٹی چلی گئی اور اس کے تھوڑی دیر بعد شجاعت علی بھی تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اس نے بلال کالونی والے مکان سے ملنے والے موبائل فون کا نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تھا۔ گھر سے نکلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اس ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی کے دفتر میں موجود تھا۔ اس موبائل فون کا تعلق اسی کمپنی سے تھا۔ وہ تقریباً بیس منٹ بعد متعلقہ آفیسر تک پہنچ سکا تھا وہ کمپنی کا ایک ڈائریکٹر تھا۔

"فرمائیے آفیسر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ڈائریکٹر نے پوچھا۔

"یہ فون نمبر کس کے نام الاٹ ہوا ہے؟" شجاعت علی نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"سوری آفیسر!" ڈائریکٹر نے نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کلائنٹس کے ساتھ معاہدے کے تحت ہم اس بات کے پابند ہیں کہ ان کا نام اور پتہ کسی کو نہیں بتایا جائے گا۔"

"لیکن یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "اور جب معاملہ قومی سلامتی کا ہو تو کلائنٹس کے ساتھ آپ کے معاہدے کی پابندی ختم ہو جاتی ہے آپ ایک معزز اور محب وطن شہری ہیں' آپ کو قانون سے تعاون کرنا چاہئے ہمیں قانون کی

حفاظت کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ ہمارے پاس ایسے اختیارات بھی ہیں کہ ہم کسی بھی شخص کا پتہ حاصل کرنے کے لئے آپ کو مجبور کرسکتے ہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ یہ مسئلہ اوپر کے احکامات کے بغیر حل ہو جائے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے پلیز! میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات راز ہی میں رہے گی۔"

"مجھے کمپنی کے پریذیڈنٹ سے بات کرنی پڑے گی اور وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ آپ کو دو تین روز انتظار کرنا ہوگا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔

"معاملہ بے حد سنگین ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "آپ فون پر اپنے پریذیڈنٹ سے بات کیجئے لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ میں اس معاملے میں مکمل رازداری چاہتا ہوں۔ یہ بات آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے علم میں بھی نہیں آنی چاہئے پلیز۔"

ڈائریکٹر چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے آفیسر یہ ہے تو معاہدے کی خلاف ورزی لیکن بقول آپ کے معاملہ قومی سلامتی کا ہے اس لئے آپ کو اس نمبر کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر دوسری میز پر چلا گیا جہاں کمپیوٹر رکھا ہوا تھا وہ کچھ دیر تک کی بورڈ پر انگلیاں چلاتا رہا پھر اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ شجاعت علی بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگیا تھا۔اس کی نظریں کمپیوٹر کی اسکرین پر تھیں چند سیکنڈ بعد اسکرین پر تین چار لائنوں میں سبز حروف روشن ہوگئے۔ "یہ فون عجب خان نامی شخص کے نام ہے جو رائے دلنواز کی سفارش پر دیا گیا تھا اس کی ادائیگی رائے دلنواز نے کی تھی اور بل وغیرہ بھی وہی ادا کرتا ہے۔" ڈائریکٹر نے شجاعت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شجاعت علی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ "کیا اس کا پرنٹ مل سکتا ہے؟" اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں نہیں۔" ڈائریکٹر نے کہا اور کمپیوٹر سیٹ کے ساتھ رکھے ہوئے پرنٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے کاغذ کی ایک شیٹ پرنٹر میں سیٹ کی اور کی بورڈ پر کمانڈ دینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد پرنٹ نکل آیا۔ اس نے کاغذ شجاعت علی کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ جناب!" شجاعت علی نے کاغذ تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا اور اس سے ہاتھ ملا کر دفتر سے باہر آگیا۔

شجاعت علی ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس موبائل فون کے بارے میں معلوم ہو جانے کے بعد رائے دلنواز کے خلاف اس کا گھیرا کچھ اور تنگ ہو گیا تھا کمپیوٹر کی سلپ ایک ایسا ٹھوس ثبوت تھا جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا لیکن وہ ابھی رائے دلنواز پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ رائے دلنواز پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے خلاف اتنے ثبوت جمع کرلینا چاہتا تھا کہ وہ ان کے حصار سے نکل نہ سکے۔ رائے دلنواز کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے جبڑے بھینچ گئے۔

جب وہ اپنے پولیس اسٹیشن پہنچا تو ایک اور افسوسناک خبر اس کی منتظر تھی اس خبر کا تعلق اس کے علاقے سے نہیں تھا لیکن وہ دانت کچکچا کر رہ گیا تھا۔ اے ایس آئی شاہد نے بتایا تھا کہ خواجہ اجمیر نگری کے علاقے میں نامعلوم دہشت گردوں نے ایک مکان میں گھس کر چار بھائیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ شجاعت علی نے فون کا ریسیور اٹھا کر خواجہ اجمیر نگری میں اپنے ایک دوست کا نمبر ملایا۔ وہ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن سے بھی معلومات حاصل کرسکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہاں سے کیا جواب ملے گا اسی لئے اس نے پولیس اسٹیشن کے بجائے اپنے دوست کا نمبر ملایا تھا۔

"ہیلو انور۔" اس نے لائن ملنے پر کہا۔ "تمہارے علاقے میں کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہوا ہے اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"یہ افسوسناک واقعہ ہمارے ساتھ والی گلی میں ہوا ہے۔" انور نے جواب دیا اور پھر تفصیل بتانے لگا انور کی اطلاع کے مطابق دہشت گردوں نے اسلحہ کے زور پر مکان میں گھس کر خواتین کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور چاروں بھائیوں کو دوسرے کمرے میں لے آئے اور انہیں قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا۔ خواتین کو جب کمرے میں بند کیا گیا تو انہوں نے فون پر مقامی تھانے کو دہشت گردوں کے بارے میں اطلاع دی۔ پھر فائرنگ کی آوازیں سن کر محلے کے کئی لوگوں نے بھی پولیس کو مطلع کیا۔ دہشت گرد آدھے گھنٹے تک مکان میں خون کی ہولی کھیلتے رہے پھر فائرنگ کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے فرار ہوگئے اور پولیس تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچی تھی۔

شجاعت علی دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا بربریت کی انتہا ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر تو بے گناہ اور معصوم لوگوں کے خون کی ہولی کھیلی ہی جا رہی تھی لیکن اب نہ تو عبادت گاہیں محفوظ رہی تھیں اور نہ ہی گھر...... گھر جسے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھا

جاتا ہے غیر محفوظ ہو گئے تھے لوگ عدم تحفظ کا شکار تھے۔ وہ اپنے آپ کو کہیں بھی محفوظ نہیں سمجھتے تھے ایک گھر سے جب چار چار جنازے اٹھیں گے تو کیا قیامت کا منظر ہو گا۔ تان ساری پولیس پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ دہشت گردی کی ہر واردات کے بعد ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی تھی یہ سب کچھ پولیس کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ ایجنسیاں یہ سب کچھ کروا رہی ہیں۔ پولیس دہشت گردوں سے ملی ہوئی ہے۔

شجاعت علی تھوڑی دیر کے لئے گھر گیا تھا اس نے کھانا کھایا۔ وردی پہنی اور واپس آ گیا۔ وہ سارا دن تھانے میں مصروف رہا رات دس بجے کے قریب وہ جیپ پر اے ایس آئی شاہد اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ گشت پر تھا کہ موبائل فون پر کال ملی۔ "سرخ رنگ کی ایک شیراڈ کار کے ڈی اے اسکیم ون کے ایک بنگلے سے نکلی ہے۔" ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی کار کا نمبر بھی بتایا گیا۔ "اس کار میں اسلحہ بھرا ہوا ہے۔ یہ کار نیپا چورنگی اور موتی محل سے ہوتی ہوئی فیڈرل بی ایریا کی طرف جائے گی۔"

فون بند ہو گیا شجاعت علی اس وقت گیلانی ریلوے اسٹیشن کے سامنے والی سڑک پر تھا۔ جیپ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا اس نے جیپ کا رخ موڑا اور اسے طوفانی رفتار سے گلشن چورنگی کی طرف دوڑا دیا۔ اس نے شاہد اور کانسٹیبلوں کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

جیپ پانچ منٹ میں چورنگی پر پہنچ گئی۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں ملا تھا۔ وہ نیپا کی طرف سے آنے والی گاڑیوں کو دیکھنے لگے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد انہوں نے سرخ رنگ کی ایک کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سرخ شیراڈ کار تھی اس کی رفتار کم ہو گئی دونوں کانسٹیبل رائفلیں تانے سامنے کھڑے تھے۔ کار کا نمبر وہی تھا جو فون پر بتایا گیا تھا۔ کار جیسے ہی رکی شجاعت علی آگے آ گیا۔ اس میں دو آدمی تھے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا پچھلی سیٹ پر۔

شجاعت علی کار کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے آنے والی سفید رنگ کی ایک تیز رفتار کار نے زبردست فائرنگ شروع کر دی۔ شجاعت علی اور اس کے ساتھی ایک دم سڑک پر گر گئے۔ اگر وہ سرخ کار کی آڑ میں نہ ہوتے تو یقیناً ختم ہو چکے ہوتے سفید کار کی فائرنگ سے سرخ شیراڈ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی ختم ہو گیا تھا جبکہ ڈرائیور نے ایک زوردار جھٹکے سے کار چلا دی تھی۔ شجاعت علی اور اس کے ساتھیوں نے سڑک پر

لیٹے لیٹے فائرنگ شروع کر دی ایک گولی شیراڈ کے پچھلے ٹائر پر لگی زوردار دھماکہ ہوا۔ ٹائر پھٹ جانے سے تیز رفتار کار فٹ پاتھ سے ٹکرائی اور قلابازی کھاتی ہوئی دوسری طرف جا گری۔

شجاعت علی اور اس کے ساتھیوں نے دوڑ کر کار کو گھیرے میں لے لیا چند سیکنڈ بعد شجاعت علی آگے بڑھا اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا بائیں ہاتھ سے اس نے کار کا اسٹیئرنگ سائیڈ کا دروازہ کھولا ڈرائیور اسٹیئرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنسا ہوا تھا اس کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا اور گردن ڈھلکی ہوئی تھی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہو چکا تھا۔

سرخ شیراڈ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی سفید کار سے چلائی جانے والی گولیوں سے ہلاک ہو چکا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں ایک کھوپڑی میں اور دوسری بائیں کندھے کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کی لاش دونوں سیٹوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی اور سیٹیں خون سے تر ہو رہی تھیں۔

سب انسپکٹر شجاعت علی نے سب سے پہلے موبائل ٹیلیفون پر ایمرجنسی کو اس واقعے کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے اس سفید کار کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر اپنے تھانے کو فون کر کے موبائل منگوا لی۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ فائرنگ کی آوازیں تھانے تک ضرور سنی گئی ہوں گی کیونکہ تھانہ وہاں سے ایک فرلانگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ٹریفک بند ہو گیا تھا نیپا اور موتی محل کی طرف سے آنے والی گاڑیاں سیدھی اس سڑک پر آنے کے بجائے اطراف کی گلیوں سے نکل رہی تھیں۔ دونوں پولیس کانسٹیبل رائفلیں تانے کھڑے تھے اے اسی آئی شاہد کار میں جھانک رہا تھا اور شجاعت علی موبائل فون پر ملنے والی شبینہ کی اس کال کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے ذریعے اسے سرخ شیراڈ میں اسلحہ کی اطلاع دی گئی تھی۔

شبینہ نے اس کی ہمدرد بن کر پہلے بنگالی پاڑے میں ایک مشہور ہیروئن کے اسمگلر پرنس کی موجودگی کی اطلاع دی تھی وہ اطلاع درست ثابت ہوئی تھی مگر پرنس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہیروئن کے اسمگلر کے بارے میں اطلاع دے کر شبینہ نے گویا شجاعت علی کا اعتماد حاصل کیا تھا اور پھر اس کار میں اسلحہ کے بارے میں اطلاع دی تھی اور جب انہوں نے کار کو روکا تھا تو پیچھے سے آنے والی ایک اور کار سے ان پر

فائرنگ کر دی گئی تھی۔ شجاعت علی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا یہ جھوٹی اطلاع اسے جال میں پھنسانے کے لئے دی گئی تھی اور اس طرح اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ شجاعت علی اور اس کے ماتحتوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچ گئے تھے۔ بچنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سرخ شیراڈ ان کے اور فائرنگ کرنے والی سفید کار کے درمیان آ گئی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ بروقت سڑک پر لیٹ گئے تھے اور سرخ شیراڈ گولیوں کی زد میں آ گئی تھی۔ سرخ شیراڈ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی دو گولیاں لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا جبکہ ڈرائیور بچ گیا تھا اور اس نے شیراڈ بھگا لے جانے کی کوشش کی تھی مگر کانسٹیبلوں کی فائرنگ سے شیراڈ کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا تھا اور کار بے قابو ہو کر فٹ پاتھ سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اس طرح ڈرائیور بھی گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

ہیروئن کا اسمگلر پرنس' نوری خالد کا کاروباری رقیب تھا اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی اور پھر شجاعت علی کو سرخ شیراڈ میں اسلحہ کی موجودگی کی اطلاع دی گئی۔ شبینہ کو یقین رہا ہو گا کہ یہ اطلاع ملتے ہی وہ دوڑ پڑے گا اس طرح اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے شجاعت علی دانت کچکچا کر رہ گیا اپنے آدمیوں کا قتل یقیناً ان کے منصوبے میں شامل نہیں رہا ہو گا مگر وہ فائرنگ کی زد میں آ گئے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرخ شیراڈ والوں کو اصل منصوبے کا پتہ ہی نہ ہو۔ انہیں محض یہ ہدایت کی گئی ہو کہ انہیں کس طرف سے گزرنا ہے اور کیا کرنا ہے جبکہ ان کے تعاقب میں آنے والی سفید کار کے بارے میں اور اصل منصوبے کا انہیں بھی علم نہ ہو۔

چند منٹ بعد ہی اس کے تھانے کی ایک موبائل جائے وقوعہ پر پہنچ گئی اس کے تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی صاحب بھی آ گئے۔ شجاعت علی نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر ایمبولینس منگوالی گئی۔

اب اکا دکا گاڑیاں اس طرف آنا جانا شروع ہو گئی تھیں۔ عام گاڑیوں کے تو رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور منی بسیں چورنگی پر اسٹاپ ہونے کے باوجود رکے بغیر آگے جا رہی تھیں۔

دونوں لاشوں کو سرخ شیراڈ سے نکال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ شجاعت علی کار

کے کھلے ہوئے دروازے سے کار کے اندر جھانکنے لگا پچھلی سیٹ پر اور اس سے آگے فٹ میٹ پر خون جم چکا تھا۔ شجاعت علی نے سیٹ کے نچلے کنارے پر ہاتھ رکھ کر اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ سیٹ کی بیلٹ ہل تو گئی تھی مگر ایک ہاتھ سے اوپر نہیں اٹھ سکی تھی۔

"اس سیٹ کو اٹھاؤ۔" شجاعت علی نے قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

کانسٹیبل نے دونوں ہاتھوں سے زور آزمائی کرتے ہوئے سیٹ کا ایک کنارہ اوپر اٹھا دیا۔ شجاعت علی نے سیٹ کے نیچے جھانک کر دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

"سیٹ باہر کھینچو۔" شجاعت علی نے کہا۔

ایک اور کانسٹیبل آگے آ گیا اور دونوں نے مل کر سیٹ کھینچ کر باہر نکال دی سیٹ کے نیچے خالی جگہ پر چار بالکل نئی آٹومیٹک رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ شجاعت علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی شبینہ نے اس کے ساتھ دھوکا نہیں کیا تھا اطلاع درست تھی۔

"سر! یہ دیکھئے۔" شجاعت علی نے ڈی ایس پی کو متوجہ کیا۔

"اوہ.........." ڈی ایس پی رائفلیں دیکھ کر چونک گیا۔ "بہت خوب ینگ مین اس کا مطلب ہے تمہارے مخبر کی اطلاع غلط نہیں تھی۔"

"یس سر!" شجاعت علی بولا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ ان سیٹوں کے اندر بھی اسلحہ پوشیدہ ہو گا یہ سیٹ جو باہر نکالی گئی ہے' خاصی وزنی ہے عام طور پر کسی گاڑی کی سیٹ اس قدر وزنی نہیں ہوتی اس شیراڈ کو پولیس اسٹیشن لے چلیں۔"

"ٹھیک ہے اسے وہیں لے جا کر چیک کرو' تمہارا خیال درست ہے اس میں مزید اسلحہ بھی ہو سکتا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "تم گاڑی لے آؤ میں بھی پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

ڈی ایس پی صاحب کے جانے کے بعد شجاعت علی نے سیٹ دوبارہ شیراڈ میں رکھوا دی اور ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیاقت! دیکھو اس کا انجن اسٹارٹ ہوتا ہے یا نہیں؟"

ہیڈ کانسٹیبل شیراڈ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی وہ انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا اسے مایوسی نہیں ہوئی تیسری کوشش پر انجن

اسٹارٹ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے اسے میری جیپ کے پیچھے پیچھے لے آؤ۔" شجاعت علی اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اس نے موبائل والوں کو بھی اشارہ کر دیا دوسرے پولیس والے موبائل کی طرف بڑھ گئے۔

آگے سب انسپکٹر شجاعت علی کی جیپ تھی اس کے پیچھے سرخ شیراڈ اور اس کے پیچھے پولیس موبائل .... یہ قافلہ پانچ منٹ میں پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ سرخ شیراڈ کو تھانے کے گیٹ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا دو پولیس والے رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے ڈی ایس پی صاحب بھی تھانے سے نکل کر گیٹ پر آ گئے تھے ان کی موجودگی میں شیراڈ کی سیٹیں نکال کر ادھیڑ ڈالی گئیں۔ پچھلی سیٹ کے کشن کے اندر سے بھی دو رائفلیں برآمد ہوئیں تین رائفلیں سیٹ کی پشت کے کشن کے اندر سے نکلیں اگلی سیٹوں کے کشن اور پشت والے کشن کے اندر سے رائفلوں کے میگزین اور چھ پستول برآمد ہوئے تھے اس شیراڈ سے مجموعی طور پر نو آٹومیٹک رائفلیں چھ پستول اور رائفلوں کے اٹھارہ میگزین برآمد ہوئے تھے افسران بالا اور پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ایک گھنٹے میں بعض پولیس افسران اور اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز بھی تھانے پہنچ گئے۔

یہ شجاعت علی کی بڑی کامیابی تھی پچھلے دنوں میں بھی اس نے دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی مل رہی تھیں اور اس پر تین چار مرتبہ قاتلانہ حملے بھی ہو چکے تھے اس جیسے فرض شناس آفیسر کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کے محکمے ہی کے بعض افسران اس سے خار کھائے بیٹھے تھے اور اسے نیچا دکھانے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور کچھ اعلیٰ آفیسر ایسے بھی تھے جو اس کی پشت پر تھے۔ آج کے اس واقعے کے بعد اس کی حفاظت کے لئے گارڈ مقرر کر دی گئی ایک موبائل اس کی حفاظت کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔

آج کی اس کامیابی کے لئے شجاعت علی' شبینہ کا شکر گزار تھا اب اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ آج پکڑا جانے والا یہ اسلحہ نوری خالد کا تھا جو کسی دوسری جگہ سپلائی کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ شبینہ' نوری خالد کے لئے کام کر رہی تھی اس نے شجاعت علی کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی اس کا مطلب تھا کہ شبینہ نے بھی اپنے آپ کو

داؤ پر لگا دیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ شبینہ ایسا کیوں کر رہی تھی وہ اس پر اتنی مہربان کیوں تھی اگر نوری خالد کو یہ پتہ چل گیا کہ اس کا اسلحہ شبینہ کی اطلاع پر پکڑا گیا تھا تو وہ شبینہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

شجاعت علی اس رات دو بجے گھر پہنچا وہ لباس تبدیل کر کے اپنے بستر پر لیٹ گیا وہ سونا چاہتا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کے ذہن میں شبینہ کا خیال ابھر آیا۔ آنکھوں کے سامنے اس کی دھندلی سی شبیہہ تیرنے لگی اس نے شبینہ کو صرف دو مرتبہ دیکھا تھا پہلی مرتبہ اس وقت جب ویرانے میں اے ایس آئی حامد حسن کو بے دردی سے قتل کیا گیا تھا اس وقت شجاعت علی شبینہ کے ساتھیوں کے شکنجے میں آ گیا تھا اور شبینہ نے چپکے سے اس کے ہاتھ میں چاقو تھما دیا تھا' وہ چاقو اگرچہ شجاعت علی کے کام نہیں آ سکا تھا مگر شبینہ کی اس حرکت سے بازی پلٹ گئی تھی اور اس کی نہ صرف جان بچ گئی تھی بلکہ حملہ آوروں میں سے ایک ہلاک اور دوسرا اس کی گرفت میں آ گیا تھا اس موقع پر شبینہ پُراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔ دوسری مرتبہ شبینہ ایس پی کے دفتر کے سامنے ملی تھی اور اسے منہ چڑا کر گاڑی میں فرار ہو گئی تھی۔ شجاعت علی کا اندازہ تھا کہ شبینہ اس وقت جان بوجھ کر اس کے سامنے آئی تھی اس کے بعد صرف ٹیلیفون پر اس کی آواز سنائی دیتی رہی تھی پہلے اس کا انداز گفتگو کچھ اور تھا اور اب وہ اس کی ہمدرد بن گئی تھی۔ اس نے دو اطلاعات دی تھیں اور دونوں درست ثابت ہوئی تھیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایک خطرناک جرائم پیشہ گروہ سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ اس کی ہمدرد کیوں بن گئی تھی۔

دفعتاً شجاعت علی کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا ممکن ہے شبینہ اس مجرمانہ زندگی سے اکتا گئی ہو یا شہر کے حالات نے اس کے ضمیر کو جھنجوڑ ڈالا ہو اور وہ اس خوفناک زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہو اور اس کے لئے اس نے یہ طریقہ اپنایا ہو کہ پولیس کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر کے کسی بڑی سزا سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

اصل بات جو کچھ بھی تھی لیکن موجودہ صورت حال نے شجاعت علی کو شبینہ کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کے سوچنے کا انداز بھی بہت مختلف تھا وہ اپنے دل میں شبینہ کے لئے ایک نرم گوشہ محسوس کرنے لگا اور جب اس کی آنکھ

لگی تو وہ خواب میں بھی شبینہ کی دھندلی سی شبیہہ دیکھتا رہا۔

☆------☆------☆

عزم و حوصلے کی علامت کراچی جس کا ساحل صدیوں سے بحیرۂ عرب کی شوریدہ لہروں کا مقابلہ کر رہا تھا' آج ان لہروں سے خوفزدہ عروس البلاد کراچی کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو بھیانک اندھیرے نگل رہے تھے' اس کے باسی سہمے ہوئے تھے' اس کی سڑکوں کا سہاگ اجڑ رہا تھا' آگ اور خون کا کھیل اس کی گود ویران کر رہا تھا' منی پاکستان کراچی جسے ہمیشہ بھائی چارے محبت اور اتحاد کی علامت سمجھا جاتا تھا' آج نفرت و تعصب کی آگ میں جل رہا تھا۔ بارود کے دھویں نے اس کی فضا کو زہر آلود کر دیا تھا' لوگوں کے دم گھٹنے لگے تھے' یہی وہ شہر تھا جس نے پاکستان کے کونے کونے سے آنے والے محنت کشوں کے لئے اپنی محبت بھری آغوش ہمیشہ وا رکھی تھی' یہاں سڑکوں پر پتھر کوٹنے والا مزدور بھی رات کو پیٹ بھر کر روٹی کھا کر سوتا تھا' اس کے نواح میں پھیلے ہوئے کارخانوں' فیکٹریوں اور ملوں کا پہیہ کبھی جام نہیں ہوا تھا' یہاں سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتا تھا۔ آج ان فیکٹریوں کے پہیئے جام ہو رہے تھے' سڑکیں ویران ہو رہی تھیں' سرمایہ دار اپنا سرمایہ دوسرے شہروں کو منتقل کر رہے تھے اور محنت کشوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے وہ مزدوری کی تلاش کرنے کے بجائے فرار کے راستے تلاش کر رہے تھے آج اس شہر کی گود اجڑ رہی تھی' کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب دس پندرہ معصوم اور بے گناہ شہری دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ نہ بنتے ہوں۔

تاریخ کے صفحات گواہی دیتے ہیں کہ جب روم جل رہا تھا تو شہنشاہ نیرو چین کی بانسری بجا رہا تھا اسے آگ کے وہ شعلے دکھائی نہیں دے رہے تھے جو آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے ان لوگوں کی چیخیں سنائی نہیں دی تھیں جو چاروں طرف سے آگ میں گھرے ہوئے تھے شاید اس لئے کہ اس کا ضمیر عمیق ترین گہرائیوں میں دفن ہو چکا تھا اور وہ اطمینان و سکون سے بیٹھا بانسری کی تانیں اڑا رہا تھا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی دیکھنے میں آ رہی تھی ریڈیو پر طربیہ نغمے نشر ہوتے رہتے اور ٹیلیویژن کے تمام چینل سے موسیقی کے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو رہے تھے اور ارباب اقتدار سب ٹھیک ہے کے بیانات جاری کر کے قوم کو تسلی دینے کی کوشش کر

رہے تھے۔

شجاعت علی صبح جب بیدار ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر اخبار کی ہیڈ لائن پر پڑی۔ گزشتہ رات شہر کے مختلف علاقوں میں گیارہ بے گناہ افراد دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ دو پولیس اہلکار جاں بحق ہوئے تھے اور کوئی دہشت گرد گرفتار نہیں ہو سکا تھا اس ہیڈ لائن کے نیچے سرخ شیراڈ سے بھاری تعداد میں اسلحہ پکڑے جانے اور دو آدموں کی ہلاکت کی خبر بھی تھی۔

اسی دوران ملازم چائے لے آیا۔ سلطانہ یونیورسٹی جا چکی تھی شجاعت علی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگا اخباروں کے پاس چھاپنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ سیاست دانوں کے دھواں دار بیانات' ڈکیتیوں اور اسلحہ کے زور پر ٹیکسیاں اور گاڑیاں چھینے جانے کی خبریں' دہشت گردوں کی فائرنگ' بے گناہ اور معصوم لوگوں کے زخمی اور ہلاک ہونے کی خبریں اور دانشوروں اور سیاست دانوں کے تبصرے جن میں پولیس ہی کو اس ساری قتل و غارت گری کا مجرم قرار دیا جا رہا تھا۔

شجاعت علی کے خیال میں حالات کے بگاڑ میں سیاست دانوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ سیاست میں تشدد کا رجحان آ گیا تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی کا دل خون کے آنسو روتا تھا جب کوئی دہشت گرد اس کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنتا یا کسی کو سنگین جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کرتا تو اسے دکھ بھی ہوتا تھا۔ یہی نوجوان قوم کا سرمایہ تھے آگے جا کر انہی کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنا تھی لیکن انہیں راستے سے بھٹکا دیا گیا تھا ان سے کتابیں چھین کر ان کے ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ تھما دیا گیا تھا انہیں ہیروئن کا عادی بنا کر ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کیا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ وہ لوگ کر رہے تھے جنہیں اپنے ملک کی سلامتی اور اپنی قوم کے مستقبل سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز تھا چند ٹکوں کی خاطر وہ ملک و قوم کی سلامتی کو داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔

"آپ کا فون ہے صاحب۔"

شجاعت علی ملازم کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کپ ملازم کے حوالے کیا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔

"ہیلو! شجاعت علی اسپیکنگ۔"

"مبارک ہو۔" ایک کھنکتی ہوئی نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی وہ شبینہ تھی۔ "میں نے رات کی کامیابی پر تمہیں مبارکباد دینے کے لئے فون کیا ہے۔ تمہاری کارکردگی بہت شاندار رہی لیکن تمہاری یہ کامیابیاں تمہارے لئے خطرات پیدا کر رہی ہیں۔"

"مبارکباد کا شکریہ .... لیکن گزشتہ رات تم نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" شجاعت علی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "چند رائفلیں چارے کے طور پر ہمارے سامنے ڈال کر ہمیں مروانے کا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" شبینہ نے کہا۔ "بخدا مجھے اس دوسری گاڑی کے بارے میں قطعی علم نہیں تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ سرخ شیراڈ میں اسلحہ لے جایا جا رہا ہے میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی حفاظت کے لئے اس کے پیچھے بھی کوئی گاڑی موجود ہے۔ میں تمہاری موت نہیں زندگی چاہتی ہوں میں تمہیں دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کیا تمہاری سوچ میں اس تبدیلی کی وجہ جان سکتا ہوں۔" شجاعت علی نے پوچھا۔

"وجہ............؟" شبینہ کے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ "وجہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس ایک ملاقات میں تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا یہ ملاقات ہماری ذاتی حیثیت میں ہوگی نہ میں پولیس آفیسر اور نہ تم قانون کو مطلوب..........."

جواب میں شبینہ کا ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم بھی میرے بارے میں مثبت انداز میں سوچ سکتے ہو۔"

"کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے مجرم بن کر پیدا نہیں ہوتا وہ جو کچھ بھی بنتا ہے' اس میں حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے اگر تم راستے سے بھٹک گئی ہو تو اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی ہو سکتا ہے کوئی ایسا حل نکل آئے جو تمہیں راہ راست پر لے آئے۔"

"کیا تمہارا قانون ایک ایسے شخص کو معاف کر سکتا ہے جس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہوں۔"

"قانون اندھا بہرا نہیں ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔ "بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی شخص گناہ کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے ہو سکتا ہے تمہارے اس پس منظر میں بھی کچھ ایسی وجوہات ہوں کہ قانون...........؟"

"یہ لمبی بحث ہے سب انسپکٹر شجاعت علی۔" شبینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس وقت تو میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتی تھی۔"

"وہ کیا...........؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نوری خالد کل رات سے بہت بھنایا ہوا ہے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "تمہاری وجہ سے اسے پہلے بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے اور کل رات بھی نہ صرف اس کا اسلحہ پکڑا گیا بلکہ دو آدمی بھی مارے گئے وہ تمہیں راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا رہا ہے ذرا محتاط رہنا۔"

"میں اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جب تک میری زندگی ہے دنیا کی کوئی طاقت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی اور جب میرا وقت آ جائے گا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکے گی لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ ملاقات کب ہو رہی ہے؟" شجاعت علی نے کہا۔

"ملاقات!" شبینہ نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "بہت بے تاب ہو رہے ہو! ٹھیک ہے میں تمہیں فون پر اطلاع کر دوں گی لیکن مجھ سے ملاقات کے لئے تم یونیفارم میں نہیں سادہ لباس میں آؤ گے۔"

"ظاہر ہے یہ ملاقات ہماری ذاتی حیثیت میں ہوگی تو پھر کب..........؟"

"میں فون پر اطلاع کر دوں گی۔" شبینہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔

شجاعت علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا اس نے ریسیور رکھ دیا وہ چند لمحے وہیں کھڑا شبینہ کے بارے میں سوچتا رہا پھر اپنے کمرے میں آ کر باتھ روم میں گھس گیا تیار ہونے کے بعد وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ اس کے تھانے کی موبائل پہنچ گئی۔

"انہیں چائے بنا کر دو مجھے ابھی چند منٹ لگیں گے۔" شجاعت علی نے ملازم سے کہا اور اطمینان سے ناشتہ کرتا رہا ناشتے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف نمبروں پر فون پر باتیں

کرتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور ٹوپی سر پر جماتا ہوا لاؤنج میں آ گیا جہاں اس کی والدہ اور والد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"اچھا ماں جی میں جا رہا ہوں واپسی کا کچھ پتہ نہیں۔" اس نے کہا۔

"جاؤ بیٹا خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" ماں نے دعا دی۔

"خدا حافظ ابو۔" شجاعت علی نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور باہر نکل گیا۔

چار پولیس والے موبائل کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور دو باہر کھڑے تھے۔ شجاعت علی کے بیٹھتے ہی وہ دونوں بھی موبائل پر سوار ہو گئے ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور موبائل حرکت میں آ گئی۔

موبائل کا ریڈیو ٹرانسمیٹر آن تھا۔ کنٹرول روم سے مختلف تھانوں اور موبائلز کے لئے مختلف ہدایات نشر ہو رہی تھیں۔ واٹر پمپ والے چوراہے پر ٹریفک کا ہجوم ہونے کی وجہ سے ڈرائیور گاڑی کو سیدھا نکال لایا اور پھر سہراب گوٹھ والے چوراہے سے اس نے گاڑی راشد منہاس روڈ پر موڑی ہی تھی کہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پر آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"تمام تھانوں اور شہر میں گشت کرنے والے تمام موبائلز کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ضلع جنوبی کے ڈی ایس پی صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کر دیا گیا ہے' ڈی ایس پی صاحب ڈیوٹی پر آنے کے لئے گھر سے نکلے تھے کہ نیلے رنگ کی ایک کار سے ان پر زبردست فائرنگ کی گئی جس سے وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ گاڑی کا نمبر یا حملہ آوروں کی شناخت نہیں ہو سکی۔ شہر میں گشت کرنے والی تمام پولیس موبائلز کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ نیلے رنگ کی کاروں اور مشکوک افراد پر نگاہ رکھیں۔"

ریڈیو ٹرانسمیٹر پر یہ اعلان بار بار دہرایا جا رہا تھا اور شجاعت علی اس ڈی ایس پی کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ خود بھی چند ماہ اے ایس آئی کی حیثیت سے اس ڈی ایس پی کی ماتحتی میں کام کر چکا تھا وہ ایک ذمہ دار اور فرض شناس آفیسر تھا شجاعت علی نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ ایک سخت گیر' اصول پرست آفیسر اور جرائم پیشہ افراد کا بدترین دشمن تھا اس کے دشمن بھی لاتعداد تھے۔ ایسے ذمہ دار اور فرض شناس پولیس آفیسر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہتے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔

سب انسپکٹر شجاعت علی دن بھر مصروف رہا کبھی علاقے کا گشت اور کبھی تھانہ .... اس کے ماتحتوں نے کئی مقامات پر چیکنگ شروع کر رکھی تھی۔ شجاعت علی گشت کے دوران ان کی کارکردگی کا بھی جائزہ لے رہا تھا بعض جگہوں پر مشتبہ لوگوں کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی لیکن لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سننے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ پورے شہر کی پولیس ٹاپتی رہ گئی ڈی ایس پی پر حملے میں ملوث نیلی کار اور حملہ آوروں کا سراغ نہیں ملا البتہ شہر کے مختلف علاقوں میں بیسیوں لوگوں کو شبے میں پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔

دوسرے دن شجاعت علی نے سراج نامی زخمی ملزم کو عدالت میں پیش کر دیا' ملزم کا تحریری بیان بھی پیش کیا گیا جس میں اس نے نہ صرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ سب انسپکٹر شجاعت علی کی موبائل پر فائرنگ کرنے کا اعتراف کیا تھا بلکہ انسپکٹر رفعت کی جیپ پر بھی حملے کا اعتراف کیا تھا اس حملے میں انسپکٹر رفعت اور ایک کانسٹیبل جاں بحق ہو گئے تھے۔

شجاعت علی نے چالان رپورٹ میں عجب خان کے گھر سے ملنے والے موبائل ٹیلیفون کے اصل مالک رائے دلنواز کے ملوث ہونے کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھ گچھ کے لئے اسے حراست میں لینے کی استدعا بھی کی تھی۔

عدالت میں رائے دلنواز کے قابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے لیکن اس کے صرف دو گھنٹے بعد رائے دلنواز نے اپنی ضمانت کروا لی لیکن شجاعت علی اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اب موقع آ گیا تھا کہ دہشت گردوں کی سرپرستی کرنے والے اس جیسے لوگوں کا حساب کتاب برابر کر دیا جائے۔

شجاعت علی نے دوسرے ہی دن ٹھوس دلائل دیتے ہوئے رائے دلنواز کی ضمانت منسوخ کروا دی اور جب شجاعت علی پولیس کی نفری لے کر رائے دلنواز کی گرفتاری کے لئے اس کی عالیشان کوٹھی پر پہنچا تو وہاں کی صورت حال مختلف تھی۔

رائے دلنواز کو بھی اپنی ضمانت کی منسوخی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ پہلے تو ٹیلیفون پر پولیس کے اعلیٰ افسران پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب بات نہیں بنی تو فرار کی تیاری کرنے لگا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی نے اس کے گرد مضبوط جال پھیلایا تھا اس نے اپنے بعض

افسران کو قائل کر لیا تھا کہ رائے دلنواز ہی دہشت گردوں کے ایک گروہ کا سرپرست تھا اس نے کالج کے معصوم نوجوانوں کو دولت کا لالچ دے کر ورغلایا تھا ان کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر انہیں اسلحہ تھما دیا تھا۔ وہ دہشت گردی کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دہشت گردی کی ہر واردات کے بعد دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح رائے دلنواز کا بیان بھی اخبارات کی زینت ضرور بنتا سیاسی لیڈر تو حکومت' پولیس یا دیگر ایجنسیوں کو ان وارداتوں کا ذمہ دار ٹھہراتے لیکن رائے دلنواز صرف ایک پارٹی کو اس دہشت گردی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اس کے لیڈروں اور کارکنوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا مقصد اس سیاسی پارٹی کے لیڈروں کے خلاف عوام میں نفرت پیدا کرنا تھا وہ بھائی کو بھائی سے لڑانا چاہتا تھا اور سب انسپکٹر شجاعت علی اس سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

"رائے صاحب!" کوٹھی کا ایک گن مین چیختا ہوا اندر داخل ہوا۔ "پولیس آئی ہے وہ آپ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس معمولی سب انسپکٹر کی یہ ہمت۔" رائے دلنواز چیخا۔ "کھول دو فائر' اڑا دو ان سب کو' کوئی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔"

کوٹھی میں رائے دلنواز کے ساتھ چار آدمی اور تھے ان سب کے پاس سب مشین گنیں تھیں وہ پوزیشن سنبھال کر پولیس پر فائرنگ کرنے لگے۔ شجاعت علی نے بھی جوابی کارروائی کا حکم دے دیا اس کے ساتھ اے ایس آئی شاہد کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دس کانسٹیبل تھے۔ کوٹھی سے فائرنگ میں پہل کی گئی تھی دو کانسٹیبل پہلی ہی باڑھ میں زخمی ہو گئے۔

"شاہد!" شجاعت علی چیخا۔ "دو تین آدمیوں کو لے کر دائیں طرف والی کوٹھی کی چھت پر پہنچ جاؤ اور رحمت خان تم بائیں طرف سے اٹیک کرو گھیر لو کوٹھی کو.........."

فائرنگ میں شدت آ گئی ایک کانسٹیبل جاں بحق ہو گیا شجاعت علی نے اپنے ماتحتوں کو نئے احکامات جاری کئے کچھ ہی دیر بعد اندر سے دو آدمیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ "سر.......... سر وہ فرار ہو رہا ہے۔" اے ایس آئی شاہد کی آواز سن کر شجاعت علی چونک گیا۔ "وہ پچھلے گیٹ سے پجیرو میں نکل گیا ہے۔" شاہد نے چیخ کر کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" شجاعت علی چیختا ہوا جیپ کی طرف دوڑا دو کانسٹیبل بھی اس

کے ساتھ تھے۔ "شاہد اسٹیئرنگ سنبھالو۔" شجاعت علی نے جیپ پر سوار ہوتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ماتحتوں کو چیخ کر حکم دیا کہ وہ کوٹھی پر فائرنگ جاری رکھیں۔

جیپ تیزی سے گھوم کر کوٹھی کی پہلی گلی میں آ گئی۔ رائے دلنواز کی پجیرو گلی کے اگلے موڑ پر گھوم رہی تھی۔ شاہد علی نے جیپ کی رفتار بڑھا دی اس کے ساتھ ہی شجاعت علی نے سیٹ پر باہر کی طرف جھک کر فائر کیا تھا مگر پجیرو مڑ چکی تھی۔

جیپ جلد ہی دوسری سڑک پر آ گئی۔ پجیرو تقریباً دو سو گز آگے نکل چکی تھی اور اس سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔ شجاعت علی کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی وہ پجیرو پر مسلسل فائرنگ کر رہا تھا۔ کھلی چھت والی جیپ کے پچھلے حصے پر کھڑے دونوں کانسٹیبل بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ اے ایس آئی شاہد جیپ کو سڑک پر لہراتے ہوئے اس کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ "پجیرو سے چلائی جانے والی ایک گولی شاہد اور شجاعت علی کے درمیان ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی نکل گئی۔ ایک لمحہ کو اسٹیئرنگ پر شاہد کی گرفت ڈھیلی ہوئی تھی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔

دفعتاً فضا میں ایک زوردار دھاکہ ہوا جیپ سے چلائی جانے والی ایک گولی پجیرو کے پچھلے ٹائر پر لگی ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور تیز رفتار جیپ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر رک گئی۔

صرف دو سیکنڈ بعد جیپ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ پجیرو سے چند گز کے فاصلہ پر رکی۔ شجاعت علی اور اس کے ماتحت جیپ سے اتر کر اس کی طرف دوڑے جیپ میں دو آدمی تھے پچھلی سیٹ پر رائے دلنواز کا ایک گن مین تھا جس کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا شاید پولیس کی آخری گولی اسے لگی تھی رائے دلنواز اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا تھا وہ صحیح سلامت تھا اس نے شجاعت علی کو دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

سب انسپکٹر شجاعت علی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں انگارے برس رہے تھے اس کی آنکھوں سے۔ اس نے رائفل سیدھی کر لی۔

"میں جانتا ہوں کہ اس مرتبہ بھی تم گرفتاری کے بعد ضمانت پر رہا ہو جاؤ گے مگر.........." شجاعت علی کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ "لیکن میں تمہیں زندگی ہی سے رہائی دلا رہا ہوں تاکہ بار بار ضمانتوں کا یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔"

رائے دلنواز کا چہرہ دھواں ہو گیا وہ شجاعت علی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"نن .... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ چیخا۔

"مجھے اس سے کون روک سکتا ہے۔" شجاعت علی غرایا۔ "اپنی موت کو سامنے دیکھ کر کانپ کیوں رہے ہو؟ تم نے ان ماؤں کی چیخیں نہیں سنیں جن کے لخت جگر تم نے خون میں نہلا دیئے تھے۔ ان بہنوں کی آہ و فغاں تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی جن کے سروں سے تم نے دوپٹے نوچے تھے۔ ان بوڑھوں کی فریادیں تم نے نہیں سنیں جن کے بڑھاپے کے سہاروں کو تم نے گولیوں سے چھلنی کروایا تھا' معصوم اور بے گناہ نوجوانوں کو موت کے اندھیرے غار میں دھکیلتے ہوئے تمہیں ذرا بھی خوف نہیں آیا تھا اور اب موت کو اپنے سامنے دیکھ کر خوف و دہشت سے کانپ رہے ہو اب کوئی وزیر کسی اسمبلی کا ممبر کوئی سرمایہ دار تمہاری ضمانت نہیں کرا سکے گا۔"

شجاعت علی نے خاموش ہو کر ایک لمحہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر آٹومیٹک رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا لاتعداد گولیاں رائے دلنواز کے جسم میں پیوست ہو گئیں اس کے جسم پر نمودار ہونے والے کئی سوراخوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔

شجاعت علی نے رائفل کا رخ پجیرو کی پچھلی سیٹ پر زخمی گن مین کی طرف موڑ دیا۔

"ان کی موت میں دوسروں کے لئے زندگی کا پیغام ہے۔" شجاعت علی بڑبڑاتا ہوا جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

رائے دلنواز اور اس کے پروردہ دہشت گردوں کے خاتمے سے شہر میں دہشت گردی کی وارداتوں میں کمی نہیں آ گئی تھی۔ موت کے سائے اب بھی اس شہر پر منڈلا رہے تھے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں قیامت صغریٰ کے مناظر اب بھی دیکھنے میں آ رہے تھے۔ ایک ایک گھر سے کئی کئی جنازے اب بھی اٹھ رہے تھے۔

رائے دل نواز کی ہلاکت کا ایک نتیجہ ضرور نکلا تھا سیاسی لیڈروں کو بیان بازی کے لئے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ پولیس کے خلاف ایک نیا محاذ کھل گیا تھا یہ سیاسی لیڈر شہر میں ساری خرابی کی ذمہ داری اب سب انسپکٹر شجاعت علی پر ڈال رہے تھے۔ اسے جلاد فرعون اور بے لگام پولیس آفیسر جیسے خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ اسے پولیس کی ملازمت سے برطرف کر کے اس پر ایک معزز شہری کے قتل کا مقدمہ قائم کرنے کا مطالبہ

کیا جا رہا تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی مطمئن تھا اس نے کسی بے گناہ کو نہیں مارا تھا ایک ایسے شخص کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا جو درجنوں بے گناہوں کی ہلاکت کا ذمہ دار تھا۔ وہ دو مرتبہ گرفتار ہوا تھا اور دونوں مرتبہ ضمانت پر رہا ہو گیا تھا اسے یقین تھا کہ تیسری مرتبہ گرفتاری کے بعد وہ پھر اپنی ضمانت کروا لیتا اور دو تین دن کے بعد ہی باعزت بری ہو جاتا۔ قانون میں بڑی لچک تھی اور اس جیسے بااثر معزز لوگوں کے لئے تو قانون میں مزید لچک پیدا ہو جاتی تھی۔

سب انسپکٹر شجاعت علی سیاسی لیڈروں کے دھواں دار بیانات کا مقابلہ کرتا رہا اس نے اپنے افسران کو مطمئن کر دیا تھا کہ رائے دلنواز دہشت گردوں کے اس گروہ کا سرپرست تھا اور اپنے مذموم مقاصد کے لئے دہشت گردی کی وارداتیں کروا رہا تھا۔

رائے دلتواز کی کوٹھی سے اس کے فرار کے بعد دو آدمی زندہ پکڑے گئے تھے ان میں ایک زخمی ہوا تھا اور دوسرے نے اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا تھا ان دونوں نے دہشت گردی کی بہت سی وارداتوں کا اعتراف کیا ان میں ایک وہ نوجوان تھا جس نے مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو فائرنگ سے ایک ہفتے پہلے باقاعدگی سے مسجد میں آتا رہا تھا۔ شجاعت علی کے خیال میں اب وقت آ گیا تھا کہ رائے دلنواز کلے بارے میں عوام کو حقائق سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ ایس پی صاحب کے دفتر میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا اور کوٹھی سے زندہ گرفتار ہونے والے دونوں دہشت گردوں کو بھی پریس کے نمائندوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

شجاعت علی اب ایک متنازع بے لگام پولیس آفیسر مشہور ہو چکا تھا اپنے محکمے کے اندر اب اسے پہلے سے زیادہ مخالفت کا سامنا تھا لیکن وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا قانون کی بالادستی کے لئے اور قانون کے دائرے میں رہ کر رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اب تک کسی کو اس پر گرفت کا موقع نہیں مل سکا تھا دوسری طرف محکمے کے باہر بھی اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رائے دلنواز والے واقعے کے چند روز بعد اس پر ایک بار پھر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور اس بار بھی وہ بال بال بچا تھا۔

اس روز شام آٹھ بجے وہ پولیس اسٹیشن میں اپنے دفتر میں بیٹھا سب انسپکٹر امین' اے ایس آئی شاہد اور شاہد کے ایک دوست ساجد سے باتیں کر رہا تھا۔ ساجد کچھ دیر

پہلے ہی آیا تھا چائے کا دور چل رہا تھا اور گپ شپ ہو رہی تھی۔ آج کئی روز بعد انہیں اس طرح فرصت میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا شجاعت علی ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اے ایس آئی شاہد فون کے زیادہ قریب تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"یس' پولیس اسٹیشن۔" وہ ماؤتھ پیس میں بولا چند لمحے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر ریسیور شجاعت علی کی طرف بڑھا دیا۔ "آپ کے گھر سے کال ہے۔"

"ہاں شجاعت بول رہا ہوں۔" شجاعت علی نے ریسیور لیتے ہوئے کہا لیکن دوسری طرف کی آواز سنتے ہی چونک گیا اور کن انکھیوں سے شاہد کی طرف دیکھنے لگا۔

"شبینہ بول رہی ہوں' تمہارے لئے ایک اہم اطلاع ہے۔"

"اوہ! میں تو سوچ رہا تھا کہ تم کسی ریسٹورنٹ میں میری دعوت کرنے والی ہو بہرحال کہو کیا معاملہ ہے؟" شجاعت علی نے کہا۔

"ٹھیک نو بجے تمہارے علاقے میں کراچی کے دو سب سے بڑے منشیات اور اسلحہ فروشوں میں ایک معاہدہ ہونے والا ہے۔ یہ تمہارے لئے بہترین موقع ہے؟" شبینہ نے کہا۔

"وہ کون ہیں .... یہ ملاقات کہاں پر ہونے والی ہے۔" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نوری خالد اور ہیروئن کا سب سے بڑا اسمگلر پرنس۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "وہ ٹھیک نو بجے بلاک فور اے کے پچھلی طرف ندی کے کنارے ایک جھونپڑا نما کچے مکان میں جمع ہوں گے اس مکان کے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ لگی ہوئی ہے اور مکان کے اردگرد درختوں کی بھی بہتات ہے۔"

"ٹھیک ہے .... سمجھ گیا اور کوئی بات؟" شجاعت علی بولا۔

"پچھلی مرتبہ ہیروئن کا اسمگلر پرنس تمہارا گھیرا توڑ کر بھاگ نکلا تھا مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ تم اسے ایسا کوئی موقع نہیں دو گے۔" شبینہ نے کہا۔

"مطمئن رہو اب ایسا نہیں ہو گا۔" شجاعت علی نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" شبینہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

شجاعت علی ابھی تک ریسیور کان سے لگائے ہوئے تھا دفعتاً کھنک کی ایک اور آواز

سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور دوسروں سے معذرت کرتے ہوئے دفتر سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس ٹیلیفون کی ایک ایکس ٹینشن دوسرے کمرے میں بھی تھی۔ وہ اس کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ گیٹ سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر جھانکا اور واپس آ گیا۔ دوسرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے کمرے میں دیکھا تھا۔ ٹیلی فون والی میز پر اے ایس آئی روشن خان بیٹھا ہوا تھا۔

شجاعت علی اپنے دفتر میں واپس آ گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق پانچ منٹ بعد اے ایس آئی روشن خان اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا بات ہے۔ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"میرے پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے سر! میں گھر جانا چاہتا ہوں۔" روشن خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے' جاؤ۔" شجاعت علی نے کہا۔

اے ایس آئی روشن خان ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہاں اس نے یونیفارم اتار کر سادہ لباس پہنا اور تھانے سے نکل گیا۔ جب سے پولیس پر حملے ہونا شروع ہوئے تھے پولیس اہلکار محتاط ہو گئے تھے۔ وہ سادہ لباس میں گھر سے آتے۔ تھانے میں آ کر یونیفارم پہن لیتے اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے پھر سادہ لباس پہن لیتے۔ وہ جیسے ہی تھانے سے نکلا شجاعت علی ایک بار پھر اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے ایک سادہ لباس کانسٹیبل کو بلا کر سرگوشی میں کچھ کہا۔ سادہ لباس کانسٹیبل تیزی سے باہر چلا گیا۔

"امین۔" شجاعت علی نے کمرے میں آ کر سب انسپکٹر امین کی طرف دیکھا۔ "آدھے گھنٹے کے اندر اندر ریڈ کے لئے پارٹی تیار کرو۔ اگرچہ کسی کامیابی کی امید نہیں مگر ایک فیصد توقع کی جا سکتی ہے۔"

"ریڈ کہاں کرنا ہے۔ کس کی اطلاع ہے؟" امین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ فون کال میرے گھر سے نہیں تھی۔ مخبر نے ایک اہم اطلاع دی ہے۔ بلاک فور اے کے پچھلی طرف ایک کچا مکان .... چھ مسلح کانسٹیبل کافی ہوں گے۔ شاہد تم بھی چلو۔ ہری اپ۔" شجاعت علی نے کہا۔

سب انسپکٹر امین اور اے ایس آئی شاہد فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔

آدھے گھنٹے میں چھاپہ مار پارٹی تیار ہو گئی۔ وہ روانہ ہونے ہی والے تھے کہ سادہ لباس کانسٹیبل واپس آ گیا وہ کچھ دیر تک شجاعت علی سے سرگوشیاں کرتا رہا پھر شجاعت علی امین اور شاہد کے ساتھ جیپ میں سوار ہو گیا۔ جیپ کے حرکت میں آتے ہی مسلح کانسٹیبلوں کی موبائل بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ ان کا رخ بلاک فور اے کی طرف تھا۔

☆------☆------☆

پرنس جمشید جب بلاک فور اے میں واقع ایک پرائیویٹ اسکول کی عمارت کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو نو بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ سامنے والی گلی میں داخل ہو گیا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ اس وقت عام طور پر بچے اپنے گھروں کے سامنے گلیوں میں کھیلتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ بھی گھروں کے سامنے کرسیوں پر یا لان میں گھاس پر بیٹھے خوش گپیاں کیا کرتے تھے لیکن آج گلیوں میں سناٹا تھا۔ نہ کسی گلی میں بچے کھیلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور نہ ہی گھروں کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ کر باتوں میں وقت گزارنے والے بزرگ نظر آ رہے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے کئی ماہ سے جاری دہشت گردی کی وارداتوں نے شہر کی رونقوں کو نگل لیا تھا۔

پرنس مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں بنگلے ختم ہو گئے تھے، سب سے آخری رو میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو تین بنگلے زیر تعمیر تھے اور ان سے آگے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو گندے نالے تک چلا گیا تھا۔ گندے نالے، جسے عام طور پر ندی کہا جاتا ہے سے ذرا پہلے درختوں کے جھنڈ میں وہ کچا مکان تھا جہاں پرنس کو جانا تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف خاصی وسیع و عریض جگہ چھوڑ کر خشک کانٹے دار جھاڑیوں کی اونچی باڑ تھی۔ آمدورفت کے لئے کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

وہ مکان کچا تھا لیکن وہاں تک بجلی کی لائن موجود تھی۔ مکان کی ایک کھڑکی سے ٹیوب لائٹ کی روشنی جھلکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرنس آخر میں واقع زیر تعمیر بنگلے کے قریب ایک لمحے کو رکا اور مکان کی طرف دیکھنے لگا مکان میں بظاہر کسی قسم کی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن روشنی کسی کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔

اس نے پتلون کی دائیں جیب پر ہاتھ پھیر کر پستول کی موجودگی کا احساس کیا اس کی پچھلی جیب میں موٹر سائیکل کا کلچ وائر بھی موجود تھا۔ یہ اس کا خاص ہتھیار تھا اور اس نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا مکان کی طرف بڑھنے لگا۔

اس مکان میں اس کی ملاقات ہیروئن اور اسلحہ کے سب سے بڑے اسمگلر نوری خالد سے ہونے والی تھی۔ گزشتہ دنوں پے در پے اس کے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے کہ وہ بری طرح بدحواس ہو کر رہ گیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی وہ بنگالی پاڑے میں پولیس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا۔ البتہ عبدالودود جس کے گھر میں وہ پناہ لئے ہوئے تھا، مارا گیا تھا۔ پرنس اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے خلاف ہونے والی ان کارروائیوں کے پیچھے نوری خالد کا ہاتھ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے نوری خالد اس کے تمام ٹھکانوں سے واقف ہو چکا ہو۔ وہ اسے کہیں بھی ٹکنے نہیں دے رہا تھا وہ جہاں بھی پناہ لیتا پولیس ریڈ کر دیتی۔ کچھ عرصے پہلے تک نوری خالد اس کا بہترین دوست تھا وہ اس سے مال لیا کرتا تھا لاکھوں کی ڈیل ہوا کرتی تھی لیکن پھر ان میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ پرنس پشاور کی پارٹیوں سے براہ راست مال منگواتا تھا۔ اس نے نوری خالد کے آدھے سے زیادہ گاہک اپنے قبضے میں کر لئے تھے اس طرح نوری خالد اس کا بدترین دشمن بن گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے موقع کی تاک میں لگے رہتے لیکن ادھر چند ہفتوں سے نوری خالد کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ اسے مسلسل پیغام بھیج رہا تھا کہ ایک دوسرے کی دشمنی چھوڑ دیں اور مل کر کام کریں۔ مگر پرنس نہیں مانا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوری خالد اس کے پیچھے لگ گیا وہ جہاں بھی جاتا پولیس ہلہ بول دیتی۔ ظاہر ہے پولیس کو اس کے بارے میں اطلاعات نوری خالد ہی فراہم کر رہا تھا لیکن اسے حیرت اس بات کی تھی کہ نوری خالد کو اس کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ کیسے چلا۔

دو دن پہلے پرنس جمشید کو پھر نوری خالد کا پیغام ملا تھا کہ اگر وہ اس کی پیشکش قبول کر لے تو اس کی یہ تمام مشکلات ختم ہو جائیں گی اور پولیس تو کیا کوئی بھی ایجنسی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد پرنس اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر اسے دریا میں رہنا ہے تو مگرمچھ سے بیر ختم کرنا پڑے گا اور آج اس کے اور نوری خالد کے درمیان ایک معاہدہ ہونے والا تھا۔ نوری خالد نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ

وہ رات نو بجے اس مکان میں پہنچ جائے۔ وہ بھی آ جائے گا۔ ان کی ملاقات کے بعد دوستی کے ایک نئے سفر کا آغاز ہو گا۔ پرنس اس مکان کے بارے میں پہلے بھی جانتا تھا اس لئے اسے مکان تلاش کرنے کے لئے اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑا۔

وہ جھاڑیوں کے درمیان راستے سے گزرتا ہوا مکان کے قریب پہنچ گیا۔ اسے ایک شبہ یہ بھی تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا نہ ہو۔ اسی لئے وہ اپنی تیاری مکمل کر کے آیا تھا۔

"دلبر جان.........." اس نے ایک جگہ رک کر کسی کا نام لے کر پکارا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"کون ہے کدھر ہو بھائی۔" چند سیکنڈ بعد ہی دائیں طرف سے ایک آواز ابھری۔

"میں ہوں پرنس۔" اس نے جواب دیا۔

"تو ادھر کیوں کھڑا ہے۔ آگے آ جاؤ نا۔ پہلی دفعہ آیا ہے کیا۔" دلبر جان نے کہا۔

پرنس آگے بڑھ گیا۔ دلبر جان ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی صورت پر پھٹکار برس رہی تھی وہ پرنس کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں سرخ رنگ کی موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ دو تین کشن بھی پڑے تھے۔ ایک کونے میں دیوار کے قریب دری کچھ ابھری ہوئی تھی۔ دری کے ابھار کا انداز دیکھ کر پرنس کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے نیچے کوئی رائفل رکھی ہوئی تھی۔

"نوری خالد ابھی نہیں آیا؟" پرنس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دلبر جان سے پوچھا۔

"شام کو مجھے پیغام ملا تھا کہ وہ لوگ سوا نو بجے آئیں گے۔ تمہارے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔" دلبر جان نے کہا۔ "تم بیٹھو میں چائے لے کر آتا ہوں۔ سلیمانی چائے بنایا ہے میں نے دودھ لینے کے لئے تو دور جانا پڑتا ہے۔"

دلبر جان دوسرے کمرے میں چلا گیا کچھ دیر بعد وہ ایلومینیم کی کیتلی اور دو پیالیاں لے کر آ گیا۔ کیتلی دھوئیں سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔ پرنس ایک کشن سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ چکا تھا۔ دلبر جان نے پیالیوں میں چائے انڈیل کر ایک پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ پرنس نے اس وقت تک پیالی نہیں اٹھائی تھی جب تک دلبر نے اپنی پیالی سے دو تین گھونٹ نہیں بھر لئے تھے۔

وہ ابھی چائے پی رہے تھے کہ باہر کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی

دی۔ پرنس گاڑی کی آواز سن کر چونکا تھا۔ پولیس موبائل کے انجن کی آواز صاف پہچانی جا سکتی تھی۔

شاید وہ لوگ آ گیا ہے۔" دلبر جان پیالی دری پر رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہ آواز تو پولیس موبائل کی ہے۔" پرنس بولا۔

"نہیں ایک دن میں بھی دھوکا کھا گیا تھا۔" دلبر جان بولا۔ "صاحب آج کل بڑی مرسڈیز استعمال کر رہا ہے اس کی آواز بھی ایسی ہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

دلبر جان باہر نکل گیا لیکن اس کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔

"پولیس.........." وہ پرنس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "پولیس مکان کو گھیرے میں لے رہی ہے۔"

پرنس اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال لیا تھا دلبر جان نے بھی لپک کر دری کا کونا اٹھایا اور کلاشنکوف نکال لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سیٹی بجا دی تھی۔

"دھوکا۔" پرنس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باڑ کی طرف دوڑا اسی لمحے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم لوگ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو پولیس نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔"

جواب میں دلبر جان نے فائر کھول دیا۔ پولیس کی طرف سے بھی جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ فائرنگ سے پرنس نے اندازہ لگا لیا کہ اس مکان کو واقعی چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا' گولیاں چاروں طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ سینے کے بل درختوں میں رینگتا ہوا مکان کے پچھلی طرف بڑھنے لگا اس کا خیال تھا کہ اس طرف سے موقع ملا تو ندی کی طرف نکلنے کی کوشش کرے گا۔

وہ رینگتا ہوا باڑ کے قریب پہنچ گیا مگر اس طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی اس طرف سے اگرچہ پولیس پر فائر نہیں ہو رہا تھا مگر پولیس والے بے دریغ گولیاں چلا رہے تھے۔ پرنس نے ابھی تک کوئی گولی نہیں چلائی تھی۔ دوسری طرف سے دلبر جان فائرنگ کر رہا تھا کچھ ہی دیر بعد اس کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی طرف

سے فائرنگ بند ہوگئی وہ شاید ختم ہوگیا تھا مگر پولیس والے بدستور فائرنگ کر رہے تھے۔

پرنس درختوں کی آڑ میں سینے کے بل رینگتا ہوا باڑ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے فرار کا راستہ بنانے کے لئے بائیں طرف پولیس والے پر فائرنگ کر دی۔ جواب میں اتنی گولیاں برسائی گئیں کہ اگر وہ درختوں کی آڑ میں نہ ہوتا تو چھلنی ہو چکا ہوتا۔ اندھا دھند برسائی جانے والی گولیوں سے باڑ کی خشک جھاڑیوں میں آگ لگ گئی۔ جھاڑیاں بالکل سوکھی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیلنے لگی۔ اب پرنس کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

"سیز فائر۔" وہ چیخا۔ "میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔"

جواب میں ایک اور گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد فائرنگ بند ہو گئی۔ "ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو چھلنی کر دیئے جاؤ گے۔" وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

آگ بڑھتی جا رہی تھی پرنس نے پستول پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا سامنے آگیا۔ سب انسپکٹر شجاعت بھی آگے آگیا اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔

"اگر میں غلطی پر نہیں تو تم پرنس ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔" شجاعت علی اسے رائفل کی زد میں لیتے ہوئے بولا۔ "اس رات بنگالی پاڑے سے تو تم بھاگ گئے تھے لیکن آج تو تم پھنس گئے ہو۔"

"اگر میرے ساتھ دھوکا نہ ہوتا تو تمہارے فرشتے بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔" پرنس نے جواب دیا۔

"تم ایک بہادر آدمی ہو۔ اب تک نہ جانے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ ہیروئن کے زہر سے تم نے کتنے گھر اجاڑے ہوں گے اس کی تعداد کا شاید تمہیں بھی علم نہ ہو لیکن میں بہادر آدمیوں کی قدر کرتا ہوں میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرا کوئی آدمی تم پر گولی نہیں چلائے گا میں تین تک گنوں گا ایک.........."

"اور اس کے بعد تم مجھے آلۂ کار بنا کر اپنا بینک بیلنس بڑھانے کی کوشش کرو گے۔ پولیس کے انہی جھانسوں نے تو مجھے ہیروئن کا پرنس بنایا ہے۔" پرنس نے اسے گھورا۔

"دو.........." شجاعت علی بولا۔ اس کے ساتھی حیران تھے کہ وہ کیا کر رہا ہے پرنس جیسے شخص کو بھاگنے کا موقع کیوں دے رہا ہے پرنس بھی اس کی سنجیدگی پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا وہ شجاعت علی کو اچھی طرح پہچانتا تھا وہ ایک فرض شناس آفیسر تھا جرائم پیشہ لوگ اس کا نام سن کر کانپتے تھے لیکن وہ اسے بھاگنے کا موقع کیوں دے رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"تین.........."

شجاعت علی چیخا۔ پرنس مڑ کر دوڑا۔ وہ چھ قدم سے زیادہ دور نہیں جا سکا تھا کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی شجاعت علی کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے پرنس کا جسم چھلنی کر دیا وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔

"دو.......... دھو.......... کا.........." اس کے منہ سے بڑی مشکل سے یہ لفظ نکلا اور وہ ختم ہو گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا سر!" سب انسپکٹر امین نے حیرت سے شجاعت علی کی طرف دیکھا۔

"یہ ہیروئن کا اسمگلر تھا نوجوان نسل کے خون میں زہر گھول کر اسے مفلوج کر رہا تھا۔ اس نے ہزاروں گھر اجاڑے ہوں گے۔ اسے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جاتا تو چند ہزار روپوں کی ضمانت پر رہا ہو جاتا اور دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیتا یہ اسی انجام کا مستحق تھا۔" شجاعت علی نے کہا۔ "موبائل فون پر ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کو اطلاع کر دو۔ دو کانسٹیبل اپنے پاس روک لو اور باقی نفری تھانے بھیج دو میں بھی تھانے پہنچ رہا ہوں۔ شاہد تم میرے ساتھ آؤ۔"

جھاڑیوں میں آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ شجاعت علی اے ایس آئی شاہد کے ساتھ تیز قدم اٹھاتا ہوا جیپ میں آ کر بیٹھ گیا اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

دوسرے روز اے ایس آئی روشن خان کو جرائم پیشہ گروہ کو سرکاری راز فراہم کرنے اور پولیس کی سرگرمیوں کی اطلاعات بہم پہنچانے کے الزام میں معطل کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے دو دن بعد شبینہ نے موبائل فون پر اسے ایک اور اہم اطلاع دے دی۔

"اگر تم اس کارروائی میں کامیاب ہو گئے تو نوری خالد کے خلاف یہ تمہاری بہت بڑی فتح ہو گی لیکن اس بات کا خیال رہے کہ تمہارے عملے میں بعض لوگ اب بھی نوری خالد کے نمک خوار ہیں۔ وہ حق نمک ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔" شبینہ نے اُسے متنبہ کیا۔

"اس کی تم پروا نہ کرو میں ایسی کالی بھیڑوں کو چن چن کر ختم کر دوں گا۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

یہ اطلاع شجاعت کو شام سات بجے کے لگ بھگ ملی تھی لیکن اس نے کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور نہ ہی اپنے افسروں کو اس سلسلے میں آگاہ کیا۔ رات ایک بجے اس نے چھاپہ مار پارٹی تیار کی اس پارٹی میں شامل پولیس اہلکاروں کو آخر وقت تک یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ انہیں کہاں اور کس کے خلاف کارروائی کرنی ہے۔

رات دو بجے گلستان جوہر کے جس مکان کو گھیرے میں لیا گیا وہ سب انسپکٹر شجاعت علی کے تھانے کی حدود میں نہیں تھا لیکن جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی میں شجاعت علی نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ جس جگہ وہ کارروائی کر رہا ہے وہ اس کے علاقے میں ہے یا نہیں۔ اس کا مقصد جرائم پیشہ عناصر کی بیخ کنی کرنا تھا خواہ وہ کسی بھی علاقے میں ہوں۔

اس کارروائی میں شجاعت علی کی پارٹی کو حیرت انگیز طور پر معمولی سی مزاحمت کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مکان میں موجود لوگوں کو اس قسم کی کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی۔ اس مکان میں تین آدمی تھے دو بڑے مزے سے سو رہے تھے۔ تیسرا غالباً پہرے کی ڈیوٹی پر تھا سب سے پہلے شجاعت علی خود مکان میں کودا تھا اور اس نے پہرے دار کو آواز نکالنے کا موقع دیئے بغیر گرفت میں لے لیا تھا اس کے بعد سب کچھ بہت آسان ہو گیا تھا۔ مکان کے اندر سوئے ہوئے باقی دونوں آدمیوں کو بھی بڑے آرام سے حراست میں لے لیا گیا۔

اس مکان سے بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ جدید ساخت کی درجنوں آٹومیٹک رائفلیں، تین لائٹ مشین گنیں دو درجن دستی بم چھ راکٹ درجنوں پستول ریوالور اور ہزاروں گولیاں شامل تھیں۔ تخریب کاری میں استعمال ہونے والا آتش گیر مادہ بھی بڑی مقدار میں برآمد ہوا تھا اور تقریباً بیس کلو ہیروئن بھی قبضہ میں لی گئی تھی۔ اس کارروائی

میں شجاعت علی کی ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ مکان سے جن تین آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں ایک نوری خالد کا بیٹا بھی تھا۔

سب انسپکٹر شجاعت علی کی اس چھاپہ مار کارروائی پر ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اعلیٰ پولیس افسروں اور اہم سیاسی شخصیات کے گھروں میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں شہریوں کو دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آرام دہ بستروں میں میٹھی نیند کے مزے لینے والے یہ لوگ ٹیلی فون پر پیغامات ملنے کے بعد رات کے پچھلے پہر بستر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

شجاعت علی پر چاروں طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا مگر اس نے کسی دباؤ میں آنے یا کسی کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خاک و خون میں لوٹتے ہوئے بے گناہ شہریوں کو کیسے بھول سکتا تھا۔ جو ان دہشت گردوں کا شکار ہوتے تھے۔ ان معصوم نوجوانوں کو کیسے فراموش کر سکتا تھا جو ہیروئن کی لعنت میں مبتلا ہو کر اپنی ہی بوٹیاں نوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیا جرم کیا تھا ان معصوم بچوں نے جنہیں باپ کی شفقت سے محروم کر دیا گیا تھا کیا قصور تھا ان بہنوں کا جن کے جوان اور کڑیل بھائیوں کو قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا گیا تھا۔ اس وقت نہ تو پولیس کے یہ اعلیٰ افسران اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتروں یا گھروں سے نکلے تھے اور اب جبکہ ایک بڑی مچھلی قانون کے جال میں پھنس رہی تھی تو یہ سب لوگ رات کے پچھلے پہر اپنی نیندیں بھی قربان کر کے گھروں سے نکل آئے تھے مگر شجاعت علی نے طے کر لیا تھا کہ وہ ان کے سامنے نہیں جھکے گا۔

شجاعت علی پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا لیکن خوش قسمتی سے اس مرتبہ بھی وہ بچ نکلا۔ حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حملہ نوری خالد کے آدمیوں نے کیا تھا کیونکہ اسے نوری خالد سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ شجاعت علی نے بھی اب اپنی ساری توجہ نوری خالد پر مبذول کر دی تھی کیونکہ شہر میں ایک بار پھر دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہو گیا تھا اور نوری خالد کے خفیہ اڈوں سے اسلحہ تقسیم ہو رہا تھا اور شجاعت علی کو ان اڈوں کی تلاش تھی۔

اس روز شجاعت علی تھوڑی دیر کے لئے گھر آیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھا لیا۔

"یس، شجاعت علی اسپیکنگ۔"

"شبینہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا تھا۔ "اس وقت میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ تمہارے خلاف ایک بڑی خوفناک سازش ہو رہی ہے۔"

"اور یہ سازش نوری خالد تیار کر رہا ہے۔" شجاعت علی نے کہا۔

"ہاں تم نے اس کے بیٹے کو حراست میں لے رکھا ہے۔ وہ زخمی ناگ کی طرح بل کھا رہا ہے لیکن اس سازش میں تمہارے محکمے کے بھی کچھ لوگ شامل ہیں۔" شبینہ نے کہا۔

"سازش کیا ہے؟ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"ابھی مجھے تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ آج رات سارا پتہ چل جائے گا۔ اس وقت تفصیل سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ کل صبح بات کروں گی۔" شبینہ نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ شجاعت علی نے چائے ختم کی اور گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔ دروازے کے سامنے موبائل کھڑی تھی وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور موبائل حرکت میں آ گئی۔ اس موبائل میں چھ مسلح پولیس والے تھے۔ ایک کیبن کی چھت پر رائفل فٹ کئے کھڑا تھا اور باقی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو نے پچھلی طرف رائفلیں تان رکھی تھیں۔ موبائل مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی تھانے پہنچ گئی۔

شبینہ کی شخصیت اس کے لئے پُراسرار بنتی چلی جا رہی تھی۔ وہ خطرناک ترین گروہ کی رکن تھی۔ نوری خالد موت کا فرشتہ تھا۔ سفاک ترین انسان۔ وہ معمولی سی غلطی پر اپنے آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے میں نہیں جھجکتا تھا۔ سب سے پہلے شہباز نامی اس نوجوان کی مثال سامنے آئی تھی جسے شجاعت علی نے حب روڈ سے پکڑ کر مقامی تھانے کے حوالے کیا تھا اور اس کے چند ہی گھنٹوں بعد حوالات ہی میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد خونریزی کے اور بھی ایسے واقعات رونما ہوئے تھے جن میں نوری خالد کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ شجاعت علی اسے گرفت میں لینے کے لئے اس کے گرد جال بن رہا تھا اور شبینہ اس معاملے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ اپنی جان

خطرے میں ڈال کر اسے نوری خالد کے بارے میں اطلاعات فراہم کر رہی تھی اور تمام اطلاعات درست ثابت ہو رہی تھیں۔ چند روز پہلے جب اس نے بلاک فور اے کے کچے مکان میں ہیروئن کے اسمگلر پرنس اور نوری خالد کی ملاقات کی اطلاع دی تھی۔ اگر اے ایس آئی روشن خان نوری خالد کو خبردار نہ کر دیتا تو اس رات اس کا قصہ بھی تمام ہو جاتا۔ نوری خالد خود تو بچ گیا تھا لیکن اس نے پرنس کو خبردار نہیں کیا تھا۔ اس طرح پرنس واقعی دھوکے میں آ گیا تھا۔ شجاعت علی نے پرنس کو گرفتار کرنے کے بجائے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ڈرگ مافیا کے یہ گاڈ فادر چند گھنٹوں سے زیادہ پولیس کی حراست میں نہیں رہ سکتے۔ بڑی بڑی معزز ہستیاں ان کے دفاع کے لئے قانون کے سامنے دیوار بن جاتی ہیں۔

اور پھر شبینہ ہی کی اطلاع پر اس نے گلستان جوہر کے مکان پر چھاپہ مار کر نہ صرف بھاری مقدار میں ہیروئن اور اسلحہ برآمد کر لیا تھا بلکہ نوری خالد کے بیٹے کو گرفتار کر لیا تھا اور حکومت کے ایوانوں تک میں زلزلہ آ گیا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اور دیگر معزز ہستیوں نے اس معاملے کو راز میں رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس معاملے کو آپس ہی میں نمٹا دیا جائے لیکن شجاعت علی نے یہ خبر فوراً ہی پریس کو دے دی تھی اور اس طرح پورے شہر میں ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا۔

اب شبینہ نے اسے اطلاع دی تھی کہ نوری خالد اس کے خلاف کوئی خوفناک سازش تیار کر رہا تھا اور اس سازش میں اس کے محکمے کے بھی کچھ لوگ شامل تھے۔ اس کے محکمے کے بہت سے لوگ اس کے خلاف ہو سکتے تھے۔ وہ افسران بھی جو اس کی فرض شناسی سے خوش نہیں تھے اور اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ شبینہ کو اس سے ہمدردی کیوں تھی؟ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے شجاعت علی کی آنکھ لگ گئی۔

صبح نو بجے سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ گھر والوں نے بھی اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سلطانہ بھی گھر پر ہی تھی۔ وہ اس کے لئے بیڈ ٹی لے آئی۔

"ارے، تم یونیورسٹی نہیں گئیں؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"آج گیارہ بجے جاؤں گی۔" سلطانہ نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے

جواب دیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا تھا۔ وہ دوبارہ رنگ کرے گی۔“

”کس کا فون؟“ شجاعت علی نے اسے گھورا۔

”صدقے جاؤں اس شان بے نیازی کے۔“ سلطانہ مسکرائی۔ ”ارے بھئی۔ وہی لڑکی جو اکثر آپ کو فون کیا کرتی ہے۔“

”اوہ سمجھا۔“ شجاعت علی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ”کب آیا تھا فون تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟“

”آپ رات کو ڈھائی بجے تو آئے تھے۔ اس لئے کسی نے آپ کو جگایا نہیں۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”اس کا فون تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے آیا تھا۔ وہ ساڑھے نو بجے پھر فون کرے گی۔“

شجاعت علی چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چائے ختم کر کے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے فون کی گھنٹی بجی۔ شجاعت علی اس وقت فون کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا وہ شبینہ کی کال تھی۔

”میں فون پر بات نہیں کر سکتی۔“ شبینہ نے اس کی آواز سن کر کہا۔ ”اب سے ایک گھنٹے بعد جھیل پارک کے قریب چائنیز ریسٹورنٹ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم سادہ لباس میں آؤ گے۔ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گیا‘ میں پہنچ جاؤں گا۔“ شجاعت علی نے جواب دیا‘ وہ دوسری طرف سے کچھ اور سننے کا منتظر تھا لیکن شبینہ نے فون بند کر دیا تھا۔ شجاعت علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی ایسی جگہ پر تھی جہاں سے وہ کھل کر یا زیادہ دیر تک بات نہیں کر سکتی تھی۔

شجاعت علی نے کریڈل ٹیپ کر کے اپنے تھانے کا نمبر ملایا۔ ریسیور سب انسپکٹر امین نے اٹھایا تھا۔ اس سے تھانے اور علاقے کی صورت حال معلوم کی۔ پھر بولا۔

”ٹھیک ہے امین‘ میں ایک ذاتی کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو تم نمٹا لینا میں ذرا دیر سے آؤں گا۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا اور ناشتے کی میز پر آ گیا۔ سلطانہ نے بھی ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتے کے بعد شجاعت علی جب تیار ہو کر گھر سے نکلا تو سوا دس بج رہے تھے۔ کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر میں اس کا سروس ریوالور موجود تھا۔ شبینہ اب تک اگرچہ اس سے ہمدردی کا

اظہار کرتی رہی تھی۔ اس نے بڑی اہم اطلاعات بھی فراہم کی تھیں جو سب کی سب درست ثابت ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اب تک اسے جو اطلاعات فراہم کی جاتی رہی ہوں ان کا مقصد اس کا اعتماد حاصل کرنا ہو۔ کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے تھوڑی بہت قربانی ضرور دینی پڑتی ہے اور وہ بڑا مقصد اس کی موت کے سوا کیا ہو سکتا تھا اور اب تو نوری خالد کا بیٹا بھی اس کی حراست میں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو چھڑانے کے لئے اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

اس نے سب انسپکٹر امین کو اسے لینے کے لئے موبائل بھیجنے کو منع کر دیا تھا۔ ایک مسلح کانسٹیبل اس کے مکان پر چوبیس گھنٹے موجود رہتا تھا۔ جب وہ گیٹ سے باہر نکلا تو سنتری اسے دیکھتے ہی اٹینشن ہو گیا۔ شجاعت علی اس کی خیریت دریافت کرتا ہوا گلی میں مڑ گیا۔ مین روڈ پر آ کر اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔

”طارق روڈ۔“ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جب وہ جھیل پارک کے قریب ٹیکسی سے اترا تو پونے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ پندرہ منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چائنیز ریسٹورنٹ کی طرف چلنے لگا۔ ریسٹورنٹ کے دروازے میں داخل ہوتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ عجیب بات تھی وہ موت کا سامنا کرتے ہوئے کبھی نہیں گھبرایا تھا لیکن ایک لڑکی کے سامنے جاتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی۔ شاید دل کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہوں۔

پُرسکون ریسٹورنٹ میں صرف تین میزوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک میز پر ایک جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مرد کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہو گی جبکہ اس کی ساتھی عورت تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

شجاعت علی اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ان گاہکوں کے علاوہ اور کوئی گاہک نہیں تھا۔ شجاعت علی نے ریسٹورنٹ میں موجود نیلی ساڑھی والی واحد عورت کی طرف دیکھا۔ اس میں شبینہ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شبینہ آ کر چلی تو نہیں گئی تھی۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے آ گیا جہاں ایک بھاری بھرکم پستہ قامت چینی عورت

کھڑی تھی۔

"یس پلیز؟" چینی عورت نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پچھلے آدھے گھنٹے کے دوران یہاں کوئی اکیلی لڑکی تو نہیں آئی؟" شجاعت علی نے انگریزی میں پوچھا اور یادداشت کے سہارے شبینہ کا حلیہ بتانے لگا۔

"نہیں۔" عورت نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اگر آپ کی دوست نے آپ کو وقت دیا ہے تو وہ ضرور آئے گی۔ آپ تشریف رکھئے پلیز۔"

شجاعت علی مسکراتا ہوا ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ دروازے پر سائیڈ اسٹریٹ کی طرف نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے چند ہی منٹ بعد ویٹر آ گیا وہ خوبصورت مینو اس کے سامنے رکھنا ہی چاہتا تھا کہ شجاعت علی بول اٹھا۔

"فی الحال صرف ایک کپ کافی۔"

"یس سر۔" ویٹر سر ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

دس منٹ بعد شجاعت علی کے سامنے کافی موجود تھی۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کبھی دروازے کی طرف اور کبھی سائیڈ اسٹریٹ کی طرف دیکھنے لگتا۔ اسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جا رہی تھیں۔ گیارہ بج گئے اور پھر سوا گیارہ .... لیکن شبینہ نہیں آئی۔ ساڑھے گیارہ بج گئے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی سوال تھا۔ شبینہ کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ خود اس نے اسے یہاں آنے کے لئے وقت دیا تھا۔ اسے آنا چاہئے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا راز کھل گیا ہو اور وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہو؟ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

اس دوران ریسٹورنٹ میں کچھ گاہک نئے آئے تھے اور کچھ چلے گئے تھے۔ نئے گاہکوں میں دو جوان لڑکیاں بھی تھیں جن کا تعلق کسی دولت مند اور فیشن ایبل گھرانے سے تھا۔ انہوں نے شاپنگ بیگ اٹھا رکھے تھے جو انہوں نے اپنی میز کی ایک کرسی پر رکھ دیئے تھے۔ شجاعت علی نے بڑی گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی میں بھی مشابہت کی جھلک نہیں تھی شجاعت علی اپنی جگہ پر بیٹھا شبینہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ کسی آٹومیٹک رائفل سے مسلسل

فائرنگ ہو رہی تھی۔ ریسٹورنٹ کا شیشے والا دروازہ اگرچہ بند تھا لیکن آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے فائرنگ کہیں قریب ہی ہوئی ہو۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی چینی عورت نے چیخ کر کچھ کہا اور ملازموں نے دوڑ کر باہر سے شٹر گرا دیئے اور سائیڈ اسٹریٹ والے دروازے سے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ شجاعت علی بے چین ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریسٹورنٹ میں موجود تمام گاہکوں کے چہروں پر خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے تو ایک دم دھواں ہو گئے تھے۔

شجاعت علی اپنا بل ادا کر چکا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ ایک ویٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ سائیڈ اسٹریٹ کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس کے نکلتے ہی ویٹر نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس وقت دو تین اور گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ شجاعت علی کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ طارق روڈ کی کسی دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ وہ سائیڈ اسٹریٹ سے نکل کر سڑک پر آیا ہی تھا کہ طارق روڈ کی طرف سے ایک پولیس موبائل آتی دکھائی دی۔ شجاعت علی دوڑ کر دوسری سڑک پر آ گیا اور موبائل کو رکنے کا اشارہ کیا۔ موبائل رک گئی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک نوجوان اے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اس طرف فائرنگ ہو رہی ہے اور تم مخالف سمت میں جا رہے ہو۔" شجاعت علی نے کہا۔

"تم کون ہو؟" اے ایس آئی نے اسے گھورا۔

"میں پولیس آفیسر ہوں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی دکان میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ اس طرف جا کے ڈاکوؤں کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

"ہمیں اپنی جان زیادہ عزیز ہے پولیس آفیسر صاحب۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے چلو احمد........" اے ایس آئی نے آخری دو الفاظ ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہے تھے۔

موبائل ایک جھٹکے سے حرکت میں آ کر بائیں طرف جھیل پارک کے کنارے والی سڑک پر مڑ گئی۔ شجاعت علی موبائل کو دیکھتا رہ گیا جس کے پچھلے حصے میں چھ کانسٹیبل

رائفلیں لئے بیٹھے تھے۔ شجاعت علی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لبرٹی والے چوک پر آ گیا۔

دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں اور طارق روڈ پر دیکھتے ہی دیکھتے سناٹا چھا گیا تھا۔ لبرٹی چوک پر ٹریفک کنٹرول کرنے والا کانسٹیبل کیفے لبرٹی میں گھس رہا تھا۔ شجاعت علی نے طارق روڈ پر دائیں بائیں دیکھا۔ دونوں طرف دور دور تک دکانیں بند ہو چکی تھیں کیفے لبرٹی کے شٹر بھی گرائے جا چکے تھے۔ صرف ایک دروازہ کھلا تھا۔ شجاعت علی سڑک پار کر کے لبرٹی میں گھس گیا۔

"فائرنگ کہاں ہوئی تھی؟" اس نے ٹریفک کانسٹیبل سے پوچھا جو ایک طرف کھڑا پانی پی رہا تھا۔

"خالد بن ولید روڈ کی طرف۔" کانسٹیبل نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتے ہوئے جواب دیا۔

شجاعت علی کچھ دیر ریسٹورنٹ میں کھڑا رہا پھر باہر آ گیا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا اکا دکا پیدل راہ گیر دکھائی دے رہے تھے جو بڑی عجلت میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شجاعت علی کو تقریباً بیس منٹ بعد پتہ چل سکا کہ فائرنگ خالد بن ولید روڈ کے کسی بنگلے میں ہوئی تھی۔ شجاعت علی ڈیوٹی پر نہیں تھا نہ ہی یہ اس کا علاقہ تھا مگر ایک تجسس تھا جو اسے اکسا رہا تھا۔ وہ معلوم کرتا ہوا بالآخر تقریباً دس منٹ بعد جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ ایک دو منزلہ بنگلے کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

"کیا ہوا.......... ڈاکہ پڑا ہے کیا؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"قیامت آ گئی ہے جناب قیامت.........." اس آدمی نے جواب دیا۔ "دو ڈاکو تھے یا دہشت گرد.......... بنگلے کے اندر کئی لوگوں کو قتل کر گئے ہیں۔"

شجاعت علی لوگوں کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ واقعی قیامت کا منظر تھا۔ عورتوں کی چیخوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بنگلے کے گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں خون میں لت پت سات آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔

ایک آدمی نے پوچھنے پر بتایا کہ وہ تیسرے بنگلے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے بنگلے کی اوپر والے ایک کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا کہ اس نے ایک کار اس بنگلے کے سامنے رکتے

دیکھی۔ ایک آدمی نے اتر کر بیل بجائی اور جب دروازہ کھلا تو چار آدمی کار سے اتر کر زبردستی بنگلے میں داخل ہو گئے۔ ان چاروں کے پاس رائفلیں تھیں۔

اس شخص کے کہنے کے مطابق اس نے فوراً ہی ایمرجنسی نمبر پر پولیس کو صورت حال سے آگاہ کر دیا پھر تھوڑی دیر بعد جب فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی تو اس نے دوبارہ پولیس کو فون کیا۔ اس شخص کے مطابق دہشت گرد یا ڈاکو تقریباً بیس منٹ تک بنگلے میں رہے اور پھر بڑے اطمینان سے کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ اس نے پھر پولیس کو اطلاع دی اور اپنے بنگلے سے نکل کر یہاں آ گیا۔ پڑوس کے اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔

دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بننے والے تین سگے بھائی تھے اور باقی کزن وہ سب اس ڈبل اسٹوری بنگلے میں رہتے تھے۔

شجاعت علی نے گھڑی دیکھی۔ اس واردات کو رونما ہوئے پچپن منٹ ہو چکے تھے لیکن پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

اس منظر نے شجاعت علی کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ وہاں پر جمع لوگ پولیس کی لاپروائی کی وجہ سے خاصے مشتعل نظر آ رہے تھے۔ شجاعت علی نے بھی اپنی شناخت ظاہر نہیں کی تھی اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب پولیس پہنچ گئی تو وہ وہاں سے کھسک گیا۔ تھانے پہنچ گیا۔ شجاعت علی اپنے تھانے میں تھا۔ شام سات بجے اسے گھر سے فون ملا اس کے والد تھے۔

"شجاعت بیٹا۔" اس کے والد نے کہا۔ "سلطانہ ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچی۔"

"کیا؟" شجاعت علی اچھل پڑا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ہو سکتا ہے وہ اپنی کسی دوست کے ہاں چلی گئی ہو۔"

"وہ ایسی غیر ذمے دار تو نہیں۔ کسی دوست کے ہاں جاتی تو فون پر اطلاع ضرور دیتی۔" اس کے والد نے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں میں پتہ کرتا ہوں۔" شجاعت علی نے والد کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ وہ سلطانہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ "یس سب انسپکٹر شجاعت علی اسپیکنگ۔"

"اس آواز کو ذرا غور سے سنو سب انسپکٹر۔" دوسری طرف سے کہا گیا چند لمحے

خاموشی رہی پھر ریسیور پر سلطانہ کی آواز سنائی دی۔ "بھیا .... انہوں نے مجھے..........." آواز بند ہو گئی۔

"سلطانہ.........." شجاعت علی ماؤتھ پیس میں چیخا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ریسیور ابھی تک اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

"ہماری اگلی کال کا انتظار کرو سب انسپکٹر۔" دوسری طرف سے ایک بھاری آواز میں کہا گیا اور لائن بے جان ہو گئی۔

شجاعت علی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

سب انسپکٹر شجاعت علی سکتے کی سی کیفیت میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ جب اس کے باپ نے فون کیا تھا تو وہ یہی سمجھا تھا کہ سلطانہ یونیورسٹی سے واپسی پر اپنی کسی دوست کے ہاں چلی گئی ہو گی لیکن صورت حال بہت مختلف اور بہت سنگین ثابت ہوئی تھی۔ کسی نے سلطانہ کو اغوا کر لیا تھا اسے یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ سلطانہ ان کے قبضے میں تھی۔ تصدیق کے لئے اسے سلطانہ کی آواز بھی سنا دی گئی تھی لیکن وہ کون ہو سکتے تھے؟

ایک بہت بڑا سوالیہ نشان شجاعت علی کی نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ اپنی پولیس کی ملازمت کے دوران اس نے ہمیشہ فرض شناسی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کبھی کسی بڑے سے بڑے شخص کی سفارش قبول نہیں کی تھی۔ کبھی کسی دباؤ میں نہیں آیا تھا رشوت کی پیشکش کرنے والوں کو بھی اس نے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس نے ہمیشہ دیانتداری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کی اسی دیانتداری اور فرض شناسی کے باعث اس کے بعض افسران بھی اس کے مخالف ہو گئے تھے۔

بہت کم لوگ ایسے تھے جو خدمت کا جذبہ لے کر اس محکمے میں آئے تھے۔ پولیس میں آنے والوں کے ذہن میں صرف ایک بات ہوتی تھی۔ دولت کا حصول' پولیس کا محکمہ دولت کے حصول کا بہترین ذریعہ تھا اور اس محکمے میں آنے والے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے لیکن شجاعت علی اس محکمے میں دولت سمیٹنے نہیں آیا تھا۔ وہ جرائم پیشہ عناصر کی بیخ کنی کا عزم لے کر اس محکمے میں آیا تھا۔ وہ معاشرے کی اصلاح

میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتا تھا وہ اپنے کردار کی حد تک اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ کسی دباؤ میں آئے بغیر وہ اپنی ذمہ داریاں نبھاتا رہا اپنے ہی محکمے میں قدم قدم پر اس پر دباؤ پڑا تھا قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ اس کے ایک دو نہیں بیسیوں دشمن تھے۔ محکمے کے اندر اور محکمے کے باہر اس کے یہ دشمن اسے نقصان پہنچانے کے لئے موقع کی تاک میں رہتے تھے اس پر کئی بار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے لیکن وہ ہر مرتبہ بچ گیا تھا اس کے دشمن موقع کی تاک میں تھے اور بالآخر کسی کا داؤ چل گیا تھا اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا تھا وہ اس کے دشمنوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سلطانہ کو اغوا کرنے والا کون تھا۔ البتہ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے انتظار کرنے کو کہا تھا۔

"سر! کیا بات ہے۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

یہ آواز سن کر شجاعت علی چونک گیا اس کے خیالات منتشر ہو گئے اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اے ایس آئی شاہد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اوہ! کوئی بات نہیں شاہد۔" شجاعت علی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر کوئی بات تو ہے۔" اے ایس آئی شاہد اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اس طرح پریشان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا افسران کی طرف سے کوئی نیا آرڈر یا کوئی گھریلو مسئلہ ہے؟"

"ابھی ایک فون آیا تھا۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "سلطانہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"کیا..........؟" اے ایس آئی شاہد اچھل پڑا۔ "یہ کب کی بات ہے؟ کون ہیں وہ لوگ؟"

"پتہ نہیں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "سلطانہ صبح حسب معمول یونیورسٹی گئی تھی واپس گھر نہیں پہنچی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے ڈیڈی کا فون آیا تھا انہوں نے بتایا میرا خیال تھا کہ وہ اپنی کسی دوست کے ہاں چلی گئی ہو گی میں اس کی ایک دوست کو فون کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ کال ملی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے مجھے دوسری کال کا انتظار کرنے کو کہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ بلف ہو' کوئی آپ کو پریشان کرنا چاہتا ہو۔" شاہد نے کہا۔

"نہیں۔" شجاعت علی بولا۔ "انہوں نے مجھے فون پر سلطانہ کی آواز سنائی تھی۔"

"اوہ۔" اے ایس آئی شاہد کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔

"وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔"

"یہ معلوم ہو جاتا تو میں اس طرح یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔

"ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے سر!" اے ایس آئی شاہد نے کہا۔ شجاعت علی سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "نوری خالد۔" اے ایس آئی شاہد کہہ رہا تھا۔ "اس کا بیٹا فریدی آپ کی تحویل میں ہے ہو سکتا ہے اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر سلطانہ بہن کو اغوا کیا ہو۔ انہوں نے کوئی مطالبہ پیش کیا؟"

"نہیں۔" شجاعت علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی مطالبہ نہیں کیا کوئی بات نہیں ہوئی مجھے سلطانہ کی آواز سنانے کے بعد کہا گیا کہ ان کی اگلی کال کا انتظار کروں اور میں ان کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہوں۔" اے ایس آئی شاہد نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں موبائل تیار رکھتا ہوں جیسے ہی کوئی اطلاع ملے گی ہم ریڈ کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔"

"وہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں ہوں گے کہ ہمیں فوراً اپنے بارے میں بتا دیں۔" شجاعت علی نے کہا۔ "ہمیں بہرحال ان کی کال کا انتظار کرنا چاہئے۔"

اور انتظار طویل ہوتا چلا گیا رات کے گیارہ بج گئے جب بھی فون کی گھنٹی بجتی شجاعت علی لپک کر ریسیور اٹھا لیتا لیکن وہ کال نہیں آ رہی تھی جس کا اسے انتظار تھا تین چار مرتبہ گھر سے کال آئی تھی شجاعت علی نے ہر مرتبہ اپنے والد کو تسلی دے کر ٹال دیا تھا انہیں اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا کہ سلطانہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔

سلطانہ کے اغوا کی خبر تھانے سے نکل کر اوپر تک پہنچ چکی تھی بعض افسران نے بھی فون کر کے اس سے صورت حال معلوم کی تھی۔ ڈی آئی صاحب کے حکم پر پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کر دیا گیا تھا اور شہر کی ہر سڑک پر گاڑی کو چیک کیا جا رہا تھا لیکن شجاعت علی کے خیال میں یہ سب کچھ بیکار تھا۔ سلطانہ کو اغوا کرنے والے اسے کسی گاڑی میں لے کر تو نہیں گھوم رہے ہوں گے۔ سلطانہ کو کسی ایسی جگہ پر رکھا گیا ہو گا

جہاں سے کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے۔

اس تھانے میں تین ٹیلیفون تھے اور ڈی آئی جی صاحب کے حکم پر ٹیلیفون ایکسچینج میں ان تینوں ٹیلیفونز پر آبزرویشن لگوا دیا گیا تھا تاکہ اگر اغوا کنندگان کسی بھی فون پر رابطہ قائم کریں تو ان کا نمبر معلوم کیا جا سکے اس طرح فون نمبر سے ان کے ٹھکانے کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔

گیارہ بج کر بیس منٹ پر وائرلیس پر اطلاع ملی کہ دہشت گردوں کی ایک پارٹی نے ایک شاپنگ سینٹر پر ہلہ بول دیا تھا ان کی فائرنگ سے دو راہ گیر ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ایک پولیس موبائل اس طرف پہنچ گئی پولیس کو دیکھ کر دہشت گردوں نے سرخ رنگ کی ایک شیراڈ پر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پولیس نے تعاقب جاری رکھا۔ گلشن کے علاقے میں پہنچ کر پولیس کی فائرنگ سے سرخ شیراڈ کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ دہشت گردوں نے کار چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کی ایک دہشت گرد پولیس کی گولی سے ہلاک ہو گیا جبکہ تین دہشت گردوں نے ایک بنگلے میں گھس کر مکینوں کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پولیس موبائل کے چار کانسٹیبلوں اور اس پارٹی کے انچارج سب انسپکٹر نے اس بنگلے کو گھیرے میں لے کر وائرلیس پر کنٹرول سے رابطہ قائم کر کے مدد طلب کی تھی۔

یہ علاقہ سب انسپکٹر شجاعت علی کا تھا۔ وہ اطلاع ملتے ہی اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔

"شاہد! تم نے کہا تھا کہ ایک موبائل اسٹینڈ بائی پر ہے۔" وہ شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یس سر۔" شاہد نے جواب دیا۔ "لیکن آپ یہاں رکئے سر! اگر اس دوران سلطانہ کو اغوا کرنے والوں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی اور آپ نہ ملے تو سلطانہ کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ آپ یہیں رکئے ہم جا رہے ہیں۔"

"سلطانہ کی زندگی ان لوگوں سے زیادہ قیمتی نہیں جنہیں ان دہشت گردوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "موبائل پر چلو ہری اپ اور آپریٹر۔" وہ وائرلیس آپریٹر کی طرف گھوم گیا۔ "علاقے میں گشت کرنے والی تمام موبائلز کو لوکیشن بتا کر وہاں پہنچنے کی ہدایت کرو جلدی۔"

وہ بڑی عجلت میں تھانے سے نکل گیا اے ایس آئی شاہد پہلے ہی باہر پہنچ چکا تھا۔

موبائل کے کانسٹیبلوں میں سے دو تو موبائل ہی میں بیٹھے ہوئے تھے اور باقی کانسٹیبل باہر کھڑے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اے ایس آئی شاہد نے انہیں حکم دیا تو وہ سب سگریٹ پھینک کر رائفلیں سنبھالتے ہوئے موبائل میں بیٹھ گئے۔ ایک کانسٹیبل نے اگلی سیٹوں پر پیر جما کر کیبن کی چھت پر آٹومیٹک رائفل نکالی تھی۔ شجاعت علی کے بیٹھتے ہی موبائل حرکت میں آ گئی اور تیز رفتاری سے اس علاقے کی طرف دوڑنے لگی جہاں دہشت گردوں نے بنگلے کے مکینوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔

انہیں اس علاقے میں پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ٹھیک اس وقت ایک اور موبائل بھی پہنچ گئی تھی اس موبائل کا انچارج سب انسپکٹر امین تھا‘ دہشت گردوں کا تعاقب کرنے والی موبائل کے پولیس والوں نے بنگلے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور دہشت گردوں اور پولیس والوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ شجاعت علی اور سب انسپکٹر امین کے آدمیوں نے بھی بنگلے کو گھیرے میں لے لیا۔

بنگلے سے فائرنگ کے ساتھ چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں تھیں۔ سب انسپکٹر شجاعت علی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ گھر کے مکینوں کو کسی کمرے میں بند کر دیا گیا تھا اور تینوں دہشت گرد مختلف سمتوں سے پولیس پر فائرنگ کر رہے تھے۔

شجاعت علی نے آتے ہی کنٹرول سنبھال لیا اور صورت حال کا جائزہ لینے لگا سب سے زیادہ سنگین بات یہ تھی کہ ان دہشت گردوں نے گھر کے مکینوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ شجاعت علی کو سب سے زیادہ فکر انہی کی تھی۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے تمام پولیس والوں کو بنگلے کے چاروں طرف پھیلا دیا اور فائرنگ رکوا دی۔

پہلے شجاعت علی نے دہشت گردوں سے مذاکرات کی کوشش کی دہشت گردوں کا مطالبہ تھا کہ انہیں ایک گاڑی فراہم کی جائے اور پولیس کو وہاں سے ہٹا لیا جائے لیکن شجاعت علی کا کہنا تھا کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں تو ان کے ساتھ کچھ رعایت کی جائے گی لیکن دہشت گرد ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے۔

شجاعت علی نے سب انسپکٹر امین اور اے ایس آئی شاہد کو ہدایت کی کہ وہ دہشت گردوں کو الجھائے رکھیں وہ خود گلی میں اوپر سے گھوم کر عقبی سمت والے بنگلے میں چلا گیا اس بنگلے کے مکین بھی خوفزدہ ہو کر کسی بنگلے میں چلے گئے تھے گھر میں صرف ایک

آدمی تھا چھت پر دو پولیس والے مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔

شجاعت علی اس بنگلے کی دیوار پر چڑھ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا اس طرف بنگلے کی ایک کھڑکی سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ شجاعت علی کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ فائرنگ بائیں طرف کونے والے پورشن سے ہو رہی تھی جبکہ دائیں طرف کا پورشن خالی تھا وہ دہشت گرد بنگلے کے سامنے اور دائیں پہلو سے پولیس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ صرف بایاں پہلو ایسا تھا کہ کوئی کوشش کی جا سکتی تھی بنگلے کے بائیں پہلو میں تقریباً پانچ فٹ چوڑا گلیارا سا تھا اس طرف ایک بیڈ روم اور کچن کی کھڑکی تھی جبکہ لاؤنج کا ایک دروازہ بھی اس گلیارے میں کھلتا تھا۔

شجاعت علی دونوں کانسٹیبلوں کو کچھ ہدایات دے کر اس عقبی بنگلے سے ساتھ والے بنگلے میں کود گیا اور پھر اس بنگلے کی چھت پر چلتا ہوا دہشت گردوں والے بنگلے کے بائیں دیوار کی طرف آ گیا۔ چھت پر سینے کے بل رینگتا ہوا کنارے پر آ کر اس نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ سمت اس کے نقطۂ نظر سے محفوظ تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے چھت سے دیوار پر آ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نہایت احتیاط سے ساتھ والے بنگلے کے گلیارے میں اتر آیا۔

اب وہ پوری طرح خطرے میں گھر چکا تھا۔ دہشت گردوں میں سے کسی کو اگر یہاں اس کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو اسے گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیا جاتا اس کے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن وہ بہرحال خطرات سے کھیلنے کا عادی تھا اور اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ جب تک اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالا جائے جرائم پیشہ افراد پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

وہ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ بڑی احتیاط سے آگے رینگ رہا تھا کچن کے قریب پہنچ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا کچن کی کھڑکی پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اوپر اگیزاسٹ فین لگا ہوا تھا اندر داخل ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آگے بیڈ روم کی کھڑکی پر بھی گرل لگی ہوئی تھی اور دروازہ بھی اندر سے لاک تھا۔ شجاعت علی نے رک کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ کمرے میں تاریکی تھی اور کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ گھر کے مکینوں کو کسی اور کمرے میں بند کیا گیا تھا شجاعت علی آگے بڑھ گیا اس طرف نکلنے والا لاؤنج کا دروازہ

بھی اندر سے لاک تھا۔

شجاعت علی دوبارہ بیڈ روم والی کھڑکی کے قریب آگیا اور گہری نظروں سے کبھی کھڑکی اور کبھی دروازے کو دیکھنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اندر کیسے داخل ہوا جائے۔ اس نے ایک ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ دیوار پر تھا۔ وہ اسی طرح دیوار پر ہاتھ رکھے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ دفعتاً چونک گیا اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دیوار پر کھڑکی وغیرہ کا کوئی ٹکڑا الگ سے لگایا گیا ہے۔ وہ دیوار کو ٹٹول کر دیکھنے لگا اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

کھڑکی کے ساتھ دیوار میں اس جگہ ایئر کنڈیشنر لگانے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی لیکن ایئر کنڈیشنر نہیں لگایا گیا تھا اور دیوار میں اس سوراخ کو بند کرنے کے لئے لکڑی کا تختہ لگا دیا گیا تھا شجاعت علی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے تختہ اکھاڑا جا سکے۔ پھر وہ جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس کی جیب میں چابیوں کے گچھے میں ایک نیل کٹر بھی تھا اس نے نیل کٹر میں لگا ہوا چاقو والا چھوٹا سا پھل باہر نکال لیا اور اس کی نوک سے تختہ اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

پولیس اور دہشت گردوں میں مقابلہ جاری تھا فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی بنگلے سے کسی عورت یا بچے کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ شجاعت علی نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ چند منٹ کی کوشش سے تختے کا کونہ ذرا سا اٹھ گیا۔ شجاعت علی نے ریوالور کی نالی تختے میں پھنسا دی اور اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ایک کیل اکھڑ گئی۔

شجاعت علی کو یقین تھا کہ فائرنگ کی آوازوں میں چرچراہٹ کی یہ معمولی سی آواز نہیں سنی گئی ہو گی پھر بھی احتیاطاً اس نے ہاتھ ہٹا لیا اور دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ گزر گیا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ دوبارہ تختہ اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا ایک کیل اکھڑ جانے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا۔ اس نے تختے کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑی آسانی سے اکھاڑ لیا۔

اس نے تختے کو بڑی آہستگی سے زمین پر رکھ دیا اور اس خلا کے اندر دیکھنے لگا۔ اندر کی طرف بھی ایک تختہ لگا ہوا تھا شجاعت علی کھڑکی کی گرل پکڑ کر لٹک گیا اور ایک پیر اس خلا میں ڈال کر اندر والے تختے کو دھکیلنے لگا اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ تھوڑی سی

کوشش کے بعد اندر والا تختہ بھی اکھڑ گیا۔

یہ خلا خاصا چوڑا تھا اور ایک آدمی بڑی آسانی سے رینگتا ہوا اس کے اندر سے گزر سکتا تھا شجاعت علی کو بھی اس کے اندر سے گزرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

کمرے میں تاریکی تھی وہ ریوالور ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو وہ دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا اس نے دروازے کے کی ہول سے جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف وسیع ہال تھا روشنی ہو رہی تھی لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے بڑی آہستگی سے گھمانے لگا چند انچ کے قریب دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا اس نے دروازہ کچھ اور کھول دیا۔ سامنے دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس کمرے میں اگرچہ بتی نہیں جل رہی تھی لیکن کھڑکی کے قریب ایک آدمی کھڑا ہوا نظر آ گیا اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی اور وہ باہر کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

شجاعت علی ریوالور سنبھالے کمرے سے نکل آیا۔ ہال کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ شجاعت علی دبے قدموں تیزی سے چلتا ہوا سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ دہشت گرد نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا شجاعت علی ریوالور سنبھالے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ اس دہشت گرد کو پشت سے جا کر گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تین چار قدم کے فاصلے پر تھا کہ اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آہٹ سن کر دہشت گرد پلٹا۔ ایک پولیس والے کو دیکھ کر اچھل پڑا اور تیزی سے پلٹا۔

شجاعت علی نے بھی چھلانگ لگا دی دہشت گرد نے پلٹتے ہی گولی چلا دی۔ گولی شجاعت علی کے بائیں بازو میں لگی۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی لیکن اس نے دہشت گرد کو گرفت میں لے لیا تھا۔ ان دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ دونوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ شجاعت علی نے اپنا ریوالور پھینک کر اس کی رائفل کو گرفت میں لے لیا تھا۔ بازو زخمی ہونے کے باوجود وہ اس سے رائفل چھیننے کے لئے پوری قوت استعمال کر رہا تھا اور اس کھینچا تانی میں رائفل کا ٹریگر دب گیا۔ گولی شجاعت علی کے سر

سے چند انچ کے فاصلہ سے گزرتی ہوئی چھت میں پیوست ہو گئی لیکن بالآخر شجاعت علی اس سے رائفل چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ دہشت گرد پشت کے بل نیچے گرا تھا۔ شجاعت علی نے اسے فوراً ہی رائفل کی زد پر لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر اپنا ریوالور بھی اٹھا لیا تھا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" شجاعت علی کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ دہشت گرد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شجاعت علی نے اس کا لباس تھپتھپا کر دیکھا۔ اس کی پتلون کی جیب میں ٹی ٹی پستول بھی موجود تھا جسے شجاعت علی نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ "اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلاؤ اور انہیں کوئی اشارہ مت کرنا ورنہ تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔" شجاعت علی نے کہا۔

شجاعت علی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دہشت گرد دروازے کے سامنے تھا۔ شجاعت علی نے رائفل کی نالی اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ دروازے کے باہر سے شجاعت علی کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دہشت گرد نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں۔ وہ دونوں مختلف کمروں سے نکل کر ہال میں آ گئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ وہ شاید سمجھ گئے تھے کہ پولیس کے گھیرے سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔

شجاعت علی تیسرے دہشت گرد کو رائفل کی زد پر لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

"رائفلیں پھینک دو..........." شجاعت علی دھاڑا۔ "اگر تم لوگوں نے کوئی گڑبڑ کی تو اسے گولی سے اڑا دوں گا اور تم لوگ بھی نہیں بچ سکو گے۔"

وہ دونوں دہشت زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر رائفلیں پھینک دیں۔ شجاعت علی نے تیسرے دہشت گرد کو بھی دھکا دے کر ان کے قریب پہنچا دیا۔

"تم تینوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہاتھ سر سے اوپر ہونے چاہئیں۔" شجاعت علی نے حکم دیا۔

وہ تینوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ سر سے اوپر دیوار پر ٹکا دیئے تھے۔ شجاعت نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے سب انسپکٹر امین کو آواز دی۔ باہر سے فائرنگ بند ہو گئی۔ ایک

منٹ کے اندر اندر پولیس والے دوڑتے ہوئے دیواریں پھاند کر اندر آ گئے۔ شجاعت علی نے دروازہ کھول دیا۔ سب سے آگے سب انسپکٹر امین تھا۔

"گھر والے شاید اس کمرے میں ہیں۔ دروازہ کھول کر انہیں باہر نکالو۔" شجاعت علی نے کہا۔

امین اس کمرے کی طرف دوڑ گیا اور دوسرے پولیس والے تینوں دہشت گردوں پر ٹوٹ پڑے۔ شجاعت علی اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے سامنے ڈی ایس پی صاحب کھڑے تھے۔ شجاعت علی نے سلیوٹ کے لئے ہاتھ اٹھا دیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے سلیوٹ کا جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

☆======☆======☆

رات کے دو بج گئے تھے۔

شجاعت علی نے تھانے واپس پہنچتے ہی ڈیوٹی محرر سے معلوم کیا کہ اس کے لئے کوئی فون تو نہیں آیا تھا۔

"آپ کے گھر سے کئی بار فون آ چکا ہے سر! والدہ اور والد بہت پریشان ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے لئے اور کوئی فون نہیں آیا۔" محرر نے بتایا۔

شجاعت اپنے دفتر میں گھس گیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی۔ ظاہر ہے جوان بیٹی کی گمشدگی کے بعد ماں باپ کو نیند کیسے آ سکتی تھی۔ اس وقت کال اس کی والدہ نے ریسیو کی تھی۔

"تم کہاں ہو بیٹا؟" ماں جی نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔ "کئی مرتبہ فون کر چکی ہوں۔ ہر مرتبہ یہی پتہ چلا کہ تم کہیں چھاپہ مارنے گئے ہوئے ہو۔"

"جی ماں جی!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "چند دہشت گردوں نے ایک بنگلے میں گھس کر مکینوں کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پولیس پارٹی لے کر وہیں گیا ہوا تھا۔"

"دوسروں کے لئے تم نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ اپنی جان چوبیس گھنٹے خطرے میں ڈالے ہوئے ہو۔ تمہاری اپنی بہن لاپتہ ہے اور تمہیں کوئی احساس نہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے کہہ دیا ماں جی۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میرا تو ایک ایک لمحہ

اذیت میں گزر رہا ہے۔"

"سلطانہ کے بارے میں کچھ معلوم کیا۔ پتہ چلا اس کا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"جی ماں جی۔" شجاعت علی نے مردہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "اسے کچھ لوگوں نے اغوا کرلیا ہے۔ مجھ سے ان کا ایک رابطہ ہو چکا ہے۔"

"کک..........کیا..........؟" ماں جی کی ہکلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"حوصلہ رکھئے ماں جی۔" شجاعت علی جلدی سے بولا۔ "سلطانہ بالکل خیریت سے ہے۔ میری اس سے بھی بات ہوئی تھی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پتہ چلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ سلطانہ کو جلد ہی بازیاب کرا لیا جائے گا۔"

"میں پریشان نہ ہوں۔" ماں جی نے کہا۔ "میری جوان بیٹی غنڈوں اور بدمعاشوں کے قبضہ میں ہے اور تم کہتے ہو میں پریشان نہ ہوں۔"

"ماں جی۔" شجاعت علی نے کہا۔ "میں بھی اس کا بھائی ہوں۔ جب تک وہ نہیں مل جاتی میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا اور ہاں۔ اگر میرے لئے کوئی فون آئے تو کہہ دیجئے تھانے کے نمبر پر رنگ کرلیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ کہہ دوں گی۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ شجاعت علی نے بھی ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ ڈی ایس پی صاحب دوسرے کمرے میں تھے جہاں وہ تینوں دہشت گرد بھی موجود تھے۔

"ان لوگوں نے کوئی رابطہ کیا؟" ڈی ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"نو سر!" شجاعت علی نے نفی میں سرہلا دیا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا بایاں بازو دبا رکھا تھا۔ دہشت گردوں کی گرفتاری کے بعد ڈی ایس پی صاحب نے اسے موبائل پر فوراً ہی ہسپتال بھیج دیا تھا گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کے زخم پر ڈریسنگ کر کے فارغ کر دیا گیا تھا اور اب وہ بازو میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

"جتنے بھی مشکوک لوگ ہیں ان کی فہرست تیار کرو اور فوری طور پر ان کے خلاف کارروائی شروع کرو۔ یہ کام تمہیں اسی وقت شروع کر دینا چاہئے تھا جب فون پر تم سے رابطہ کیا گیا تھا۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

"میں ان کی دوسری کال کا انتظار کر رہا تھا سر!" شجاعت علی نے جواب دیا۔ "میرا

خیال تھا کہ اس کے بعد ہی کسی لائن آف ایکشن کا تعین کیا جائے گا۔"

"بہرحال' مشتبہ لوگوں کی فہرست تیار کرو اور فوری طور پر کارروائی شروع کر دو۔ اے ایس آئی شاہد کو اپنے ساتھ لے لو۔ ان لوگوں کو سب انسپکٹر امین کے حوالے کر دو۔" ڈی ایس پی صاحب نے دہشت گردوں کی طرف اشارہ کیا۔ "سب انسپکٹر نعمان کو بھی بلوا لو اور اسے بھی اپنے ساتھ رکھو۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ ضرور نکلے گا۔"

"یس سر!" شجاعت علی کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا اور ان لوگوں کی فہرست تیار کرنے لگا جنہیں اس کے ہاتھوں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس فہرست میں سب سے اوپر نوری خالد کا نام تھا۔ جس کا بیٹا فریدی اس کی تحویل میں تھا۔

آدھے گھنٹے بعد تین چار پولیس پارٹیاں مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ شجاعت علی خود ایک پارٹی کو لے کر نوری خالد کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب اس نے نوری خالد کی کوٹھی پر چھاپہ مارا تو سوا تین بج رہے تھے۔ اس چھاپے میں نوری خالد کے دو گرگے ہاتھ لگے تھے۔ وہ انہیں تھانے لے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ نوری خالد دو دن سے کہیں گیا ہوا ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہو گا؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ اے ایس آئی شاہد اور سب انسپکٹر نعمان بھی کچھ لوگوں کو پکڑ کر لائے تھے ان سے بھی باز پرس ہو رہی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتا سکا تھا کہ سلطانہ کو کس نے اغوا کیا ہے۔

دفعتاً شجاعت علی کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر حوالات کی اس کوٹھری میں آگیا جہاں نوری خالد کے بیٹے فریدی کو رکھا گیا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کا آخری پہر تھا لیکن فریدی جاگ رہا تھا۔ جب دہشت گردوں کو پکڑ کر تھانے لایا گیا تھا تو شور کی آواز سن کر وہ جاگ گیا تھا اور اس کے بعد اسے نیند نہیں آ سکی تھی۔

"تمہارا باپ کہاں مل سکتا ہے؟" شجاعت علی نے پوچھا۔

"اگر وہ کوٹھی پر نہیں ہے تو تم قیامت تک اسے تلاش نہیں کر سکتے۔" فریدی نے جواب دیا۔

"میں اس کے تمام ٹھکانوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" شجاعت علی نے کہا۔

"اس کے کئی ٹھکانے ہیں لیکن میں کسی ایک کے بارے میں بھی نہیں جانتا۔" فریدی نے کہا۔

شجاعت علی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے فریدی پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ فریدی کی چیخیں تھانے میں گونجتی رہیں لیکن شجاعت علی کے ہاتھ نہیں رکے۔

"میں تمہارے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا اور جب تک تم زبان نہیں کھولو گے نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔" شجاعت علی دھاڑا۔

"میں تمہیں اس کا ٹھکانہ بتا بھی دوں تو تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔" فریدی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر میرے بارے میں اب تک اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو اسے اس کی بزدلی مت سمجھو۔ وہ اژدھا ہے۔ نگل جائے گا تمہیں۔"

"تم مجھے اس کا ٹھکانہ بتاؤ۔" شجاعت علی نے اس کے سینے پر ایک اور زوردار ٹھوکر ماری۔ "اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس اژدھے کو کسی چوہے کی طرح پکڑ کر اس کوٹھری میں بند نہ کر دیا تو میرا نام بدل دینا۔ بتاؤ وہ کہاں ملے گا۔"

فریدی کچھ دیر اور پٹتا رہا لیکن بالآخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے بتا ہی دیا کہ اس کا باپ نوری خالد کہاں مل سکتا ہے۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب جا چکے تھے۔ شجاعت علی نے ایک چھاپہ مار پارٹی تیار کی اور نوری خالد کے خفیہ ٹھکانے پر چھاپہ مارنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

نوری خالد کا وہ خفیہ ٹھکانہ سرکلر ریلوے لائن کے قریب ایک بنگلہ تھا۔ شجاعت علی نے موبائل اس بنگلے سے دور ہی رکوائی اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا کہ اس بنگلے کو گھیرے میں لے لیا جائے لیکن اس وقت بنگلے کے گیٹ سے ایک پجیرو نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس پجیرو میں چار آدمی تھے۔ انہوں نے پولیس کو دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ علاقہ میدان کارزار بن گیا۔ دو آدمی پجیرو سے نکل کر دوڑتے ہوئے دوبارہ بنگلے میں گھس گئے تھے لیکن ان کی جگہ تین اور آدمی بنگلے سے باہر آ گئے تھے جو جدید ترین آٹومیٹک رائفلوں سے لیس تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال کر پولیس پر فائرنگ کرنے لگے۔ بنگلے کی چھت سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔

یہ بنگلے کسی کنسٹرکشن کمپنی کے بنائے ہوئے تھے اور ان کی کنسٹرکشن کچھ اس طرح تھی کہ کوئی آدمی چھتوں ہی چھتوں سے ہوتا ہوا پہلے بنگلے سے آخری بنگلے تک جا سکتا تھا۔ شجاعت علی کے ساتھ دس آدمی تھے۔ جبکہ ان کے مقابلے پر چھ سات آدمی تھے اور وہ پولیس کے مقابلے میں بہتر اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھے۔ شجاعت علی نے وائرلیس پر کنٹرول سے رابطہ قائم کر کے مزید فورس طلب کر لی۔ پولیس کی امدادی پارٹی آدھے گھنٹے بعد پہنچ سکی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے تک مقابلہ جاری رہا۔ اس دوران پولیس کے دو جوان جاں بحق اور تین زخمی ہوئے تھے۔ دوسری طرف کی صورت حال البتہ واضح نہیں تھی دو لاشیں تو بنگلے کے گیٹ کے سامنے پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کیا ہوا تھا اس کا ابھی کوئی علم نہیں تھا۔

شجاعت علی ایک کانسٹیبل کو لے کر سامنے والے بنگلے کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کانسٹیبل سے گن لے کر آنسو گیس کے تین چار شیل نوری خالد والے بنگلے میں داغ دیئے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ چند منٹ بعد ہی بنگلے سے فائرنگ کرنے والے بری طرح کھانستے ہوئے باہر آ گئے۔ پولیس والوں نے انہیں فوراً گرفت میں لے لیا۔

اس وقت دھوپ نکل رہی تھی۔ بنگلے سے برآمد ہونے والے چار آدمیوں کو گرفت میں لیا جا چکا تھا۔ پولیس نے بنگلے کو پوری طرح گھیرے میں لے رکھا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب بنگلے میں آنسو گیس کا اثر زائل ہوا تو شجاعت علی چار پانچ ماتحتوں کو لے کر دندناتا ہوا بنگلے میں گھس گیا۔ بنگلے میں اور تو بہت کچھ تھا مگر نوری خالد نہیں تھا۔

ایک کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ شجاعت علی نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس نے ریسیور کان سے لگا لیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا منتظر تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو سب انسپکٹر شجاعت سے بات کراؤ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"میں شجاعت علی بول رہا ہوں۔ کون ہو تم!" شجاعت علی نے کہا۔

"میں نوری خالد ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم سمجھتے تھے کہ نوری خالد کو گرفت میں لے لو گے۔ تمہاری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو سکتی شجاعت علی! نوری

خالد کسی آدمی کا نام نہیں وہ بہت بڑی طاقت ہے۔ اس ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس پر ہاتھ ڈال سکے لیکن میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ تم کوشش تو کر رہے ہو لیکن تمہارا ہر قدم تمہیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اگر تم مکمل طور پر تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو میرا خیال دل سے نکال دو اور میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ بصورت دیگر تمہارا انجام اتنا بھیانک ہوگا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"میری بہن کہاں ہے؟"

"وہ میرے قبضے میں ہے۔" نوری خالد نے جواب دیا۔ "اب تک تو تمہاری بہن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اگر تم نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میرے بیٹے کو نہ چھوڑا تو اس کا جو انجام ہوگا وہ تم سوچ نہیں سکتے۔"

☆======☆======☆

اس روز شام چھ بجے کے لگ بھگ شبینہ کی کال ریسیو کر کے شجاعت علی چونک گیا۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ نوری خالد تمہارے خلاف خوفناک منصوبہ بنا رہا ہے۔" شبینہ نے کہا۔ "مگر تم نے میری بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔"

"سلطانہ کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟" شجاعت علی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"اسی سلسلے میں تمہیں فون کیا ہے۔" شبینہ نے جواب دیا۔ "نوری خالد اس وقت تم سے خوفزدہ ہے۔ تمہاری بہن کو وہ مہرے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے سلطانہ۔" شجاعت علی نے پوچھا۔

"نوری خالد اب اپنا کوئی بھی ٹھکانہ محفوظ نہیں سمجھتا۔" شبینہ نے بتایا۔ "وہ آج رات گیارہ بجے سلطانہ کو لے کر گلستان جوہر کے ایک زیر تعمیر بنگلے میں منتقل ہو رہا ہے۔ یہ بنگلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بن رہا ہے اس کے آس پاس اور کوئی بنگلہ نہیں ہے۔ وہ اسے محفوظ ترین سمجھتا ہے۔"

"بنگلے کی لوکیشن بتاؤ۔" شجاعت علی نے پوچھا۔

جواب میں شبینہ اسے بنگلے کا پتہ اور لوکیشن بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔

"وہ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ وہاں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ صرف دو آدمی ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ تم رات دو بجے کے قریب وہاں ریڈ کرو۔ مگر ہوشیار رہنا۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود ہے۔"

"مطمئن رہو۔" شجاعت علی نے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

شجاعت علی نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت چھ بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر دفتر سے نکل آیا۔ محرر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ شجاعت علی برآمدے میں آ کر رک گیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر اے ایس آئی شاہد کو بلا کر چند ہدایات دیں اور تھانے سے باہر آ گیا۔ وہ اپنی جیپ پر سیدھا ڈی ایس پی کے دفتر پہنچا۔ ڈی ایس پی صاحب علاقے کے گشت کے لئے نکل رہے تھے لیکن شجاعت علی کو دیکھ کر رک گئے۔

"کوئی خاص بات؟"

"یس سر۔" شجاعت علی نے کہا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اس کارروائی کو آخر تک راز میں رکھنا چاہتا ہوں سر!"

"ٹھیک ہے' تم جو آدمی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو مجھے ان کی لسٹ بنا کر دے دو۔ میں انہیں پابند کر دوں گا کہ وہ رات بارہ بجے تھانے میں موجود رہیں۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

شجاعت علی نے لسٹ بنا کر دے دی۔ "میں کچھ دیر کے لئے گھر جانا چاہتا ہوں سر!"

"ٹھیک ہے۔ تم گھر جاؤ۔ والدین کو تسلی دو۔ تھوڑا آرام کرو۔ بارہ بجے تک تھانے پہنچ جانا۔ میں بھی وہیں رہوں گا۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

شجاعت علی سلیوٹ کر کے دفتر سے باہر آ گیا۔

☆======☆======☆

رات ٹھیک دو بجے درجنوں پولیس والوں نے گلستان جوہر کے علاقے میں واقع اس پہاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ بہت محتاط انداز میں پہاڑی پر چڑھتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکنے کی آوازوں سے اندیشہ تھا کہ نوری خالد اور اس کے ساتھی ہوشیار نہ ہو جائیں اور پھر وہی ہوا جس

کا اندیشہ تھا۔ نوری خالد اور اس کے ساتھیوں کو پتہ چل گیا کہ بنگلے کو گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔

اور پھر اچانک ہی وہ علاقہ فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ نوری خالد اور اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھتے ہوئے پولیس والوں پر اچانک ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ شجاعت علی نے بھی جوابی کارروائی کا حکم دے دیا۔

ایک گھنٹے تک دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی اور بالآخر بنگلے کی طرف سے فائرنگ رک گئی۔ شجاعت علی چند سپاہیوں کو لے کر بڑی احتیاط سے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ بنگلے کی چاردیواری کے قریب پہنچ کر وہ زبردست فائرنگ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ باؤنڈری وال کے قریب ہی دو آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ شجاعت علی رائفل سنبھالے اندر دوڑتا چلا گیا۔

یہ بنگلہ اگرچہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا لیکن یہاں تک بجلی کی لائن موجود تھی۔ اس نے ٹٹول کر ایک کمرے کی بتی جلائی اور پھر مختلف کمروں میں دوڑتا چلا گیا۔ ایک کمرے کی بتی جلاتے ہی چونک گیا۔ سلطانہ ایک پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر پلنگ سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر زردی تھی۔ شجاعت علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔ سلطانہ کی دونوں بانہوں پر چھوٹے چھوٹے سرخ نشان تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے نشہ آور یا بے ہوشی کے انجکشن دیئے گئے تھے۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھی مگر کچھ بولے یا پلک جھپکے بغیر شجاعت علی کو دیکھ رہی تھی۔

پولیس والے بنگلے میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ بالآخر دو پولیس والے شجاعت علی کے پاس آ گئے۔

"بنگلہ خالی ہے سر! یہاں کوئی نہیں ہے۔" ایک پولیس والے نے کہا۔

"بھاگ گیا۔" شجاعت علی بڑبڑایا۔ "میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے جھک کر سلطانہ کو کندھے پر اٹھایا اور بنگلے سے باہر آ گیا۔

☆------☆------☆

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ سلطانہ اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اس روز صبح

شجاعت علی تھانے جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر سلطانہ کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ پھر جلدی واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ موبائل تیار کھڑی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر چھ پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ شجاعت علی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور موبائل حرکت میں آ گئی۔

موبائل گلی کا موڑ مڑی ہی تھی کہ ایک سفید سوزوکی کار اس کے مکان کے سامنے رکی کار کے اسٹیئرنگ کے سامنے شبینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اتر کر بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھی گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن ڈیوٹی دینے والا کانسٹیبل اندر گیا ہوا تھا۔ شبینہ دیوانہ وار اندر گھستی ہوئی چلی گئی۔ دروازے میں گھستے ہی سلطانہ سے سامنا ہو گیا۔

"معاف کیجئے۔" شبینہ بولی۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ سلطانہ ہیں۔"

"ہاں! آپ کون ہیں؟" سلطانہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں شبینہ ہوں۔ شجاعت علی صاحب کہاں ہیں۔" شبینہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی نمایاں تھی۔ وہ بڑی جلدی میں لگ رہی تھی۔

"وہ تو تھانے گئے ہیں۔ ابھی ابھی نکلے ہیں۔ ان کی موبائل شاید گلی کا موڑ مڑی ہو گی۔ بیٹھئے نا۔ آپ سے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ پھر آؤں گی۔" شبینہ کہتے ہوئے باہر دوڑ گئی۔

اس نے سوزوکی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی ہی تھی کہ فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ شبینہ نے ایک دم کار کی رفتار بڑھا دی۔ وہ گلی کا موڑ گھومی ہی تھی کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے کار روک لی اور پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی آگے دوڑی۔

تقریباً سو قدم آگے گلی کے وسط میں پولیس کی موبائل کھڑی تھی۔ دونوں طرف کے مکانوں سے موبائل پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ شجاعت علی موبائل کے باہر کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن چاروں طرف سے آنے والی لاتعداد گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو رہی تھیں۔

شبینہ دوڑتی ہوئی شجاعت علی سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم بھی خون اگلنے لگا اور پھر وہ دونوں نیچے گرے۔

دس منٹ بعد فائرنگ بند ہو گئی۔ حملہ آور جو پہلے سے گھات لگائے بیٹھے تھے فرار

ہو گئے اور آدھے گھنٹے بعد لوگ وہاں جمع ہوئے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ موبائل کے اندر اور باہر سڑک پر نو لاشیں پڑی تھیں' چھ کانسٹیبل ایک ڈرائیور' شجاعت علی اور شبینہ کی لاشیں۔ سڑک پر ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔

معاشرے کو جرائم سے پاک کرنے کا عزم لے کر پولیس میں آنے والا نوجوان شجاعت علی بالآخر اپنے فرض پر قربان ہو کر وطن کی مٹی سے وفا' عزم اور فرض شناسی کی ایک نئی تاریخ رقم کر کے خاک و خون میں نہا گیا تھا!

☆====== ختم شد ======☆

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام